صَیدُ وصَیّاد

اور

دوسرے افسانے

از

حامد حسن قادری

پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ

۱۹۴۴ء

شائع کردۂ لکشمی نرائن اگروال پبلشر آگرہ

دیباچہ

اِن افسانوں میں بعض ترجمے ہیں، چند ماخوذ اور کچھ طبعزاد۔ جو افسانے آپ کو سب سے کم درجے کے معلوم ہوں اُن کو میرا نتیجۂ طبع سمجھئے۔ جو اُن سے زیادہ پسند آئیں ان کو کسی دوسرے کی روح اور میرا قالب تصور کیجئے۔ یعنی انگریزی افسانے اُردو زبان اور ہندوستانی ماحول میں ڈھلے ہوئے۔ لیکن کوئی افسانہ کسی اُردو کے ناول یا افسانہ سے نہیں لیا گیا۔ ترجموں میں جو اچھے ہوں ان پر اصلی مصنف کی تعریف کیجئے، جو برے ہوں اُن میں میری نظرِ انتخاب کی کوتاہی سمجھئے۔

یہ افسانے کسی دعوے کے ساتھ پیش نہیں کئے جاتے۔ محض تفریح کے طور پر وقت گذارنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اگر آپ کا وقت بھی تفریح کے ساتھ گذر جائے تو محنت وصول ہے۔

آگرہ۔ ۱۲ر مارچ ۱۹۴۴ء

حامد حسن قادری

فہرست

صَیدُ وصَیّاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صَیدُ وصَیّاد

(معاشرتی افسانہ)

سیٹھ مایا داس کا خاندان شہر میں کچھ اچھی نظروں سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات اب سے پچاس برس پہلے کی ہے، نصف صدی میں زمانے کی کایا پلٹ گئی۔ اب سیٹھ جی دولت مند تھے، لکھ پتی تھے۔ زر بڑا ستار العیوب ہے۔ شرافت کیا چیز ہے، دولت سب کچھ ہے سیٹھ جی نے ساری جوانی اور آدھا بڑھاپا پردیس میں گذارا۔ خوا نچے لگاتے لگاتے دولت کے ڈھیر لگا دیئے اب وہ کئی کمپنیوں اور بینکوں کے ڈائرکٹر اور منیجر اور مالک و مختار تھے۔ مدت کے بعد وطن کی یاد آئی۔ اپنے دیس میں آکر مستقل سکونت اختیار کی۔ غیروں میں بہت کچھ عزت حاصل کر لی۔ اپنوں پر بھی اس کا اظہار ہونا چاہئے۔ جن کے سامنے کبھی چھوٹے تھے اُن کے سامنے اب بڑا بننے میں لطف آئے گا۔ گھر آکر روپیہ کا لین دین شروع کیا۔ رئیسوں کی جائدادیں رہن رکھیں۔ دولت سیلاب کی طرح بڑھتی گئی۔

سیٹھ جی دن رات اسی میں غوطے کھاتے رہتے۔ لیکن کبھی سر اُٹھاتے تو ایک چیز کی کسر نظر آتی۔
دولت بڑی میٹھی چیز ہے۔ لیکن اس کی چاشنی اور تیز ہونی چاہئے۔ اکیلی دولت کافی نہیں۔
خاندانی عزّت بھی بڑی چیز ہے۔ سوسائٹی میں بھی قدر و وقعت حاصل ہو تو دولت کا مزہ دوگنا ہو جائیگا۔
یہ خواہش سیٹھ جی کے جی میں پچاس برس پہلے پیدا ہوئی ہوتی تو اس کا پورا ہونا محال تھا۔ لیکن اب زمانہ اور تھا ذات پات کا خیال دنوں سے مٹتا جاتا تھا۔ اونچ نیچ کا فاصلہ گھٹتا جاتا تھا۔ برادری میں برابری میل جول میں آسانی بڑھتی جاتی تھی۔ کسی مشہور و معزز خاندان میں رشتہ کرنا سیٹھ جی کو مشکل نظر نہ آتا تھا۔
سیٹھ جی کے ایک لڑکا تھا۔ اور ایک لڑکی۔ دونوں جوان تھے بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ لڑکا ساہو لال الگ کاروبار کرتا تھا۔ تجارت کے سارے گُر سیکھ گیا تھا۔ لین دین کے تمام داؤ پیچ میں اُستاد تھا۔ زمانہ سازی کی ہر تدبیر میں مشاق تھا۔ لڑکی اندرا حسین تھی اور بلا کی ذہین۔ دُور رس۔ معاملہ فہم۔ دونوں بہن بھائی نے تعلیم و تربیت بہتر سے بہتر پائی تھی۔ سیٹھ جی اپنی ذات کے لئے نہایت سادگی پسند اور کفایت شعار تھے لیکن بچوں کے لئے اُن کا دل اور خزانہ دونوں کھلے ہوئے تھے اسکولوں کی تعلیم کے علاوہ گھر کی تعلیم اور نگرانی کے لئے لائق سے لائق اُستاد اور اُستانیاں رکھیں اور لڑکے لڑکی دونوں کو موجودہ فنی تعلیم اور طرزِ معاشرت کے مطابق تعلیم دی۔
سیٹھ جی ساہو اور اندرا دونوں کی شادی معزز گھرانوں میں کرنا چاہتے تھے۔ ساہو اُن کی اس دیرینہ تمنا اور دلی آرزو سے واقف تھا اور اس کا حامی تھا۔ لیکن سیٹھ جی نہیں تو ساہو خوب جانتا تھا کہ کسی قدیم شریف خاندان تک رسائی کے لئے حکمت عملی سے کام لینا پڑے گا۔ باوجود تعلیم کی اشاعت اور معاشرت کی آزادی کے ابھی بعض بعض لوگوں میں قدامت پرستی کی خُو بُو باقی ہے۔ مثلاً راجہ عزّت رائے شہر کے رئیس اعظم ہیں۔ بادشاہی زمانہ سے راجہ کا خطاب ہے جس کو سرکار نے بھی موروثی قرار دیدیا ہے۔ محل راج بھون کئی سو برس کی قدیم عمارت اور ضلع بھر میں بے نظیر و قابل دید

ہے۔ راجہ صاحب کی اولاد میں صرف ایک لڑکا ہے جس کو راجکمار کا خطاب حاصل ہے۔ یہ لڑکا مردانہ حسن اور شریفانہ اخلاق کا بےمثل نمونہ ہے۔ اندرا سے اس کا جوڑ کیسا اچھا رہے گا۔ لیکن ہو کیونکر؟ اسی طرح شہر کی سب سے بزرگ ہستی اور قابلِ احترام شخص منشی اقبال نرائن ہیں ان کی شرافت خاندانی اور جوہر ذاتی کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ مال و دولت اور جاہ و حشمت کے سامنے سر جھک جائے تو جھک جائے ،، دل کے جھکنے کے لئے کچھ اور ہونا چاہئیے ،، منشی جی متوسط حیثیت کے آدمی ہیں لیکن سارا شہر اُن کی حقیقی عزت کرتا ہے۔ اُن کے والد ڈاکٹر تھے منشی جی کو اس فن سے مناسبت پیدا نہ ہوئی ان کا رجحان طبع علم و ادب کی طرف تھا۔ باپ نے جو کچھ نقد چھوڑا۔ اُس کو بینک میں داخل کر دیا۔ اس کی آمدنی گذر اوقات کے لئے کافی تھی۔ اپنے شغل کے لئے ایک اسکول کھول رکھا تھا۔ ان کے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ لڑکا کالج میں پڑھتا تھا۔ چھوٹی لڑکی لیلا انٹرنس پاس کر چکی تھی اور صوبہ میں اوّل نمبر آئی تھی۔ لیلا آگے پڑھنا چاہتی تھی اور منشی جی پڑھانے کو تیار تھے لیکن شہر میں زنانہ کالج نہ تھا۔ پردیس میں بھیجنا گوارا نہ تھا۔ لیلا کو خلاق مطلق نے حسن کی رانی اور حیا کی دیوی بنایا تھا۔

(۲)

ساہو: ہاں یہ تو بتائیے کہ آپ نے راجہ عزت رائے کو جو روپیہ دیا ہے اُس کا سود وقت پر وصول ہو رہا ہے؟

سیٹھ جی:۔ نہیں بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔

ساہو:۔ تو اتنی بڑی رقم گویا بےکار گئی۔

سیٹھ جی:۔ ہے تو ایسا ہی۔ اکثر خیال آتا ہے کہ میں نے یہ بیوقوفی کیوں کی؟

ساہو:۔ لیکن میرے خیال میں کچھ بُرا نہ ہوا۔

سیٹھ جی :- کیوں ؟

ساہو :- راجہ کے لڑکے کنور محبت سنگھ اور اندرا کے جوڑ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟

سیٹھ جی :- بیچ میں اس سوال کا کیا موقع تھا ؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہو سکتا - راجہ کا لڑکا منشی اقبال نرائن کی لڑکی پر فریفتہ ہے -

ساہو :- میں نے بھی سُنا ہے لیکن راجہ کسی مفلس لڑکی کو اپنے لڑکے کے لئے پسند نہیں کر سکتے۔ منشی کے پاس رکھا کیا ہے جو بیٹی کو دینگے - اندرا کو تو گھر سے بہت کچھ ملے گا -

سیٹھ جی :- ملے گا تو سہی لیکن میں کنور کو اندرا کے ساتھ شادی کرنے پر کیسے مجبور کر سکتا ہوں -

ساہو :- کر سکتے ہیں - راجہ پر قرضہ کا اس قدر بار ہے کہ تمام جاگیر جائداد راج بھون تک قرضے میں دبا ہوا ہے - اور آپ کو معلوم ہے کہ سب آپ کے پاس گروی ہے - راجہ جی آپ کی مٹھی میں ہیں- آپ کہیں مجھے اپنا روپیہ واپس چاہئے - راجہ کہیں گے میں اتنی کثیر رقم کا انتظام نہیں کر سکتا - پھر کیا ہو ؟ ایک صورت ہے راجہ کنور کی شادی اندرا کے ساتھ کر دیں ہم سارا بار اُٹھائے دیتے ہیں - اِس طرح اندرا رانی بن جائے گی - اور آپ آئندہ راجہ کے نانا ہوں گے -

سیٹھ جی :- چال تو ٹھیک ہے لیکن چل بھی جائے گی ؟

ساہو :- چلانے کا میرا ذمہ -

سیٹھ جی :- (کچھ سوچ کر) معلوم ہوتا ہے تم اس میں کچھ اپنا داؤں بھی لگا رہے ہو -

ساہو :- آپ کا خیال درست ہے -

سیٹھ جی :- تم نے آج کل منشی اقبال نرائن سے کیوں راہ و رسم بڑھا رکھی ہے -

ساہو :- میں اُن کی لڑکی نیلا کو جیتنا چاہتا ہوں -

سیٹھ جی :- جیتنا کیا معنی ؟ اچھا ، کنور کو اپنے راستہ سے ہٹانا چاہتے ہو -

ساہو:- یہی بات ہے۔
سیٹھ جی:- لیکن تم نے ابھی کہا تھا کہ بیلا غریب ہے۔
ساہو:- میں تو امیر ہوں!

(۳)

ساہو نے اپنے کاروبار کا ایک خُفیہ دفتر دہلی میں قائم کر رکھا تھا۔ خُفیہ کے یہ معنی کہ مالک تو ساہو تھا لیکن کام دوسرے کے نام سے ہوتا تھا۔ دروازے پر پی۔ ویاس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ گزشتہ واقعات سے اگلے روز صبح دس بجے ساہو اس دفتر میں داخل ہوا۔ منیجر بابو ویاس آہٹ سُن کر کھڑا ہو گیا۔

بابو:- گڈ مارننگ سر۔
ساہو:- گڈ مارننگ بابو۔ کہو کوئی نئی خبر؟
بابو:- کوئی نئی بات نہیں۔ سلک کلاتھ کمپنی دیوالیہ ہو گئی۔
ساہو:- میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ ہمارے حصّے تو سب فروخت ہو گئے تھے نا؟
بابو:- سب کے سب۔ ہم نقصان سے بالکل محفوظ ہیں۔
ساہو:- مجھے بھی یہی اُمید تھی اور کون سی کمپنی آجکل خطرے میں ہے؟
بابو:- (ایک رجسٹر کی ورق گردانی کرتے ہوئے) سنٹرل شوگر ملز کمپنی
ساہو:- ہاں اس کے متعلق کیا کہتے ہو۔
بابو:- بظاہر تو اس کمپنی کی حالت اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن میں اس کو ایک مہینہ اور دیتا ہوں۔
ساہو:- یعنی؟ تمہاری رائے میں ایک مہینہ سے زیادہ نہیں چل سکتی؟

بابو:- جی ہاں ایک مہینہ بعد اس کا فیل ہو جانا یقینی ہے۔
ساہو:- ہمارے پاس تو اس کے حصّہ نہیں ہیں۔
بابو:- بالکل نہیں۔ ایک بھی نہیں۔
ساہو:- تو مہربانی کر کے تیس ہزار کے حصّہ خرید لو۔
بابو:- (مُتحیّر ہو کر) معاف فرمائیے گا کیا کہا آپ نے؟ خریدنے کو فرمایا؟
ساہو:- (مُسکرا کر) ہاں تیس ہزار کے حصّے خرید لو۔
بابو:- (یادداشت لکھنے کے بعد) سیٹھ جی! معاف کیجئے گا۔ یہ اطلاع دینا میرا فرض ہے کہ اس کمپنی کا وقت آ پہنچا ہے۔ آخری سانس لے رہی ہے حصّوں کی قیمت گھٹنی شروع ہو جائے گی۔ اور پھر کوئی مفت بھی نہیں لے گا۔ حصّے دار بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ آپ کو علم ہو گا کہ یہ کمپنی "اَن لمیٹڈ" ہے۔
ساہو:- (مُسکرا کر بابو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) بابو جیسا میں کہوں ایسا ہی کرو سنٹرل شوگر ملز کمپنی کے حصّے قیمتی تیس ہزار روپیہ خرید لو۔
ساہو یہ کہہ کر بابو کا سلام لیتا ہوا زینے سے اُتر گیا اور بابو ہاتھوں پہ سر رکھ کر بیٹھ گیا۔

اس سے دوسری صبح کو ساہو منشی اقبال نرائن کے مکان پر پہنچا منشی صاحب مردانہ مکان میں بیٹھے تھے۔
ساہو:- آداب عرض کرتا ہوں منشی صاحب۔
منشی جی:- آداب عرض ہے۔ آئیے۔ تشریف رکھئے۔ صبح ہی صبح کیسے تکلیف کی؟
ساہو:- آپ کے اسکول کے متعلق کچھ عرض کرنے کو حاضر ہوا ہوں۔

منشی جی:- (خوش ہو کر) کہئے کہئے۔

ساہو:- سنا ہے آپ اسکول کی عمارت میں ترمیم و توسیع کرنا چاہتے ہیں۔

منشی جی:- جی ہاں ایک عرصہ سے خیال ہے اور بڑی ضرورت ہے لڑکوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور موجودہ عمارت ناکافی ہوتی جاتی ہے لیکن ضروری مرمت اور وسعت کے لئے بھی سرمایہ مہیا ہونا دشوار نظر آتا ہے۔

ساہو:- آپ کے تخمینہ میں سردست کتنے روپیہ کی ضرورت ہوگی۔

منشی جی:- پانچ ہزار کا اندازہ ہے۔ لیکن ہمارے بے پروا اور بے حس شہر سے اس کا وصول ہونا کارے دارد۔

ساہو:- منشی جی میرا خیال ایسا نہیں ہے۔ میرے والد سیٹھ بابا داس صاحب نے مجھے بھیجا ہے کہ ایک ہزار روپیہ کا چیک اسکول کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

منشی جی:- آپ کے والد صاحب نے بہت بڑی مہربانی کی بہت بہت شکریہ۔

ساہو:- جی، یہ کوئی بات نہیں۔ میرے نزدیک تو انھیں سارا صرفہ برداشت کرنا چاہیے تھا۔ ان کے لئے یہ کون سی بڑی رقم ہے۔

منشی جی:- نہیں نہیں یہ بھی اُن کا بڑا کرم ہے۔

ساہو:- آپ اجازت دیں تو باقی رقم میں اپنی طرف سے پیش کروں۔

منشی جی:- (حیرت کے ساتھ) کیا باقی چار ہزار روپیہ؟

ساہو:- جی ہاں اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ غالباً آپ کو علم نہیں کہ میں اپنے والد سے الگ اپنا کاروبار کرتا ہوں۔

منشی جی:- بہت ٹھیک۔ بہت ٹھیک۔ مجھے خبر نہ تھی۔

ساہو:۔ بیشک، آپ سے کبھی اس قسم کی گفتگو کا موقعہ ہی نہ ملا۔ والد صاحب تو تجارتی حلقوں میں اور تمام شہر میں بلکہ صوبہ بھر میں مشہور ہیں لیکن میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتا ہوں۔ اور آپ سُن کر خوش ہوں گے کہ میں بھی اپنے کاروبار میں بہت کامیاب ہوں۔

منشی جی:۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ بیشک ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ جب آپ ایسی ہمدردی اور فیاضی کے ساتھ اپنی دولت کو صرف کرتے ہیں تو اس میں ترقی اور برکت کیوں نہ ہو۔

ساہو:۔ یہ آپ کا خُلق و کرم ہے جو ایسا فرماتے ہیں۔ میں تو ملک و قوم اور علم و ہُنر کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آئندہ بھی آپ کو کسی قومی کام کے لئے خدمت کی ضرورت ہو تو مجھے نہ بھولیئے گا۔

منشی جی:۔ ہرگز نہیں۔ اب آپ کہیں بھول سکتے ہیں۔

ساہو:۔ (تھوڑی دیر سکوت کے بعد) منشی جی آپ نے یہ نہ پوچھا میں کیا کاروبار کرتا ہوں۔

منشی جی:۔ غالبًا میں سمجھ نہ سکوں گا میں تجارتی امور سے بالکل بے خبر ہوں۔

ساہو:۔ میں کمپنیوں کے حصّے خریدتا اور فروخت کرتا ہوں۔

منشی جی:۔ بہت خوب۔ بہت خوب۔ (لیکن اندازِ جواب سے معلوم ہوتا تھا کہ منشی جی سمجھے خاک نہیں)

ساہو:۔ بڑے منافع کا کام ہے۔ یوں خیال فرمایئے میں اِس ذریعہ سے کئی ہزار روپیہ سالانہ کما لیتا ہوں۔

منشی جی:۔ آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ حصّوں کی خرید و فروخت میں بہت سے لوگ تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔

ساہو:۔ سچ ہے لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ اس کام کو سمجھ کر نہیں کرتے۔ حالانکہ بہت آسان

کام ہے۔ میں نے ابھی چند مہینے ہوئے۔ ایک کمپنی کے حصّے دس دس روپیہ میں خریدے تھے لیکن جب اُن کو فروخت کیا تو چالیس چالیس میں بکے۔ اور چند ہفتوں میں مجھے سولہ ہزار روپیہ حاصل ہو گئے۔

منشی جی یہ سُن کر حیران رہ گئے مہینوں میں ہزاروں کا سودا! عجیب تجارت ہے۔ جو کہیں ہماری تقدیر یاوری کرے تو کیا کہنا۔ یہ روز روز کی پریشانیاں۔ گھر کے بڑھتے ہوئے مصارف۔ بچوں کے اخراجات اسکول کی فکر، سب سے نجات مل جائے۔

ساہو:۔ منشی جی۔ اِس کاروبار میں بس ذرا سمجھ کی ضرورت ہے۔ ٹھیک اندازہ اور صحیح فیصلہ کرنے کی قابلیت اور معلومات حاصل ہونے چاہئیں۔ یہ واقعہ ہے کہ لوگ چند سال کے عرصہ میں لکھ پتی بن گئے ہیں میرے والد مشہور کامیاب تاجر ہیں لیکن مجھے بھی اگر ایسی ہی کامیابی ہوتی رہی جیسا اب تک تجربہ ہوا ہے تو میں بھی اتنی ہی دولت پیدا کر لوں گا۔

منشی جی:۔ بیشک بیشک مجھے یقین ہے۔ لیکن آپ ایسے شخص سے یہ گفتگو کر رہے ہیں جو بالکل بے دست و پا ہے۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ میری آمدنی معمولی ضروریات زندگی کے لئے بھی مشکل سے کافی ہوتی ہے۔ دو تو کہیے ایک رقم ایسی رکھی ہوئی ہے جس سے قلیل منافع حاصل ہوتا رہتا ہے۔

ساہو:۔ ذرا تامل کے بعد) منشی جی میں آپ سے وہ بات عرض کرتا ہوں جو دنیا میں کسی دوسرے شخص کو نہ بتاتا۔ آپ جانتے ہیں کہ تجارتی کاروبار کے بھی کچھ بھید ہوتے ہیں جن کو ہم تاجر لوگ کسی غیر شخص کو نہیں بتاتے۔

منشی جی:۔ بالکل درست۔

ساہو:۔ ہم مختلف ذریعوں سے کاروباری خبریں اور معلومات حاصل کرتے ہیں اور موقعہ و وقت کو دیکھ کر معاملات کے متعلق اندازہ و فیصلہ کرتے ہیں اور حسن تدبیر سے کثیر منافع پیدا کر لیتے ہیں۔ اچھا منشی جی میں آپ سے ایک بات دریافت کرتا ہوں اگر آپ اُس کو بے ادبی نہ سمجھیں۔

منشی جی:۔ نہیں ہرگز نہیں آپ شوق سے پوچھئے۔

ساہو:۔ اطمینان رکھئے میرا سوال بے وجہ نہ ہوگا۔ مہربانی فرما کے یہ بتایئے کہ آپ کا ذاتی سرمایہ کس قدر ہے۔ اور اس سے کیا سالانہ آمدنی ہے؟

منشی جی:۔ میں خوشی سے بتاؤں گا۔ وہ سرمایہ ہی کیا ہے اور آمدنی کیا۔ پندرہ ہزار روپے کے لگ بھگ ہے جس سے تقریباً آٹھ نو سو روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔

ساہو:۔ میرا بھی اسی قدر اندازہ تھا۔ لیکن پندرہ ہزار روپے سے ساڑھے تین ہزار چار ہزار سالانہ کا منافع ہو سکتا ہے۔

منشی جی:۔ یہ بات خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے۔

ساہو:۔ نہیں منشی جی یہ کوئی بات ہی نہیں۔ ساڑھے تین ہزار روپیہ سالانہ تو یقینی سمجھئے۔

منشی جی:۔ آپ بیشک اتنا کما سکتے ہوں گے۔ لیکن میں تو ان باتوں سے محض ناواقف ہوں۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اپنا سرمایہ بھی نہ گنوا بیٹھوں۔

ساہو:۔ یہ سچ ہے۔ اگر آپ صرف اپنی رائے سے کام کریں گے تو نقصان کا اندیشہ کیا اُمید ہی لیکن فرض کیجئے میں آپ کی مدد کروں اپنی معلومات اور رائے آپ کے سامنے پیش کروں۔

منشی جی:۔ آپ اپنا رازِ تجارت مجھے بتا دیں گے؟

ساہو:۔ بیشک میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں آپ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔

منشی جی:۔ میں آپ کا بڑا احسان مند ہوں، مجھے آپ پر کامل بھروسا ہے۔ جو کہئے کرنے کو تیار ہوں

ساہو:۔ مجھ سے مشورہ چاہتے ہیں تو۔ سنٹرل شوگر ملز کمپنی کے پندرہ ہزار روپیہ کے حصے خرید لیجئے میں نے خود تیس ہزار روپیہ کے حصے حال ہی میں خریدے ہیں۔ جو کم سے کم ساٹھ ہزار روپیہ میں آسانی سے فروخت ہو جائیں گے۔

منشی جی:- دوگنی قیمت ہیں۔

ساہو:- اور صرف ایک مہینہ میں۔

منشی جی:- یقین آنا مشکل ہے۔

ساہو:- لیکن ہم لوگوں کو ہر ہفتہ بلکہ تقریبًا روزانہ اس قسم کے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ تیس ہزار کے حصّے خریدے ہیں۔ میں پچاس ہزار ساٹھ ہزار کے خریدنے کو بھی تیار تھا لیکن اس سے زیادہ نہ مل سکے۔ صرف تیس ہزار کے حصہ دستیاب ہو سکے۔ اگر آپ چاہیں تو ان میں سے نصف آپ کو دے سکتا ہوں۔

منشی جی:- کیا؟ اور میں آپ کو نفع سے محروم کر دوں۔ میں آپ کا نقصان گوارا نہیں کر سکتا۔

ساہو:- منشی جی اس طرح کی صورتیں پیش آتی ہی رہتی ہیں اور کمپنیوں کے حصّے فروخت ہونے لگیں گے۔ میں اُن کو لے لوں گا اور کمی پوری کر لوں گا۔ آپ اس کا خیال نہ کیجئے۔ اب فرمائیے کیا ارادہ ہے دیر کرنے کا موقعہ نہیں ہے۔ آپ کو اطمینان تو ہو گیا ہو گا؟

منشی جی:- اطمینان کیوں نہ ہوتا۔ آپ نے تو خود خریدے ہیں۔

ساہو:- اور جتنے زیادہ مل سکیں اب بھی لینے کو تیار ہوں۔

منشی جی:- میں بخوشی آپ کی مہربانی سے فائدہ اُٹھاؤں گا۔ بتائیے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں تو ان باتوں کو سمجھتا ہی نہیں۔

ساہو:- ساری کارروائی مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ لیکن ایک شرط ہے۔

منشی جی:- (گھبرا کر) وہ کیا؟

ساہو:- یہ کہ آپ کسی سے اِس معاملہ کا ذکر نہ کیجئے گا۔ گھر میں بھی کسی سے نہ کہئے گا۔ اِن معاملات کے متعلق بڑی رازداری کی ضرورت ہوتی ہے۔

منشی جی :- یہ شرط منظور ہے۔ میں کسی کو شبہہ تک نہ ہونے دوں گا۔

ساہو :- تو ٹھیک ہے۔ اب آپ جس طرح میں عرض کروں دو آرڈر لکھ دیجئے۔

منشی جی نے ساہو کی ہدایت کے مطابق دو تحریریں لکھ کر حوالہ کیں۔ ساہو ان کو جیب میں رکھ کر رخصت ہو گیا۔

۵

راجہ عزت رائے یکایک بیمار ہو گئے۔ ان کا لڑکا کنور محبت سنگھ کلکتہ میں تھا۔ باپ کی بیماری کا تار ملا فوراً چلا آیا۔ راجہ کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ دیر تک کلکتہ کی سیر کے حالات پوچھتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔

راجہ :- میرا مفصل خط تمہیں کلکتہ میں ملا ہوگا ؟

کنور :- جی ہاں ملا تھا۔

راجہ :- میں نے بہت تامل اور غور و فکر کے بعد وہ خط لکھا تھا۔ جب ہمارا گھر ہم دونوں ہی سے مرکب ہے۔ تمہاری ماں زندہ نہیں کہ تم کو مشورہ دے سکے۔ میرے کوئی اور اولاد نہیں تو اس حالت میں میرے تمہارے درمیان کوئی تکلف اور غیر ضروری حجاب نہ ہونا چاہیئے۔

کنور :- درست ہے۔

راجہ :- تم کو اپنی ریاست کی حالت کا صحیح اندازہ نہ ہوگا۔ اب حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ (ذرا تامل کے بعد) سیٹھ مایا داس کی لڑکی تو اس زمانہ میں کلکتہ میں تھی۔

کنور :- جی ہاں۔

راجہ :- تم نے اس کو دیکھا، ملنے کا موقع ملا ؟

کنور :- بعض پارٹیوں اور گھوڑ دوڑیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔
راجہ :- کیسی ہے ؟ تم نے اس کے متعلق کیا رائے قائم کی ؟
کنور :- اچھی شکل و صورت ہے۔
راجہ :- بیشک حسین ہوگی، اس کا بھائی بھی خوبصورت ہے۔
کنور :- جی ہاں، لیکن آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔ میں نے سنا ہو کہ وہ آپ کے پاس چند بار آیا گیا ہو؟
راجہ :- ہاں۔ میں اس کے متعلق بیان کروں گا۔ لڑکی کے ساتھ اور کون کون تھا ؟
کنور :- خود سیٹھ جی تھے۔ دو ایک عورتیں بھی تھیں۔
راجہ :- تم سیٹھ سے ملے تھے، راہ و رسم بڑھائی ہوتی۔
کنور :- اس کا تو موقعہ نہیں ملا۔
راجہ :- معلوم ہوتا ہے تم نے میرا خط غور سے نہیں پڑھا۔ یا سمجھے نہیں۔ اب میں اس کا خلاصہ زبانی بیان کرتا ہوں۔ بیٹا، ہم تباہی کے غار کے کنارے کھڑے ہیں۔ بلکہ کوہ آتش فشاں پر۔ سالہا سال سے ہماری ریاست مشکلات میں پھنسی ہوئی ہے، اور میں اس کو بچانے کے لئے انتہائی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اب یہ حالت ہے کہ جاگیروں کا ایک ایک چپہ راج بھون کا ایک ایک انچ رہن و مکفول ہو۔ ریاست کے قدیم موروثی جواہرات، چاندی سونے کے برتن، مرصع اسلحہ، زربفتی خلعت، غرض ہر قیمتی چیز نیلام پر چڑھی سمجھو۔
(ذرا دم لے کر) ہماری بربادی و تباہی میں بس ایک بم پھٹنے کی دیر ہے۔ اب بچنے کی صرف ایک صورت ہے۔ صرف ایک شخص ہے جو خاندانی نام و آبرو کو بچا سکتا ہے۔ وہ شخص تم ہو۔ تمہاری شادی اِس مریضِ جاں بلب کا واحد علاج ہے۔
کنور :- (کانپتے ہونٹوں اور بھرائی ہوئی آواز سے) مجھے اس بات کی خبر نہ تھی۔ اِس نازک

حالت کو نہ جانتا تھا۔

راجہ:۔ میں نے وہ تجویز بے سوچے سمجھے نہ لکھی تھی۔ تم کو یہی بات سمجھانی مقصود تھی کہ شادی موزوں جگہ ہونی چاہئے۔ جو شخص خاندانی خطاب اور ریاست کا مالک ہو اور اسکو برقرار رکھنے کے لئے سرمایہ نہ رکھتا ہو تو ہر جائز تدبیر سے اپنی اور اپنے آباؤ اجداد کی عزت آبرو کو محفوظ رکھنا اس پر فرض ہے لیکن اِس خاص شادی کی اہمیت بہت ہے۔

کنور:۔ وہ کیا؟

راجہ:۔ ریاست کے تمام رہن نامے سیٹھ مایا داس کے قبضے میں ہیں۔ گویا یہ ساری ریاست ایک اشارے میں اِدھر سے اُدھر ہونے والی ہے اور وہ وقت ہر روز اور ہر لحہ آسکتا ہے۔ لیکن سیٹھ کی لڑکی سے تمہاری شادی اِس مصیبت کو ٹال سکتی ہے۔

کنور:۔ لیکن سیٹھ خود اتنی بڑی ریاست پر قبضہ کرنا کیوں نہ چاہیں گے۔

راجہ:۔ تم نے غور نہیں کیا۔ ریاست قبضے سے جائے گی کہاں؟ میں کب تک چلوں گا اور سیٹھ کب تک جئیں گے۔ سیٹھ کی لڑکی اور داماد اور اُن کی اولاد ہی تو ریاست کی مالک ہو گی۔

کنور:۔ لیکن سیٹھ ایسا کر سکتے ہیں کہ ریاست ہم سے لے لیں اور اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور کر دیں۔

راجہ:۔ پھر تم نے ناسمجھی کی بات کہی۔ (آب دیدہ ہو کر) بیٹا اس میں نازک پہلو اور باریک نکتہ یہی ہے۔ لیکن ایسا نہ تھا کہ تم نہ سمجھ سکتے۔ اِس وقت تمہارا خیال کہیں اور ہے۔

کنور:۔ نہیں میں متوجہ ہوں۔

راجہ:۔ بات یہ ہے کہ ریاست ہم سے نکلی اور ریاست کی وہ بات گئی۔ وہ آن گئی، پھر یہ صدہا سال کی نامور ریاست نہ رہے گی۔ اس کا نام ہمارے دم سے ہے اس کی شان ہمارے نام سے ہے اس کی آن ہماری جان کے ساتھ ہے۔ میں جو اس مُردے کو کلیجے سے لگائے ہوئے ہوں وہ اسی اُمید

پر کہ ممکن ہے کوئی مسیحا اس میں جان ڈال دے۔ اور وہ مسیحا کچھ دو نہیں۔ وہ تم ہو۔ صرف تم۔

کنور:۔ آپ نے یہ سب بحث و پز کر لی لیکن اس معاملہ کے اصل شخص پر بھی غور کیا؟ یعنی سیٹھ کی لڑکی اندرا کو ایک حد تک آزادی رائے حاصل ہے۔ سیٹھ اس معاملہ میں آزاد خیال آدمی ہیں۔ بیٹی کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کریں گے۔ ممکن ہے اندرا میرے ساتھ شادی کرنے پر راضی نہ ہو۔

راجہ:۔ میں تمہارے اِس انکسار کی تعریف کرتا ہوں۔ لیکن مجھے اِس کا اندیشہ نہیں۔ تم خوبصورت ہو جوان ہو خاندان کے معزز ہو، مشہور و نامور ہو اندرا اپنی جنس سے کوئی جُداگانہ ہستی نہیں ہے ایک ممتاز ریاست کی رانی بن کر حکومت کرنے کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے گی۔ نہیں بیٹا تم اس کا اندیشہ نہ کرو۔

کنور:۔ بہتر ہے نہ سہی۔ لیکن اب ایک اور شخص بھی قابلِ لحاظ ہے۔

راجہ:۔ یعنی تم؟ بیٹا یہ سب کچھ تمہاری ہی خاطر کر رہا ہوں۔

کنور:۔ بیشک لیکن .... اجازت ہو تو کہوں؟

راجہ:۔ (گھبرا کر) کہو کہو اب کہنے کی کیا گنجائش باقی ہے۔

کنور:۔ میں اس وقت کچھ ارادے کچھ اُمیدیں لے کر آیا تھا۔

راجہ:۔ کیا بیٹا کیا۔

کنور:۔ میں یہ درخواست کرنے والا تھا کہ آپ میرا پیام منشی اقبال نرائن کی چھوٹی لڑکی لیلا کو دیں

راجہ:۔ تم کو اس سے کیا تعلق؟

کنور:۔ دل کا تعلق۔

راجہ:۔ تم اِس کو کب سے اور کیونکر جانتے ہو؟

کنور:۔ اس کا بھائی فتح نرائن میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے پُرانا دوست ہے۔ بڑا مخلص دہمدرد ہے

راجہ:- لڑکی سے تمہاری کب سے راہ و رسم ہے؟

کنور:- (راجہ کے طنز سے برافروختہ ہو کر لیکن ضبط و تحمل سے کام لے کر) صرف اس قدر کہ میں نے اُس کو اُس کے مکان پر بھی دیکھا ہے۔ کبھی کبھی کسی جلسہ میں، اور اب وہ اپنے بھائی کے ساتھ اپنی بڑی بہن کے پاس کلکتہ گئی ہوئی تھی۔ اُس کے بہنوئی کلکتہ میں ملازم ہیں۔

راجہ:- وہ تمہارے میلان طبع سے واقف ہے؟

کنور:- جی ہاں۔

راجہ:- اس کا دل بھی تمہاری طرف مائل ہے؟

کنور:- جی ہاں۔

راجہ:- تمھیں کیونکر معلوم ہوا؟

کنور:- میانِ عاشق و معشوق رمزے است۔

راجہ:- اس کے بھائی، بہن، بہنوئی، باپ کو تم دونوں کے تعلقِ خاطر کا علم ہے۔

کنور:- کراماً کاتبین را ہم خبر نیست۔

راجہ:- تمہاری اِس لڑکی سے کبھی بات چیت، خط و کتابت ہوئی ہے؟ کوئی عہد و پیمان ہوا ہے؟

کنور:- کبھی نہیں۔ کچھ نہیں۔

راجہ:- اُمید ہے کہ تمہارا یہ جنون عارضی ثابت ہوگا

کنور:- (ناگواری کے لہجہ میں) آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ یہ غم دم کے ساتھ نکلے گا۔

راجہ:- میرا خیال ایسا نہیں ہے۔ بہرحال میں تمہاری تردید نہیں کرنا چاہتا۔ تم عمر بھر اس سے محبت کرو لیکن شادی کا خیال بھی نہ کرنا۔

کنور:- (مایوسی و دل شکستگی کے لہجہ میں) کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا!

راجہ:۔ ہم میں سے اکثر لوگ یہ تمنا کیا کرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس معاملہ میں ہم سے اجازت نہیں لی جاتی۔ اور جب ہم پیدا ہو جاتے ہیں تو ہمارا فرض ہوتا ہے کہ زندگی کو بہتر اور مفید تر بنائیں۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم اِس لڑکی سے شادی کر کے اپنی زندگی کو تباہ کر لوگے۔ بہرحال اب تمام حالات تمہارے سامنے ہیں اور مجھے تمہاری سعادت و شرافت اور عقل و تدبیر پر اعتماد ہے۔ ایک مفلس لڑکی ہے، جس کے ساتھ شادی کرنے سے تمہاری دلی آرزو وابستہ ہے۔ اور دوسری طرف ایک دولتمند لڑکی ہے جس کے ساتھ شادی کرنے سے تمہاری اور تمہارے خاندان کی عزّت و آبرو کی حفاظت متعلق ہے، اگر تم ایسے ہی نفس پرست، خود غرض اور پست ہمت ہو گئے ہو تو بہتر ہے، جو چاہو کرو۔ اپنی قدیم وضع، پُرانی ریاست اور بوڑھے باپ کو اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں کتنے دن کا مہمان ہوں۔ اب کے ہی ایسا سخت دورہ پڑا تھا کہ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ بس ایک دورہ کا اور ہوں۔ اور وہ اب کچھ دور نہ رہے گا۔ اگر اس وقت سے پہلے ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر بھی میرے لئے یکساں ہے۔ محل میں مرا یا جھونپڑی میں۔ لیکن جب تک جیوں گا تمہاری بدقسمتی، محرومی، بے آبروئی پر روؤں گا۔

اب کنور کو تاب نہ رہی چیخ مار کر باپ کے قدموں پر گر پڑا۔

کنور:۔ (روتے ہوتے) بس پتاجی، بس کیجئے۔ مجھ سے قصور ہوا معاف کیجئے۔ میں اپنے دل کو سینہ سے نکال کر پھینک دونگا لیکن آپ کا دل نہ توڑ دونگا۔ ہر آرزو کو آپ کی رضامندی پر قربان کر دوں گا۔

راجہ نے بیٹے کو سینہ سے لگا لیا اور دونوں دیر تک روتے رہے۔

منشی اقبال نرائن ابھی اسٹیشن سے گھر آئے ہیں۔ ان کا لڑکا اور دونوں لڑکیاں کلکتہ سے آئی ہیں۔ اُن کو لینے گئے تھے۔ گھر میں چہل پہل اور رونق بڑھ گئی۔ لیکن منشی جی کچھ متفکر نظر آتے ہیں۔ پہلے

سے کچھ دُبلے معلوم ہوتے ہیں، چہرہ پر فرحت اور اطمینان کے آثار نہیں ہیں۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ سیٹھ ساہولال آئے ہیں۔ منشی جی گھبرا کر مردانہ مکان میں چلے گئے ساہو لال منشی جی کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آداب کیا۔

منشی جی:۔ آداب عرض ہے بیٹھیے کہیے کیا خبر لائے

ساہو:۔ حالت بہتر نہیں ہے۔ شوگر ملز کے حصے برابر گر رہے ہیں۔ میں خبریں لینے باہر گیا تھا۔ ابھی تو آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ آگے دیکھیے کیا ہو۔

منشی جی:۔ یا خدا خیر کرنا۔ پھر کیا کیا جائے؟

ساہو:۔ انتظار کیجیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تجارتی حصے کنویں کے ڈول کی طرح چڑھتے اُترتے رہتے ہیں

منشی جی:۔ لیکن ہماری کمپنی کے حصے تو کئی ہفتہ سے برابر گرتے ہی چلے جاتے ہیں اگر میں اب بھی اپنے حصے فروخت کر دوں؟

ساہو:۔ (جلدی سے) اس وقت بیچنا غلطی ہے۔ کم سے کم آٹھ ہزار کا نقصان ہو جائے گا۔

منشی جی:۔ سارا سرمایہ ہاتھ سے نکل جانے سے تو یہ نقصان بہتر ہے۔

ساہو:۔ نہیں منشی جی نقصان نہ ہوگا منشی جی میں تو اب بھی خریدنے کی کوشش میں ہوں حصوں کی قیمت کا پھر بڑھنا یقینی ہے میں بنیک اور حصے خریدنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں۔ اگر مجھے پھر قیمت بڑھ جانے کا یقین نہ ہوتا تو میں اپنے حصے کیوں نہ فروخت کر دیتا؟

منشی جی:۔ یہ سچ بات ہے میں جس خطرہ میں ہوں اسی میں آپ بھی ہیں۔ لیکن یہ فرق بھی ہے کہ آپ دولتمند ہیں۔ نقصان برداشت کر سکتے ہیں۔

ساہو:۔ منشی جی آپ کا یہ فرمانا درست ہے۔ لیکن ہم تجارت پیشہ لوگ پندرہ ہزار روپیہ کو معمولی چیز نہیں سمجھتے۔ بہرحال اگر آپ موجودہ نقصان گوارا کرنا چاہتے ہیں تو بیشک اپنے حصے خوشی سے فروخت کر دیجئے۔ لائیے میں ہی لے لیتا ہوں۔

منشی جی:- لیکن آٹھ ہزار کا نقصان تو میرے لئے بہت ہے۔ نہیں میں آپ کے مشورہ پر عمل کرونگا ہم دونوں ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں جو آپ کا حال ہوگا وہ میرا ہوگا۔ میں آپ پر پورا بھروسا رکھتا ہوں۔

ساہو:- بیشک۔ بہترین تدبیر یہی ہے۔ آپ یقین رکھئے کہ قیمت پھر چڑھے گی۔ اور ضرور چڑھے گی۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ آپ کو دُگنا تگنا نفع حاصل ہو۔ اس کا سبب بھی آپ کو کسی وقت معلوم ہوگا۔

منشی جی:- کیا بات ہے۔ کہئے۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔

ساہو:- میں عرصہ سے دل میں ایک تمنا، ایک آرزو رکھتا ہوں لیکن عرض کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

منشی جی:- کچھ میرے متعلق ہو میرے کرنے کا کام ہو تو بیان کیجئے۔

ساہو:- جی آپ ہی سے متعلق ہے۔ میری نہایت مودبانہ درخواست ہے کہ آپ مجھے اپنی فرزندی میں لے کر عزت افزائی فرمائیں۔

منشی جی:- فرزندی؟ کیا مطلب؟ میرا دماغ کچھ پریشان سا ہے صاف کہئے۔

ساہو:- آپ کی چھوٹی صاحبزادی سے رشتۂ نکاح کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں

منشی جی:- (تھوڑی دیر دم بخود رہ کر) لیلا کے ساتھ؟ وہ تو ابھی بچہ ہے۔ میں نے کبھی اِس کا تصور بھی نہیں کیا۔ آپ نے مجھے یکایک گھبرا دیا۔

ساہو:- منشی جی میں نے عاجزانہ درخواست کی ہے۔ مجھے جواب و منظوری کی جلدی نہیں ہے۔ آپ سوچ لیجئے۔ لیکن آپ کو ذاتی طور پر تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کیا مجھے اِس عزت کے قابل تصور نہیں فرماتے؟

منشی جی:- نہیں۔ نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔ آپ ہر طرح سے اہل ہیں۔ آپ کے متعلق مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن آپ کو شاید معلوم ہو کہ میں اس معاملہ میں اپنی اولاد کی رائے دلپسند اور اپنی منظوری دونوں کو مدنظر رکھتا ہوں۔ مجھے اپنی اولاد کی سعادت مندی اور سلامت روی پر کامل اعتماد ہے

ساہو:- بجا فرمایا۔ نہایت صحیح اصول ہے۔ لڑکیوں کو کم سے کم اتنی آزادی ضرور ملنی چاہئے۔

منشی جی :- میں نے بڑی لڑکی کے معاملہ میں اس اصول پر عمل کیا۔ میں نے جگہ تجویز کی اور لڑکی نے اُسے پسند کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ رشتہ نہایت قابلِ اطمینان اور موجب مسرت و برکت ثابت ہوا۔
ساہو :- بیشک ہونا ہی چاہئے۔ اگر آپ نے مجھے شرف قبول بخشا تو یہ رشتہ بھی ایسا ہی کامیاب ہیگا۔ مجھے تو اس وقت صرف گوش گذار کرنا تھا۔ اور یہ دریافت کرنا تھا کہ میری درخواست قابلِ سماعت ہے۔
منشی جی :- ناقابلِ سماعت ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔
ساہو :- شکریہ عرض کرتا ہوں۔ آپ نے یہ اطمینان دلاکر مجھے بے داموں مول لے لیا۔

اس گفتگو کے بعد ساہو لال اُٹھ کر جانا ہی چاہتا تھا کہ تار والے کی آواز آئی اور فوراً ملازم نے تار کا لفافہ منشی جی کو لاکر دیا۔ غریب گھروں میں جہاں برسوں تار نہیں آتا۔ تار آنے سے پریشانی ہو جاتی ہے۔ منشی جی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ مضمون پر نظر پڑتے ہی سناٹا آگیا۔ پسینہ جاری ہوگیا۔ اور تار کے فارم پر نظر جم کر رہ گئی۔ ساہو لال اول تو گھبرا گیا۔ پھر ذرا ہمت کر کے کہا۔ منشی جی کیسا تار ہے خیریت تو ہے؟ منشی جی نے فارم ہاتھ سے چھوڑ دیا اور چیخ مار کر دھم سے کرسی پر گر پڑے۔ اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ساہو نے فارم اُٹھا کر پڑھا تو لکھا تھا کہ "شوگر ملز دیوالیہ ہوگئی" کسی ایجنٹ کی فرم کا تار تھا۔ تھوڑی دیر بالکل خاموشی طاری رہی۔ آخر منشی جی نے آہ بھر کر کہا "میں بالکل لُٹ گیا۔ میرے بچّوں کی قسمت پھوٹ گئی"
ساہو :- منشی جی ہمت باندھئے۔ دل مضبوط رکھئے۔ ابھی یہ خبر تصدیق طلب ہے۔ پھر حالات و واقعات کی تحقیقات کرنی ہے۔
منشی جی :- اب کیا ہوتا ہے۔ میں تو تباہ ہی ہوگیا۔ ساری پونجی لٹ گئی۔ مجھ جیسے غریب کے لئے پندرہ ہزار روپیہ کا ڈوب جانا کچھ تھوڑی بات نہیں۔ اب بچوں کے لئے فاقہ ہی فاقہ ہے۔

ساہو :۔ منشی جی آپ اس قدر مایوس نہ ہوں۔ اس ایک تار پر آخری فیصلہ منحصر نہیں۔ ابھی آئندہ کارروائیوں سے بہت کچھ اُمید ہوسکتی ہے۔ دیکھئے میں خود اسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میرا بھی اِتنا ہی نقصان ہورہا ہے۔

منشی جی :۔ آپ اپنی نہ کہئے۔ آپ دولت مند ہیں۔ اِس کڑی کو جھیل جائیں گے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا میرا تو گھر۔ اسباب برتن بھانڈے تک نیلام ہوجائینگے۔ میں کیا جانتا تھا جو ان لمیٹڈ کمپنی میں روپیہ ڈبو یا۔

ساہو :۔ بیشک آپ کا نقصان بڑا بھاری ہے۔ اور اِس سے بڑا رنج وصدمہ ہوتا ہے۔ لیکن خداوند کریم کی کارسازی پر نظر رکھئے۔ منشی جی میں آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ مجھے اپنی اولاد کے برابر سمجھئے

منشی جی آخری فقرہ کے اشارہ کو فوراً سمجھ گئے۔ ایک دم چکر سا آیا لیکن سنبھل گئے۔ اور دم گھونٹ کر رہ گئے۔ مجبوری بُری بلا ہے مفلسی شیروں کو لومڑی بنا دیتی ہے۔ ساہو نے پھر کہنا شروع کیا۔

ساہو :۔ منشی جی آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں آپ کو باپ کے برابر سمجھتا ہوں بڑوں کی خدمت کرنا چھوٹوں کا فرض ہے۔ اب میں اور آپ کوئی غیر نہیں رہے۔ آپ اِس فدوی کو اپنی فرزندی میں قبول کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب لیلا —— آپ کا ہے۔ اِس نقصان کا غم نہ کریں اور (جیب سے چک بک نکالتے ہوئے) میری طرف سے پندرہ ہزار روپیہ بلکہ جتنے چاہیں۔

ابھی ساہو کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ برابر والے کمرہ میں جو زنانے مکان کا حصہ تھا۔ ایک ہلکی سی چیخ کی آواز آئی اور کوئی چیز زور سے گری۔ ساہو اور منشی جی دونوں چونک پڑے۔ اور منشی جی دروازہ کھول کر جلدی سے اندر چلے گئے۔

۸

جس وقت منشی جی تار کو دیکھ کر چیخ مار کر کرسی پر گرے تھے اُن کی دونوں لڑکیاں لیلا اور اُس کی

بہن دوڑ کر برابر والے کمرہ میں آ گئی تھیں۔ اور ذرا ٹھٹک کر دروازہ کھول کر مردانہ کمرے میں آنا چاہتی تھیں کہ اتنے میں باتوں کی آواز آنے لگی اور لڑکیاں رک گئیں۔ اور دونوں مردوں کی گفتگو سنتی رہیں۔

اب منشی جی کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ میز اور کرسی گری پڑی ہے اور دونوں لڑکیاں فرش پر بیٹھی ایک دوسری سے لپٹی ہوئی رو رہی ہیں۔ اس سین کو دیکھ کر منشی جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ ذرا دیر متحیر کھڑے رہے پھر چھوٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "کیا ہوا بیٹی کیا ہوا" لڑکیاں ایک دوسرے سے جدا ہوئیں اور منشی جی کا منہ تکنے لگیں۔

منشی جی:۔ (بڑی لڑکی سے) تو بتا کملا۔ کیا بات ہے؟

کملا:۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) چاچا جی، آپ نے کیوں چیخ ماری تھی۔ ہم دونوں آواز سن کر دوڑ کر آ گئے تھے۔ آپ کیا باتیں کر رہے تھے یہ کیا کہہ رہے تھے کہ ہم لٹ گئے؟

منشی جی:۔ (بھرائی ہوئی آواز سے) تم دونوں نے ساری باتیں سن لیں۔ میں تم سے چھپانا چاہتا تھا تمہارے دلوں کو رنج دینا نہ چاہتا تھا۔ ہائے بچو ہم بالکل تباہ ہو گئے، برباد ہو گئے۔ کیا کہوں میں نے اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں کلہاڑی ماری۔ ساری جمع پونجی جس کی آمدنی زندگی کا سہارا تھی ایک کمپنی میں لگا دی اس کا دیوالہ نکل گیا۔ سارا روپیہ برباد گیا۔ وہ کمپنی ان لمیٹڈ تھی۔ تم اس کو کیا جانو۔ یوں سمجھ لو کہ صرف وہ روپیہ نہیں گیا بلکہ یہ گھر۔ سامان پلنگ پیڑھی۔ برتن بھانڈے سب گئے۔ سب کا نیلام ہو جائے گا۔ ہم گھر سے نکال دئے جائیں گے۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں رہی۔ یا خدا میں کیا کروں۔

کملا سر پکڑے اور لیلا دل پر ہاتھ رکھے سن رہی تھی۔ یہ مایوسی کے کلمے سن کر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ منشی جی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ چند منٹ کے بعد ذرا دل ٹھہرا تو کملا بولی۔

کملا:۔ اور چاچا جی۔ یہ دوسرے آدمی ساہو لال جی تھے؟

منشی جی:۔ ہاں۔

کملا :- ساہولال جی آخر میں کیا کہہ رہے تھے۔ اسی کو سُن کر لیلا لڑکھڑا کر گرنے لگی تھی۔ میں نے سنبھالا دھکے سے میز کرسی گر پڑی۔

یہ سُن کر لیلا نے سر جھکا کر منہ چھپا لیا۔

نشی جی :- ساہولال بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں۔ میرے اسکول کے لئے پانچہزار روپیہ نقد دے چکے ہیں۔ یہ تمھیں معلوم ہی ہے۔ اس کمپنی کے حصے میرے ساتھ اُنھوں نے بھی اتنے ہی خریدے تھے اُن کا بھی پندرہ ہزار کا نقصان ہو گیا۔ ابھی تار آنے سے پہلے اُنھوں نے مجھ سے لیلا کے لئے خواستگاری کی تھی۔ میرے نزدیک اس رشتہ میں کچھ حرج نہ تھا۔ بڑے لائق آدمی ہیں لیکن میں نے اُن کو پکا جواب نہ دیا تھا بغیر تم سب کے مشورہ کے اور لیلا کی مرضی لئے بغیر کس طرح اقرار کرسکتا تھا۔ اب اس مصیبت کا تار آیا تو ساہولال نے بڑی ہمدردی کی۔ دلاسا دیا۔ ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا۔ لیکن وہ تو سب تم سُن چکی ہو۔

اِس تقریر کے دوران میں کملا کا رنگ فق اور لیلا کا دم بند تھا۔ نشی جی خاموش ہوئے تو سناٹا چھا گیا۔ آخر ذرا دیر کے بعد کملا نے نشی جی کی طرف دیکھ کر کہا۔

کملا :- یہ تو بڑی مشکل ہوئی۔ چا چا جی اس مصیبت کے ساتھ ایک اور مصیبت بھی آگئی (اس فقرے پر لیلا سر اُٹھا کر کملا کا منہ دیکھنے لگی) میں تو آپ سے کہنے ہی والی تھی۔ آج ہی تو ہم کلکتہ سے آئے تھے۔ ابھی دم نہ لیا تھا کہ یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں دو ایک دن میں ذکر کرتی۔

نشی جی :- (گھبرا کر) کیا ہے کملا۔ کیا ہے۔ جلدی کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو۔ تم تو میرے ہوش حواس کھوتے دیتی ہو۔

کملا :- نہیں چا چا جی پریشان نہ ہوجیئے۔ اطمینان رکھئے۔ میں کہہ رہی تھی کہ لیلا کے لئے تو ایک اور جگہ زیادہ اچھی تھی (یہ سنتے ہی لیلا کا سر جھک گیا۔)

نشی جی :- کہتے کہتے یہ کیا کہنے لگی۔ کیسی جگہ ؟ کون سی جگہ ؟

کملا:- میں یہی بات کہنے والی تھی۔ لیلا کا بیاہ کنور محبت سنگھ سے ہوتا تو اچھا تھا
منشی جی:- اری کیسی باتیں کرتی ہے۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگلا تیلی۔
کملا:- نہیں چاچاجی یہ بات نہیں۔ کنور جی خود چاہتے ہیں۔
منشی جی:- کنور جی چاہتے ہیں اور لیلا؟
کملا:- لیلا بھی۔
منشی جی:- تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ کس نے کہا؟ لیلا نے؟ کنور جی نے؟
کملا:- کسی نے نہیں۔
منشی جی:- پھر؟
کملا:- نظریں دل کا بھید کہہ دیتی ہیں۔ میرے نزدیک لیلا اور کنور میں ایسی بات چیت بھی نہ ہوئی ہوگی یہاں اور کلکتہ میں کبھی کبھی ٹی پارٹی اور ڈنر میں دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔ لیکن عورت سے عورت کا بھید نہیں چھپ سکتا۔ بہت دن ہوئے میں نظروں سے بھانپ گئی تھی۔ میرا وہ خیال برابر پکا ہوتا رہا اور میں اس کی منتظر تھی کہ کنور جی اور راجہ جی کی طرف سے اس کی تحریک ہوگی۔ اور اب ہم کلکتہ سے آگئے ہیں تو ضرور ہوگی لیکن میرا ارادہ تھا کہ آپ سے پہلے ہی اپنا خیال بیان کردوں۔

منشی جی یہ سن کر دیر تک دم بخود رہے بولنا چاہتے تھے مگر ہمت نہ ہوتی تھی آخر ایک دم کھڑے ہوگئے اور لیلا کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے:- "لیلا تو نے سنا؟ کیا یہ سچ ہے؟ اچھا مجھ سے نہیں کہتی تو اپنی بہن سے کہہ دینا۔ لیکن میری سن لے۔ بیٹی تیری خوشی میری خوشی ہے۔ تیری خاطر مجھے عزیز ہے۔ تو اس مصیبت اور پریشانی کا کچھ خیال نہ کر۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ دنیا میں بڑے بڑے امیر غریب ہو گئے ہیں۔ لیکن غریبی میں آدمی مر نہیں جاتا۔ غریبی کچھ بے عزتی کی بات نہیں ہے۔ میں اور تیرا بھائی فتح نرائن مرد ہیں۔ میں بوڑھا ہوں تو وہ جوان ہے۔ ہم گذر کرلیں گے۔ یہ گھر چھن جائے گا تو خدا اور گھر دے گا۔ اور مال اسباب مہیا ہو جائے گا۔

لیکن میں تیرا دل میلا نہ کروں گا۔ اگر میرے تجویز کئے ہوئے رشتہ میں تیری مرضی نہیں ہے تو میں ابھی جا کر انکار کئے دیتا ہوں۔ ساہو لال باہر بیٹھے ہوں گے۔"

جتنی دیر منشی جی بولتے رہے لیلا برابر پیچ و تاب کھاتی رہی۔ جیسے درمیان میں بولنا چاہتی ہو۔ منشی جی نے بات پوری کی تو لیلا جلدی سے سنبھل کر بیٹھی ایک ہاتھ زمین پر جا کر رکھا۔ باپ کی طرف ایک لمحہ کے لئے نظر اُٹھا کر گردن نیچی کر لی۔ اور اس انداز سے کہ معلوم ہوتا تھا ساری ہمت اور قوت اکھٹی کر رہی ہے۔ آہستہ آواز اور صاف لہجہ سے بولی۔ "چاچا کملا جھوٹ کہتی ہیں مجھے آپ کی تجویز منظور ہے۔ آپ جا کر ہاں کر دیجئے۔"

منشی جی یہ سن کر لڑکھڑا گئے۔ لیلا کی طرف دیکھا اور بولے۔

منشی جی:۔ لیلا تو یہ بات دل سے نہیں کہتی۔

لیلا:۔ نہیں چاچا، دل سے کہتی ہوں جائیے وہ کہیں چلے نہ جائیں۔ منشی جی لیلا کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن کملا نے اشارہ سے روکا۔ اور باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلے۔ کواڑ کھول کر مردانہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ادھر دروازہ بند ہوا اُدھر لیلا کملا کے اوپر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

۹

جتنی دیر منشی اقبال نرائن زنانہ کمرے میں لڑکیوں سے باتیں کرتے رہے، ساہو لال برابر کواڑوں سے کان لگائے سنتا رہا۔ کمینہ گھر کا بھیدی بے۔ بانکا۔ منشی جی کی آہٹ سنتے ہی دروازے سے ہٹ کر میز کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور جیب سے چیک بُک نکال کر اس کو بھرنے لگا۔ منشی جی کمرے میں داخل ہوئے تو ساہو نے پندرہ ہزار روپیہ کا چیک منشی جی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

ساہو لال:۔ منشی صاحب خیریت ہے؟

منشی جی: جی خیریت ہے۔ لڑکیوں نے، کملا اور لیلا نے ہماری سب باتیں سُن لی تھیں۔ لیلا پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ (چک پر نظر ڈالتے ہوئے) سیٹھ ساہو لال جی میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کرسکتا ہوں لیکن میں اتنی بڑی رقم کو قبول کرنے سے معذور ہوں۔

ساہو لال: منشی صاحب، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن نہیں میں آپ کے جذبات کو سمجھتا ہوں۔ مگر آپ اس ناچیز رقم کو بطور قرض کے قبول فرمالیجئے۔ قرض لینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ منشی جی بس اب کچھ نہ کہیئے۔ آپ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کا ادا کرنا مشکل ہوگا۔ لیکن میں کہتا ہوں خدا آپ کو اتنی دولت دے گا کہ یہ کوئی بات ہی نہ ہوگی۔ بس۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔

منشی جی کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ساہو جلدی سے آداب عرض کرکے رخصت ہوگیا۔ باہر نکلتے ہی ساہو کی حالت میں تغیر پیدا ہوگیا۔ ایک خطرناک تبسم ہونٹوں پر نمودار ہوا، بھویں تن گئیں۔ مٹھیاں بند ہوگئیں اور آپ ہی آپ کہنے لگا، "فتنی، راجہ کے بیٹے پر لٹو ہے، دولت پر ترجھی ہے، یہ خبر نہیں راجہ کنگلا ہے، اس کی ریاست کیا عزت آبرو میری مٹھی میں ہے۔ رانی بننا چاہتی ہے۔ اری راجہ کہاں جو رانی بنے گی بہن کس ناز و انداز کے ساتھ باپ سے سفارش کرتی ہے۔ اس کو بھی راجہ کی سالی بننے کی دھن ہی۔ جیسے راجکمار ہیرے جڑے کنگن ہی تو سالی کو پہنا دے گا۔ اچھا، دیکھا جائے گا، منشی کہاں جاتے ہیں اور تم دونوں کہاں جاتی ہو۔ سب کو شکنجے میں کس لیا ہے۔"

ساہو اسی دھن میں ایک گلی میں چلا جارہا تھا کہ ایک شخص کا دھکا لگا۔ چونک کر دیکھا تو آواز آئی، "سیٹھ جی بندگی، میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

ساہو: (اس شخص کو پہچان کر لیکن انجان بن کر) کیا بات ہے؟

شخص: گھوڑے کی بابت ہے۔

ساہو: کیسا گھوڑا؟

شخص:۔ سرکار ایسا نہ کہو۔ یہاں کوئی آس پاس نہیں ہے کہ ہماری باتیں سُن لے گا۔ وہی کنور محبّت سنگھ کا گھوڑا، گھوڑ دوڑ والا "ہیرا" جو ایکا ایکی مرگیا تھا۔

ساہو: مجھے معلوم ہے گھوڑا مرگیا۔ اخبار میں دیکھا تھا۔ لیکن مجھے اس کی بابت اور کچھ نہیں معلوم نہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

شخص:۔ (پریشان ہوکر) ساہولال جی یہ بات ٹھیک نہیں۔ میرے ساتھ یہ داؤ چلنے سے کیا فائدہ، میں نے وہ کام آپ کی مرضی کے موافق کر دیا تھا۔ بیشک مجھے اُجرت بھی مل گئی تھی میں کب کہتا ہوں نہیں ملی، لیکن میں تو یہ کہتا ہوں سرکار، کہ اب میرے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوئی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔

ساہو:۔ تمہارے لئے؟

شخص:۔ ہم دونوں کے لئے۔ میں پکڑا گیا تو سَو روپیہ کے لئے مُنہ بند نہ رکھوں گا۔ اس کام کے تو پانسو بھی کم تھے۔

ساہو:۔ تمہارا یہ مطلب ہے کہ کچھ اور مل جائے تو کہیں باہر جاکر روپوش ہو جاؤ؟

شخص:۔ (خوش ہوکر) یہی مطلب ہے حضور۔ پولیس تحقیقات کر رہی ہے جلدی میرا پتہ لگالے گی۔ چھ مہینے بھی کہیں پہاڑی علاقے میں جاکر چھپ رہا تو معاملہ دب جائے گا۔ بس سیٹھ جی پچاس روپیہ مہینے کا حساب ٹھیک رہے گا۔

ساہولال یہ سُن کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

شخص:۔ کیا دیکھ رہے ہو سیٹھ جی؟

ساہو:۔ پولیس کے سپاہی کو دیکھتا ہوں۔

شخص:۔ سپاہی کو؟

ساہو:۔ ہاں میں تم کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں کنور محبّت سنگھ کے گھوڑے کو زہر دینے کے

الزام میں اور مجھ سے اِس وقت روپیہ اینٹھنے کی کوشش کے جُرم میں۔

شخص:۔ (دانت پیس کر) یہ بات ہے، کیوں سیٹھ ساہو لال جی! اچھا بلاؤ پولس کو۔ پکڑ وا دو۔ میں بھی حلف اُٹھاؤں گا کہ تم نے مجھے اُجرت دے کر گھوڑے کو زہر دلوایا، میں ثابت کر سکتا ہوں۔

ساہو:۔ گھاسی رام، بیکار بک بک نہ کرو۔ اور یہ بات کان کھول کر سُن لو کہ آئندہ کبھی میری تمہاری مڈبھیڑ ہو تو مجھ سے بات نہ کرنا، ورنہ اُسی وقت گرفتار کرا دوں گا۔ میں اور تمھیں کنور کے گھوڑے کو زہر دینے کے لئے روپیہ دوں جس کی شادی میری بہن اندرا سے ہونے والی ہے! گھاسی رام، تمہاری عقل کہاں ماری گئی۔ کوئی عدالت تمہاری بات کا یقین کر سکتی ہے؟ جاؤ اپنا کام کرو۔ اچھا ٹھہرو (جیب سے ایک روپیہ نکال کر اور گھاسی رام کی طرف پھینک کر) لو، تمباکو پینا۔ اور ٹھنڈے دل سے غور کرنا تو بات تمہاری سمجھ میں آ جائیگی

گھاسی رام ایک دو سکنڈ تک حیرت اور نفرت کے ساتھ ساہو لال کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر پاؤں اُٹھا کر روپیہ پر مارا اور اس بے گناہ سکّے کو خوب جوتے سے رگڑا۔ جیسے یہی ساہو لال تھا۔ لیکن پھر کچھ خیال آیا تو گالیاں دیتے ہوئے روپیہ کو اٹھا لیا اور چل دیا۔

بڑے تجربہ کی بات کہی ہے شیخ سعدی نے۔ "دشمن تواں حقیر و بیچارہ شمرد"۔ کیڑے کو بھی پاؤں سے مسلنا کبھی نقصان دے جاتا ہے۔ دانشمندی اسی میں تھی کہ ساہو لال گھاسی رام کو دشمن نہ بناتا، چاہے اس میں کچھ صرف ہی کرنا پڑتا۔

راجہ عزّت رائے نے اپنے خاندان کے ایک بزرگ کو سیٹھ بابا داس کے پاس بھیج کر ان کی لڑکی اندرا کے لئے اپنے لڑکے کنور محبت سنگھ کا پیام بھیجدیا ہے اور سیٹھ جی نے منظور کر لیا ہے۔ سیٹھ جی بڑی دھوم سے شادی کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سیٹھ جی خود منشی اقبال نرائن کے پاس آکر ساہو لال

کے لئے لیلا کو مانگ گئے۔ منشی جی نے بھی قبول کر لیا۔ لیکن منشی جی آجکل بڑے متفکر اور پریشان سے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ یہ رشتہ لیلا کی مرضی کے موافق نہیں ہے۔ ادھر لیلا بالکل کھوئی سی رہنے لگی ہے۔ بڑی شوخ طبع اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ کبھی نچلی بیٹھتی ہی نہ تھی۔ لیکن اب وہ لیلا ہی نہ رہی۔ ساہو لال اکثر منشی جی کے پاس آتا ہے، کبھی رخصت کا تقاضا بھی کر دیتا ہے۔ لیلا یہ تقاضے سُن کر اور بھی پیلی پڑتی جاتی ہے۔ منشی جی ساہو لال کو تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے ہیں، لیکن کملا سے سامانِ رخصت کے مشورے کرتے رہتے ہیں۔ اور خاموشی کے ساتھ تیاری کر رہے ہیں۔

ایک دن تینوں بہن بھائی کملا، لیلا، فتح نرائن کمرے میں بیٹھے تھے۔ کملا کچھ سی رہی تھی، لیلا کی گود میں ایک کتاب کُھلی رکھی تھی لیکن نظریں سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں، فتح نرائن جھولے دار کرسی پہ لیٹا جھونکے کھا رہا تھا اور سگرٹ کے دھویں اُڑا رہا تھا۔ یکایک کہنے لگا۔

فتح نرائن :- کملا، اپنا سر بچانا!

کملا :- (چونک کر) کیا کہا، سر بچانا؟

فتح نرائن :- ہاں، تمھیں خبر نہیں، لیلا نے مسمریزم کی ایسی مشق کر لی ہے کہ اب یہ تصویر اس کی نظر کے زور سے تمہارے سر پر آنے والی ہے۔ دیکھا نہیں، کتنی دیر سے تصویر کو تک رہی ہے۔

فتح نرائن کو اُمید تھی کہ اس کے جواب میں لیلا کم سے کم کتاب تو اس کے پھینک ہی مارے گی۔ اور وہ اپنا سر بچانے کے لئے سنبھل بیٹھا تھا۔ لیکن لیلا نے مسکرا کر صرف اتنا کہا "گھنٹہ بھر سوچتے سوچتے یہ بات دماغ سے اُتاری۔ تمباکو نوشی نے ذہن کند کر دیا ہے۔"

اس کے بعد چائے آگئی۔ تینوں ناشتے کی میز پر جا بیٹھے۔ کھانے کے بعد فتح نرائن اخبار دیکھنے لگا۔ کملا نے کپڑا سینے کے لئے اُٹھا لیا۔ لیلا خاموش بیٹھی تھی کہ فتح نرائن دفعتہً بول اُٹھا۔

فتح نرائن :- کملا، لیلا کے کھسرا نکلنے والی ہے۔

کملا :- خدا نہ کرے فتی! تمھیں بیٹھے بیٹھے یہ کیا سوجھا کرتی ہے

فتح نرائن :- یہ شرارت نہیں ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں۔

کملا :- کیسے معلوم ہوا۔

فتح نرائن :- لیلا میں کھسرا کی ابتدائی علامتیں پیدا ہو چلی ہیں۔ اس کی بھوک کئی دن سے برابر کم ہو رہی ہے۔ آج اس نے ناشتہ چھوا تک نہیں۔ یہ کھسرا کی یقینی علامت ہے۔ پھر لیلا بہت خاموش اور متفکر رہنے لگی ہے۔ یہ بھی کھسرا کی پہچان ہے۔ اس کے علاوہ تم نے نہ دیکھا ہو میں نے دیکھا ہے کہ لیلا آپ ہی آپ، بات بے بات کبھی مسکرانے لگتی ہے۔ کبھی سُرخ ہو جاتی ہے۔ کبھی پیلی پڑ جاتی ہے۔ یہ بھی سب نشانیاں کھسرا کی ہیں۔ (لیلا سے مخاطب ہو کر) لیلا بہن اب تو اقرار کر لے باہنوں پر لال لال دھبے پڑنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر کو بلا لاؤں؟

کملا یہ تقریر سُن کر ہنستے ہنستے لوٹ ہو گئی۔ لیلا نے بھی کملا کا ساتھ دینا چاہا لیکن کوشش کارگر نہ ہوئی۔ بولی۔

لیلا :- فتی کی حماقتوں پر ہنسنا بھی اس کی عزت افزائی اور ہنسی کی توہین ہے۔ اس لڑکے کے کسی قول فعل کی پرواہی نہ کیا کرو۔

فتح نرائن :- لو اور سُنو، بڑی بہن کو بیوقوف بنا دیا!

لیلا :- (چمک کر) وہ کیسے؟

یکایک لیلا کی بے حسی و جمود کی کیفیت دور ہو گئی، شرارت کی چمک آنکھوں میں پیدا ہو گئی۔ ہونٹوں پر تمسخر آمیز تبسم آ گیا۔ بحث و مناظرہ کا فطری شوق عود کر آیا۔ یہ حالت دیکھ کر کملا کے چہرے پر مسرت و اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی اور کام چھوڑ کر باتوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مدتوں سے لیلا ایسی گم سُم تھی کہ اس کا اصلی شوخ رنگ نظر ہی نہ آتا تھا۔ کملا کو یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ کہیں لیلا کو دل کی بیماری

نہ ہو جائے یا دماغ پر اثر نہ ہو جاتے۔ اس نے چند بار لیلا کو باتوں باتوں میں جوش دلانا اور اُس کی سوئی ہوئی فطرت کو بیدار کرنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ کملا کا کبھی کبھی جی چاہا کہ لیلا سے بات بے بات لڑ پڑے، چھیڑے، دق کرے۔ تاکہ لیلا اس سے بحث مباحثہ کرے لڑے جھگڑے اور اس طرح اس کی بے حسی دور ہو۔ لیکن کملا اس ڈھب کی آدمی نہ تھی۔ کبھی کملا اور لیلا میں بچپن میں بھی لڑائی جھگڑا نہ ہوا تھا۔ فتح نرائن اور لیلا تقریباً برابر کے تھے تھوڑا ہی سا فرق تھا۔ ایک سے ایک زیادہ شر انگیز تھا۔ بچپن سے اب تک مشکل سے کوئی دن ایسا گزرا ہوگا کہ دونوں ایک جگہ ہوں اور نچلے بیٹھے ہوں۔ چھیڑ چھاڑ، حجت تکرار، لعن طعن کچھ نہ کچھ ہنگامہ چند منٹ یا چند گھنٹے ہونا ضرور تھا۔ لیکن دونوں میں باہم محبت بھی ایسی تھی کہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتا تھا۔ اور یہ اختلاف یا مخالفت زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہ ہوتی تھی۔ اور اکثر و بیشتر اس کا اختتام کملا کی ڈانٹ ڈپٹ سے ہوتا تھا یا منشی جی کے یکایک آجانے سے۔ کملا سے دونوں کو بڑی محبت تھی، لیکن اس کا ادب بھی بہت کرتے تھے۔ کملا نے دس بارہ برس کی عمر سے اپنی شادی تک بلکہ آج تک ماں کی طرح بہن بھائی کی خدمت کی تھی۔ لیلا کی طرف سے جو فکر و تردد کملا کو تھا وہی فتح نرائن کے دل میں بھی تھا۔ لیلا کی یکایک بیداری فطرت کو دیکھ کر بات بڑھانے کے ارادے سے اس نے جواب دیا۔

فتح نرائن:۔ تم نے کملا کے ہنسنے کو بے موقع کہا، اور بے سبب ہنسنا بیوقوں کا کام ہے۔

لیلا:۔ اور حماقت کی بات کہہ کر اپنے اوپر ہنسوانا عقلمندوں کا پیشہ ہوگا؟

فتح نرائن:۔ کملا ذرا سُننا، یہ آپ تو پاگلوں کی سی حرکتیں کریں اور کوئی ان پر ہنسے بھی نہیں۔

لیلا:۔ جھوٹ بول کر لوگوں کو پریشان کرنا پاگل پن سے کچھ کم ہے؟

فتح نرائن:۔ جھوٹ کی تعریف بھی معلوم ہے؟

لیلا:۔ نہیں تو، اب تم سکھاؤگے تو معلوم ہوگی۔

فتح نرائن:۔ جس جھوٹ سے کہنے والے کا مقصد جھوٹ بولنا نہ ہو اور سُننے والا یہی سمجھتا ہو،

اُس کو جھوٹ نہیں کہتے۔

لیلا: یہ منفی تعریف کرنا کونسی منطق اور فلسفہ میں آیا ہے؟ کیا دن کی صحیح تعریف یوں کی جاتی ہے کہ "جس وقت سورج نہ نکلا ہو اُس وقت کو دن نہیں کہتے" یا سخاوت کی تعریف اس طرح کرنی چاہیئے کہ "مقدرت ہونے پر دوسرے کی ضرورت یا سوال کے وقت امداد نہ کرنا سخاوت نہیں کہلاتی" تعریف ہمیشہ مثبت ہونی چاہیئے۔

فتح نرائن: معلوم ہوا تم کو تعریف کا فائدہ ہی معلوم نہیں۔

لیلا: تعریف کرنی نہ آئی تو تم نے سوچا لاؤ فائدے اور نقصان کی بحث چھیڑ دو۔ بات ٹل جائیگی

فتح نرائن: یہ بھی تم نے جہالت کی بات کہی۔ تعریف کے فائدے اور مقصد کا تعلق علم مجلسی سے ہے

لیلا: (بیساختہ قہقہہ لگا کر) واہ وا شاباش لڑکے واہ وا

تُو تُو سب علموں میں بازی لے گیا

منطق، فلسفہ، اخلاقیات، علم مجلسی، کیا کیا علوم پھیلا دیئے۔ ماشاءاللہ کیا کہنا ہے آپ کی ذات مجمع الخرافات کا۔ اب ذرا اِس پھیلاؤ کو سمیٹنا شروع کرو ورنہ کمرے میں جگہ باقی نہ رہے گی۔ کملا کا اِس ہجوم سے اب بھی دم گھٹنے لگا ہے۔ اپنا ضروری کام چھوڑ رکھا ہے۔

فتح نرائن: کملا، نہ جانے آج کیا بات ہے کہ لیلا تمہارے سر ہے۔ برابر تم پر چوٹ کر رہی ہے پہلے بیوقوف بتایا تھا، اب جاہل بنا دیا۔

لیلا: پھر تم نے شرارت سے بات کو ٹالا۔ میں نے تو مجلس، مجمع، ہجوم کا تلازمہ قائم رکھنے کے لئے دم گھُٹنا کہہ دیا تھا۔

فتح نرائن: جی، آپ کے ادبیات اور فن خطابت کا کیا کہنا ہے۔ ہندوستان کی خالدہ ادیب خانم آپ ہی تو ہیں۔

لیلا:۔ (مسکرا کر) اب آپ نے بھی تلازمہ سے کام لیا۔ ادبیات کی رعایت سے ادیب کا لفظ لانے کے لئے خالدہ ادیب خانم فرمایا۔

فتح نرائن:۔ تو آپ کو یہ گھمنڈ ہوگا کہ ہمارے سوا کوئی ضلع بول ہی نہیں سکتا۔

لیلا:۔ کیا طول کلام بھی علم مجلسی کا کوئی گُر ہے کہ ایک بات ختم نہ ہو اور اس میں دوسری اور تیسری بات نکلتی چلی آتے۔ یا صرف باتیں بنانی ہیں کسی بات کا ثبوت دینا نہیں ہے۔

فتح نرائن:۔ اچھا اب میں سمٹنا شروع کرتا ہوں تم اپنی عقل کا دامن پھیلا کر بھرتی جاؤ۔

لیلا:۔ یہ بھی محض بھرتی کی بات کہی۔ ارے بی۔ اے ہی تو پاس کیا ہے، وہ بھی فارسی لے کر اور پرشین کورس کا رکیٹ بنا کر، پھر منشی فاضل بننے کا دعویٰ کیوں، اور عربی فارسی بگھارنے کی ضرورت کیا؟

فتح نرائن:۔ اور تمھیں نخر.........

ابھی زبان سے پورا لفظ نہ نکلا تھا کہ ادھر کملا نے زور سے ڈانٹ کر کہا " ہاں"، کہا اور ادھر لیلا نے میز پر سے اسکیل اٹھا کر تانا۔ فتح نرائن جھینپ کر دم بخود رہ گیا۔

کملا۔ فتح نرائن، تم اپنے آپ کو بھول چلے تھے۔ ابھی تم نے علم مجلسی کا دعویٰ کیا تھا، اس پر بھی ناشائستہ بات زبان سے نکال رہے تھے۔

فتح نرائن:۔ (جلدی سے کرسی کے اوپر کھڑا ہو کر مقررانہ انداز و آواز سے) میری معزز بہنو، میں نہایت صدق دل اور کمال خلوص نیت سے اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں (کملا اور لیلا بے اختیار ہنس پڑیں) اور اس امر پر بے حد مسرت اور بے انتہا فخر کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میری ذکی الحس زود فہم اور موقع شناس بہنوں نے نہایت صحیح موقع اور ٹھیک وقت پر میری گرفت کی۔ ایسی برمحل گرفت ایک ایم پی اور ایم ایل اے کیلئے بھی باعث فخر اور لائق تحسین تھی۔

تقریر ختم ہونے سے پہلے دونوں بہنیں ہنستے ہنستے کرسیوں پر لیٹ گئی تھیں۔

لیلا:۔ (ذرا سانس درست ہونے کے بعد) واہ فتح داہ، تم خود بھی کچھ کم ذہین اور کم محل شناس نہیں ہو۔ (ہاتھ کے اشارے سے بات کاٹنے سے روکتے ہوئے) نہیں یہ مذاق نہیں تمسخر نہیں۔ بالکل سنجیدہ بات کہہ رہی ہوں۔ اس طویل دلچسپ کو ک سین (طربیہ منظر) میں جو ایک حزنیہ عنصر پیدا ہونے والا تھا۔ اور وہ مکمل نہ ہونے پر بھی ایک ملال کا شائبہ دلوں پر چھوڑ سکتا تھا، اُس کو تم نے اپنے مضحکانہ ایکٹنگ سے کس خوبصورتی کے ساتھ دُور کر دیا۔ ہماری پُر لطف گفتگو اب پھر اُسی اسپرٹ کے ساتھ جاری رہ سکتی ہے۔

کملا:۔ فتح نرائن، لیلا تم سے ہارنے والی نہیں۔ لیکن اب بہت دیر ہوگئی اس لئے یہ سلسلہ ختم ہونا چاہئے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں اِن باتوں سے تھک گئی۔ نہیں۔ مجھے تو بڑی دلچسپی رہی۔ برسوں سے تم دونوں کی "دوبحث بازی"، نہ سُنی تھی۔ بہرحال، چونکہ اس معاملے میں بعض علمی نکتے تھے جو ناتمام رہ گئے اس لئے چاہتی ہوں کہ ایک مسلسل تقریر میں وہ سب باتیں پوری کر دو۔

فتح نرائن:۔ (سر ہلا کر) واہ کملا، یہ نہیں ہوسکتا۔ میں کوئی لکچر دینے بیٹھا تھا۔ کیوں لیلا، کیا رائے ہے۔ ویسے تم کہو تو اب کے میز پر کھڑے ہو کر تقریر کر دوں۔

کملا:۔ اچھا، چلو، وہی انداز سہی۔ لیکن اب کوئی نئی چھیڑ نہ نکالنا، نئی پھبتی نہ کسنا۔

فتح نرائن خاموش رہا۔

لیلا:۔ تم نے مجھے کیوں الزام دیا تھا کہ میں نے کملا کو جاہل کہا۔

فتح نرائن:۔ اس لئے کہ عالموں کی صحبت اور علمی باتوں سے جاہل آدمی گھبراتے ہیں اور اُن کا دم گھٹتا ہے۔

لیلا:۔ یہ خاص تمہارے دماغ کی اُپج تھی۔ اچھا۔ کسی نامعلوم چیز کی تعریف بیان کرنے کا کیا فائدہ اور مقصد ہوتا ہے؟ اور اس کا علم مجلسی سے کیا تعلق؟ میں تمہارا سب مطلب پہلے ہی سمجھتی گئی تھی۔

فتح نرائن:۔ دیکھو۔ کملا نے لایعنی دعویٰ کرنے کو منع کر دیا ہے۔

لیلا:۔ (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) لیکن علم مجلسی سے اس کا تعلق نہیں سمجھی۔ اب تم کہہ دو کہ کملا

نے نئی لاعلمی کے اظہار کی بھی ممانعت کر دی ہے۔

فتح نرائن:۔ کملا، دیکھتی رہو، چھیڑ کس طرف سے ہوتی جاتی ہے۔ اچھا اب تم دونوں میری تقریر غور سے سنو۔ کملا کا اور میرا یہ مقصد تھا کہ یہ گفتگو اور جلسہ دیر تک قائم رہے تو اب علم مجلسی کی رو سے جائز تھا کہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کہی جائے جس میں تمھیں بولنے کا موقع ملتا رہے، ایک بات۔ دوسری یہ کہ میں نے جو شروع میں تمہارا حال بیان کیا تھا وہ ظاہر ہے کہ میرے تمہارے کملا کے تینوں کے نزدیک جھوٹ تھا۔ اس لئے اس کا بیان کرنا جھوٹ میں شامل نہ تھا۔ بلکہ محض دل لگی اور تفریح تھی۔ اسی لئے میں نے جھوٹ کی صحیح منطقی مثبت تعریف چھوڑ کر وہ فقرہ کہا جس سے اس کا جھوٹ نہ ہونا معلوم ہو۔ میرا مقصد براہ راست اسی سے حاصل ہوتا تھا۔ اور تعریف کا مقصد و فائدہ بھی یہی ہے ہماری مجلس کے ارکان کو پیش نظر رکھ کر اسی مقصد کے مطابق تعریف کرنے کی ضرورت تھی۔ اگر یہ مجلس مناظرہ ہوتی اور مناظرین و مخالفین کو لاجواب کرنا مقصود ہوتا تو ایسی تعریف کی جاتی جس میں کوئی علمی گرفت نہ ہو سکے۔ اب میں دوبارہ معزز سامعین کا شکریہ ادا کر کے اپنی تقریر ختم کرتا ہوں ڈراپ سین۔

لیلا:۔ (ہنس کر) پہلی بار کب شکریہ ادا کیا تھا۔ اچھا اس طول لاطائل سے تمہارا اور کملا کا کیا مدعا تھا؟

فتح نرائن:۔ اب کچھ مٹھائی سامنے رکھ کر شاگردی کرو تو تدبیر منزل کے اصول سمجھاؤں۔

لیلا:۔ اب گھر چلانے کا بھی دعویٰ ہو گیا۔ دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔

فتح نرائن جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ منشی جی آ گئے۔ تینوں خاموش اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔

منشی جی:۔ کملا، ساہو لال آئے تھے۔ دیر سے بیٹھے تھے، ابھی گئے ہیں۔ تقاضا کرتے تھے۔

ساہو لال کا نام سنتے ہی لیلا جلدی سے کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور سر جھکا لیا تھا۔ اس وقت سر اٹھاتی تو دیکھنے والے دیکھتے کہ چند سکنڈ میں لیلا کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ سفید، پژمردہ، افسردہ۔

۱۱
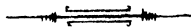
سا ہو لال شادی کی تیاری میں بڑے شوق و شغف کے ساتھ مشغول تھا۔ اکثر سوچا کرتا تھا کہ دلہن کو زیور تو ایسا دوں گا کہ رانیوں اور بیگموں کے سوا کسی کے پاس نہ نکلے۔ اور اخبارات کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں لیلا جولری کا نام ہو جائے۔ قیمت میں اوروں سے نہ بڑھا سکوں گا تو ڈزائن اور وضع تو ایسی پیدا کر دوں گا کہ بڑی بڑی رانیاں مہارانیاں خود دیکھنے کو نہ آئیں گی تو لیلا جولری کو منگا کر دیکھا کریں گی۔ اور کیوں نہ ہو، میں سنار، میرا باپ سنار، سناروں کا خاندان، سناری کا بیوپار، والد اپنے زمانے میں سارے ہندوستان میں یکتا ڈزائن اکسپرٹ تھے۔ بڑی مہارانی .... یورپ کی سیر کو گئیں تو لندن میں کسی ڈچز کے گلے میں نکلیس دیکھا۔ ایسا نفیس و نازک اور عجیب ڈزائن کا تھا کہ دیکھتے ہی لٹو ہو گئیں۔ نہ جانے کن حکمتوں سے اس کا اصلی سائز کا فوٹو حاصل کیا، اس میں اصلی رنگ بھرواتے، تمام جواہرات کے نام قیمت اتے پتے، بلکہ پوری ہسٹری لکھوائی۔ اور جن جوہریوں نے اس کو بنایا تھا ان سے اپنے لئے فرمائش کی۔ ان لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ اس کی بجنسہ نقل کرنے کی ہم کو ممانعت ہے۔ نہ بالکل اسی شکل کو چھوٹا یا بڑا کیا جا سکتا ہے۔ صورت البتہ بدلی جا سکتی ہے۔ مہارانی کہتی تھیں کہ نئی چیز بن گئی تو بات ہی کیا ہوئی۔ صرف اتنی تبدیلی منظور ہے کہ دور سے دیکھنے میں کوئی فرق نظر نہ آئے۔ دونوں کو مقابلے میں رکھنے سے فرق ہو تو ہو۔ جوہری اس شرط پر راضی تھے اور کہتے تھے کہ دو ہفتے بعد آپ کے سامنے تین ڈزائن پیش کئے جا سکتے ہیں صرف ڈزائنوں کی بنوائی تین ہزار روپیہ ہو گی، لیکن اگر ان میں سے کوئی ڈزائن پسند کر کے بنوائیں گی تو صرف ایک ڈزائن کی قیمت لی جائے گی۔ مہارانی کو یہ شرط منظور تھی، لیکن مہاراجہ دو ہفتے ٹھہرنا نہ چاہتے تھے، یکایک مہاراجہ کو والد کا خیال آ گیا اور انھوں نے مہارانی سے کہا کہ میں ہندوستان میں بالکل ایسا ہی بلکہ اس سے بہتر بنوا دوں گا۔ قیام گاہ پر آ کر مہاراجہ نے والد کی بڑی تعریف کی۔ ان کے

کارنامے بتائے اور اطمینان دلایا۔ مہارانی کو یقین تو نہ آیا لیکن مہاراجہ کا کہنا مان لیا۔ ہندوستان آتے ہی والد بلائے گئے۔ اور سارا قصہ بیان کیا گیا۔ اس موقع پر والد نے جیسی عجیب و غریب یادداشت اور ذہانت کا ثبوت دیا وہ انھیں کا کمال تھا۔ مگر قدردان بھی ہو تو ایسا ہو۔ اسی وقت والد کے اُٹھتے اُٹھتے مہاراجہ نے پانچہزار کا خلعت والد کو دے دیا۔ اِس نکلیس کی ساری داستان سُننے پڑھنے پر والد کو یکایک کچھ یاد آیا۔ مہاراجہ سے عرض کیا کہ سرکار اجازت دیں تو ابھی پانچ سات منٹ میں حاضر ہوتا ہوں، اسی کے متعلق ایک خاص بات عرض کروں گا۔ اُٹھ کر سرکاری موٹر میں اپنی جائے قیام پر آئے اور فوراً اپنے بکس میں سے ایک کتاب نکال کر لے گئے، اور مہاراجہ و مہارانی سے کہا کہ ایک عجیب خوشخبری عرض کرتا ہوں۔ یہ کتاب تاریخ جواہرات ہند ہے۔ جو غدر سے پہلے ایک انگریز نے مرتب کی تھی۔ اس کی ایک کاپی لندن میں ہے۔ ایک حضور کے خزانہ میں جواہرات کے ساتھ رکھی ہوئی ہے، اور تیسری کاپی یہ سرکار کے غلام کے پاس ہے۔ چوتھی کاپی میرے علم میں دنیا کے کسی کتب خانہ میں نہیں ہے کسی مجھ جیسے پرائیویٹ آدمی کے پاس ہو تو ہو۔ یہ کہہ کر والد نے کتاب کھول کر ایک صفحہ نکالا اور اس پر نکلیس کا فوٹو اور اس کی ہسٹری رکھ کر کہا کہ نکلیس کی ہسٹری میں لکھا ہے کہ یہ بیچ کا ہیرا ستارہ مشرق ہے جس کے ساتھ کا اس سے اک ذرا بڑا ہیرا کسی راجہ کے خزانے میں ہے۔ لیکن اس راجہ کا نام نہیں لکھا۔ اب ملاحظہ ہو کہ تاریخ جواہرات میں درج ہے کہ حضور کے خزانے میں دو ہیرے تھے جن کا نام سُبھ لگن تھا۔ ان میں سے ایک جو نسبتاً چھوٹا تھا لارڈ منٹو اول کے زمانے (۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۳ء) میں حضور کے جدِ امجد نے صاحب بہادر .... کی لیڈی صاحبہ کو عطا فرما دیا۔ اور وہ تا وقت تحریر کتاب فلاں ڈیوک کے جواہرات میں موجود تھا۔ اب میں نے اِس صفحہ پر نشان لگا کر تاریخ جواہرات کے آخر میں اپنی تحقیقات درج کر دی ہے کہ وہ سُبھ لگن ہیرا فلاں موجودہ ڈیوک کے خزانے میں ہے اور اسی کا نام وہاں ستارہ مشرق رکھا گیا ہے۔ یہ دونوں نام ہم معنی ہیں۔ یعنی سبھ لگن کے معنی ہیں "دو نیک ستاروں کا ایک برج میں جمع ہونا"۔ یہ دونوں ہیرے حضور کے قدیم تاریخی خزانے میں صدہا سال سے یکجا تھے۔ اسی لئے ان کا یہ نام رکھا گیا تھا۔ جب اِن دو ستاروں میں سے ایک جُدا ہو کر ولایت پہنچا تو اس کا نام بھی ساتھ گیا۔ وہاں والوں نے

اسی نام کی مناسبت سے ایسٹ اسٹار (ستارۂ مشرق) نام رکھ لیا۔ اب غلام کا مقصد ظاہر ہے کہ اس نکلیس کے ہیرے سے بڑا اور بہتر حضور کے پاس موجود ہے وہ جس عدد میں لگایا جائے گا اس کی قیمت صرف ایک ہیرے کے ذرا سا بڑا ہونے کے سبب سے ولایتی نکلیس سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ زیادہ ہوجائے گی۔

اِس انکشاف کو سُن کر مہاراجہ اور مہارانی کی خوشی کا کیا ٹھکانا تھا۔ خلعت کے علاوہ اسی دن سے والد کو نہ صرف شاہی ملازم بلکہ شاہی مہمان بنا لیا گیا۔ والد نے مہارانی کے لئے ایسا نکلیس تیار کر دیا کہ جب وہ دوسرے سال ولایت گئیں اور شاہی دربار میں اُس کو پہنا تو تمام یورپ میں دھوم مچ گئی۔ بڑے بڑے جوہری دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس ڈچز کو تو ایسی جھینپ ہوئی کہ اس نے دربار کے بعد سے وہ نکلیس پہنا ہی نہیں اور اس ہیرے کو کسی اور عدد میں جڑوا لیا۔

تو میری لیلا میرے لئے ڈچز اور مہارانی دونوں سے بڑھ کر ہے۔ میں نے بہت سی رانیوں مہارانیوں کو دیکھا ہو مشکل سے کوئی دیکھنے کے قابل ہوگی۔ راجہ کی بیوی بیٹی ہونا اور بات ہے۔ حسن و نزاکت اور چیز ہے۔ مُسلمان اپنی بہشت کی حوروں پر مرے جاتے ہیں۔ ارے تمہاری ساری حوریں میری ایک لیلا کے آگے کیا چیز ہیں۔ اور ان میموں کا حُسن تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ان میں تو کبھی کوئی دیکھنے کی شکل نظر آجاتی ہوگی۔ ورنہ اکثر کا پھیکا رنگ دیکھ مجھے تو یہی خیال ہوتا ہے جیسے جلد کی بیماری ہوگئی ہو۔ میری لیلا کا سا سُرخ و سفید رنگ تو آدم کی اولاد میں کسی کو ملا ہی نہیں۔ پھر اس کا نقشہ پرستان اور بہشت میں بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر ہے تو میری بہن اندرا ہے چشم بد دور دونوں سے۔ اندرا میں ایک غرور و تمکنت کی شان ایسی ہے کہ بالکل رانی معلوم ہوتی ہے۔ رانی ہی بننے کے قابل ہے اور رانی ہی بن کر رہے گی۔ لیکن اس شان کے سبب سے اُس کا حُسن خوفناک یا رُعب دار ہوگیا ہے اور ہے بھی وہ اپنی طبیعت اور مزاج میں بڑی خوفناک۔ خدا ہی ہے جو اس کی کسی کے ساتھ نبھ سکے۔ میں تو اپنی لیلا کو پوجتا ہوں.........

ایک دن ساہو لال دہلی کی گاڑی میں سوار ہوا تو یہ خیالات ایسے بندھے کہ کامل چار گھنٹے کے سفر میں

اسٹیشن سے خریدا ہوا انگریزی کا اخبار اس کے ہاتھ میں کھلا رہا اور وہ بجائے اخبار کے اپنے خیالات پڑھتا رہا۔ آخر دہلی کے اسٹیشن پر ٹرین ٹھہری تو اس کے خیالات کی ٹرین بھی یکایک رک گئی۔

ساہو لال اپنے دہلی آفس سے (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) جواہرات کی خریداری کے لئے چک بُھنانے اور نئے تجارتی حالات دریافت کرنے آیا تھا۔ دفتر میں پہنچا تو اس کا ہمراز منیجر بدستور کام میں مصروف تھا۔ ساہو لال نے اپنا مقصدِ سفر پورا کرنے کے بعد کہا۔

ساہو لال:۔ کہیے مسٹر ویاس کیا خبریں ہیں۔

منیجر:۔ آج کل کوئی جدید اطلاع نہیں۔ فضا بالکل ساکن ہے۔

اتنے میں یکایک ایک شخص دفتر میں داخل ہوا اور دونوں کو سلام کرکے مسٹر ویاس منیجر سے کان میں کچھ کہنے لگا۔ ساہو لال یہ دیکھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہ شخص پانچ منٹ بعد رخصت ہو گیا اور منیجر گھبرایا ہوا ساہو لال کے پاس آیا۔ اور کچھ ایسی اہم اور مخفی اطلاع تھی کہ باوجود تنہائی کے منیجر نے بہت آہستہ آہستہ ساہو سے کچھ کہا جس کو سن کر ساہو چونک پڑا اور رسید اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔

ساہو لال۔ (کرخت آواز میں)۔ کیا!

اس خبر پر ساہو لال کی یہ حالت و انداز پیدا ہونے سے منیجر کو بڑا تعجب ہوا اور اس نے پھر اسکو بیان کر دیا

ساہو لال:۔ (غصے سے) یہ جھوٹ ہے! ناممکن ہے! (پھر سنبھل کر، واس مجتمع کرکے) مسٹر ویاس معاف کرنا، تم نے مجھے یکایک حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ افواہ بیشک قابلِ اعتماد نہیں ہو۔ یقیناً غلط ثابت ہو گی

منیجر۔ تو آپ کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے؟ لیکن جس شخص نے اطلاع دی ہے وہ ہمیشہ قابلِ اعتماد ثابت ہوا ہے۔ بڑے بڑے نفع نقصان صرف اس شخص کی زبانی اطلاع کے مطابق پیش آتے رہے ہیں۔

ساہو لال (مسکرا کر) یہ وہ استثنا نکلے گا جو قاعدۂ کلیہ کو ثابت کرتا ہے۔۔ اس کے ایک لفظ کا بھی یقین نہ کرو۔ اچھا، بندگی۔

یہ کہہ کر ساہو لال گنگناتا ہوا چلدیا اور منیجر دروازے کی طرف تکتا کا تکتا رہ گیا۔ زینہ سے نیچے اُتر کر ساہو لال کی حالت بدل گئی، آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا: "یہ غضب ہو گیا اگر یہ خبر صحیح ہے تو ممکن ہے لیلا ہاتھ سے نکل جائے۔ اِس لئے اب شادی میں مطلق تاخیر نہ ہونی چاہیئے۔ کسی نہ کسی طرح منشی صاحب کو جلدی کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے" دہلی سے واپسی کا سفر اسی اُمید و بیم کے خیالات میں گزرا۔

(۱۲)

دوسرے روز صبح کو ساہو لال منشی اقبال نرائن کے مردانہ مکان میں داخل ہوا تو اتفاق سے کملا اور لیلا بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ منشی جی کے ہاں پردے کا کچھ ایسا دستور تھا کہ نہ بالکل بے پردگی نہ سخت پردہ۔ کسی غیر شخص کے سامنے لڑکیاں خواہ مخواہ نہ آجاتی تھیں لیکن کوئی اُن کے بیٹھے پر آجائے تو اُٹھتی بھی نہ تھیں۔ کوئی تقریب ہو، دعوت ہو، مہمانداری ہو تو مہمانوں کے سامنے بھی چلتی پھرتی کام کرتی رہتی تھیں۔ آج منشی جی کے پرانے کلاس فیلو اور سچے دوست ڈاکٹر امراؤ سنگھ سول سرجن، جنھوں نے اِسی سال پنشن لی ہے، باہر سے مہمان آئے آئے ہیں۔ کملا اور لیلا کے لئے باپ کے برابر ہیں۔ دونوں اُن کو "باپو" کہتی ہیں۔ ان سے بے تکلف ہیں۔ ان سے ملنے آئی تھیں۔ وہ ابھی کہیں باہر چلے گئے۔ یہ منشی جی سے باتیں کرتی رہ گئیں۔ اتنے میں ساہو لال آپہنچے۔ لڑکیاں یکایک دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ لیکن بیٹھی رہیں۔ لیلا اب اپنی تقدیر پر اس قدر صابر و شاکر ہو گئی تھی کہ ساہو لال کے آنے سے اس کو کوئی خاص وحشت نہ ہوتی تھی کہ دوسروں کو محسوس ہو سکے۔

ساہو لال دیر تک بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں ڈاکٹر امراؤ سنگھ آگئے ان سے تعارف ہوا۔ آخر میں ساہو نے ہمت کر کے پھر منشی جی سے مودبانہ درخواست رخصت کی۔ اور یہ وجہ عجلت بیان کی کہ اس کے والد سیٹھ مایا داس کو رنگون میں کوئی نیا ٹھیکہ ملا ہے۔ اس کے کام کے لئے ساہو لال کو رنگون جانا پڑیگا معلوم نہیں اس میں چھ مہینے لگ جائیں سال بھر صرف ہو جائے۔ اس لئے وہ شادی کر کے دلہن کو ساتھ لیجانا

جاہتا ہے۔ یہ سن کر سب متفکر ہو گئے۔ لیلانے تو سر جھکا لیا تھا، اس پر جو گزر رہی تھی اس کو کون دیکھتا پوچھا لیکن کملانے کہا اتنی جلدی تیاری نہیں ہوسکتی۔ منشی جی نے کہا کہ وہاں سے واپسی میں دیکھا جائے گا۔ ساہو نے پھر اصرار کیا خوشامد کی تو ڈاکٹر صاحب نے منشی جی سے پوچھا۔ آپ کو کوئی اور تامل ہے۔ انھوں نے کہا کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب نے کہا تو بظاہر کوئی عذر باقی نہیں ہے اس کے علاوہ رنگون میں میرے بھائی پریکٹس کرتے ہیں۔ گھر بنا ہوا ہے، لیلا ان سے اور ان کے گھر والوں سے خوب واقف ہے، اس کی دلبستگی رہے گی میں بھی اپنی پرائیویٹ پریکٹس کے لئے وہیں جانے کی سوچ رہا ہوں۔ غرض اس کہا سنی کے بعد طے ہو گیا کہ ایک مہینہ کے اندر لیلا کو رخصت کر دیا جائیگا ساہولال تو ایک ہفتہ کے اندر چاہتا تھا لیکن یہ بات کیونکر کہتا اور کوئی کیوں مانتا۔

ساہو رخصت ہو کر باہر نکلا تو دروازے پر فتح نرائن باہر سے آتا ہوا ملا۔ فتح نرائن ساہولال کو مطلق پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن لیلا ساہولال کے ہاتھ بکنے کو تیار تھی تو فتح نرائن کو ساہولال کے خلاف اظہار جذبات کا کیا موقع تھا۔ دونوں میں صرف آداب و بندگی کی رسم ادا ہوئی کہ اتنے میں ساہولال کو سامنے سے پوسٹ مین آتا ہوا نظر آیا۔ فتح نرائن نے ڈاکیہ کو نہ دیکھا تھا۔ فتح نرائن مکان کے اندر داخل ہوا اور ساہولال نے جلدی سے بڑھ کر ڈاکیہ سے ڈاک کو دریافت کیا۔ اس نے دو خط ساہو کے گھر کے دیئے، ساہو نے پوچھا منشی جی کا کوئی خط ہے اس نے ایک لفافہ نکالا۔ ساہو نے یہ کہہ کر کہ میں دیدوں گا جلدی سے لے لیا۔ پتہ پر نظر پڑتے ہی ساہو کا منہ فق ہو گیا۔ اس لفافے کو اپنے خطوں کے نیچے کر لیا اور اپنے گھر کی طرف چلدیا۔ ابھی چند قدم چلا تھا کہ اتفاق سے فتح نرائن اندر سے نکل آیا اس کو دیکھتے ہی پوسٹ مین نے کہا کہ منشی صاحب کا ایک لفافہ سیٹھ جی کو دے دیا ہے فتح نرائن نے یہ سن کر ساہولال کو آواز دی۔ آواز سنتے ہی ساہو کے چھکے چھوٹ گئے۔ لیکن فوراً پلٹا اور کہا کہ میں ابھی واپس آنے والا تھا۔ خود آکر دیدیتا۔ کسی کمپنی کا خط معلوم ہوتا ہے، اشتہار وغیرہ ہوں گے۔ ردی میں ڈال دینا۔ فتح نرائن نے لفافہ جیب میں ڈال لیا اور گھر میں چلا گیا۔ وہاں جا کر بھول گیا۔ اپنے کاموں میں لگ گیا۔ رات کو کھانے کے بعد یاد آیا۔ اس وقت منشی جی اپنے کمرے میں تنہا تھے۔ خط دے کر چلا آیا۔ اور بہنوں کے

پاس آ بیٹھا۔ ڈاکٹر صاحب باہر کی بیٹھک میں حقہ پی رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں کسی چیز کے زور سے گرنے کی آواز آئی۔ بیلا نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا "کیا چیز گری؟" فتح نرائن بولا "ہری نے کچھ پھینک دیا ہوگا" لیکن بیلا سے نہ رہا گیا دوڑی ہوئی باپ کے کمرے میں گئی اور وہاں سے اس کی چیخ آئی کہ کملا، چاچا کو کیا ہوگیا"!

اس آواز پر سب دوڑ پڑے۔ دیکھا کہ منشی جی فرش پر بیہوش پڑے ہیں۔ کملا نے جلدی سے دل پر ہاتھ رکھا۔ حرکت محسوس ہوئی۔ فتح نرائن نے دوڑ کر ڈاکٹر صاحب کو اطلاع کی۔ اُنھوں نے آکر دیکھا۔ اُٹھا کر پلنگ پر لٹایا۔ طبّی معائنہ کے بعد کہا کہ دل نہایت کمزور ہے۔ دورہ بہت سخت ہے لیکن نااُمیدی کی کچھ بات نہیں۔ تم لوگ اطمینان رکھو۔ لیکن اطمینان کہاں، ساری رات عجب پریشانی میں گزری۔ ڈاکٹر نے ہر چند کہا تم سب سو رہو، میں بیٹھا رہوں گا۔ لیکن ایک بھی پٹی کے پاس سے نہ ہلا۔ آخر تڑکے میں کچھ ہوش کے آثار پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر نے خوش ہوکر کہا "بس اب خطرہ جاتا رہا، شکر ہے، میں اس تبدیلی کے انتظار میں تھا۔ اب میں ایسی دوا دیتا ہوں کہ یہ راحت کی نیند سوتے رہیں گے۔"

۱۳

صبح کو ڈاکٹر امراؤ سنگھ منشی جی کے کمرے میں بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا خط تھا کہ فتح نرائن اور لڑکیاں داخل ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اشارے سے بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا اور بولے۔

ڈاکٹر: منشی صاحب بالکل اچھے ہیں۔ صرف کمزوری باقی ہے۔ ابھی چند روز اُٹھنا، چلنا پھرنا مشکل ہی طاقت آجائے تو تبدیل آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ میں اس کا انتظام کردوں گا۔ اب سنو، رات فوری تدبیر کے بعد مجھے سب سے پہلے یہ جستجو تھی کہ اس دورہ کا سبب قریب کیا ہے۔ میز پر یہ خط کھلا ہوا ملا۔

فتح نرائن: کل ایک خط کسی کمپنی کا آیا تھا۔ میں دن میں چاچا کو دینا بھول گیا۔ رات میں کھانے کے بعد دیا تھا۔

ڈاکٹر:۔ یہ وہی خط ہوگا، اب مسئلہ ایک حد تک حل ہوگیا۔ میں نے یہی خیال کیا تھا بظاہر اس خط کے علاوہ کوئی اور فوری موثر نہ تھا۔ میرے قیاسات یہ ہیں کہ منشی جی نے اس شوگر مل کے حصے خریدے ہوں گے، اور کمپنی کے فیل ہو جانے کی اطلاع اس سے پہلے آئی ہوگی۔ اور غالباً منشی جی کا تمام یا اکثر سرمایہ ضائع ہوگیا ہوگا، اب کمپنی کی طرف سے یہ اطلاع آئی ہے کہ "جس چوری اور غبن کے سبب سے کمپنی کے دوالیہ ہو جانے کا اندیشہ مشتہر کیا گیا تھا، خوش قسمتی سے وہ چور اور دغا باز لوگ وقت پر گرفتار ہوگئے اور تمام روپیہ بجنسہٖ وصول ہوگیا۔ چنانچہ کمپنی اپنی اصلی رفتار پر آگئی، اور اب آپ کے حصوں کی قیمت روز افزوں ترقی پر ہے۔" اس میں شک نہیں کہ مایوسی کے بعد یکایک ایسی خوشخبری دل و دماغ پر فوری اثر کر سکتی ہے، لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ ایسا اثر سب سے پہلے اُس مایوسی اور تباہی پر ہونا چاہیئے تھا۔ یقیناً وہ اثر کسی سبب سے سخت نہ ہونے پایا۔ وہ سبب یا تو یہ ہو کہ اس سے پہلے یا اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی خوشی منشی جی کو حاصل ہوئی ہو۔ یا یہ کہ نقصان کے ساتھ ہی اس کی تلافی ہوگئی ہو۔ لیکن اس حالت میں اِس خط کی اطلاع کا اثر اس قدر تیز و قوی نہ ہونا چاہیے۔ اِس لئے اِن حالات کے ساتھ کچھ اور اسباب بھی ہونے چاہئیں جو میرے علم میں نہیں اور قیاس سے باہر ہیں۔ دوسرے مجھے اس کا سخت تعجب ہے کہ منشی جی کمپنی اور حصوں کے جھگڑے میں پھنس کیونکر گئے۔ وہ اِن باتوں سے کوسوں دور تھے۔ اُنھوں نے تو کبھی جان کا بیمہ بھی نہ کرایا۔ پھر یہ کیا بات ہوئی؟

ڈاکٹر صاحب کی تقریر ختم ہوئی تو تینوں سُننے والے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ڈاکٹر: کیا تم لوگ یہ سوچ رہے ہو کہ مجھے گھر کے بھید میں شریک کرنا چاہیے یا نہیں۔

فتح نرائن (جلدی سے) جی نہیں، بھلا آپ سے کیا بات چھپی ہے۔ آپ کوئی غیر ہیں!

ڈاکٹر:۔ تو بیان کرو۔

فتح نرائن:۔ کملا مجھ سے اچھا بیان کریں گی

ڈاکٹر:۔ اچھا مجھے ایک سوال اور کر لینے دو۔ معاملہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آگیا ہے لیکن سب کڑیاں

مسلسل نہیں ہوئیں۔ یہ بتاؤ کہ سیٹھ ساہو لال سے منشی جی کا تعلق اور راہ و رسم کب سے اور کیونکر ہوئی؟ وہ اس قسم کے لوگوں سے ملنے کے آدمی نہیں ہیں۔ گوشہ نشین علمی آدمی ہیں۔

کملا:- میں سب باتیں بیان کئے دیتی ہوں۔ ان میں آپ کے اس سوال کا جواب بھی آجائے گا۔

یہ کہہ کر کملا نے وہ منظر و مکالمہ جو منشی جی اور ساہو لال کے درمیان پیش آیا تھا اور جس کو کملا اور لیلا نے دیکھا تھا بیان کر دیا۔ اور اسکول کے متعلق ساہو لال کی امداد کا حال بھی بیان کر دیا۔ اس کے بعد بولی۔

کملا:- معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے ساہو لال چاچا جی سے لیلا کے لئے کہہ چکے تھے اور چاچا جی نیم راضی ہو گئے تھے

ڈاکٹر:- یہ بتا سکتی ہو کہ کمپنی کے حصے خریدنے سے پہلے یا بعد؟ ضرور ہے کہ بعد کو کہا ہو یا ساتھ ساتھ۔

کملا:- جی ہاں۔ بہت پہلے کہا ہوتا تو چاچا جی مجھ سے ضرور ذکر کرتے۔ میں یہاں نہ تھی تو مجھے کلکتہ کو لکھتے لیکن باپو جی، ساہو لال جی کا بھی اتنا ہی نقصان ہوا تھا جتنا چاچا جی کا۔

ڈاکٹر:- بیشک بیشک، (کچھ سوچ کر) منشی جی نے تو یہ رشتہ تم سب کے پسند کرنے کے بعد منظور کیا ہوگا؟

کملا:- جی ہاں۔

ڈاکٹر:- (پھر کچھ غور کرنے کے بعد) ابھی گتھی نہیں سلجھی۔ تمہارے باپ کمزور دل کے ہمیشہ سے ہیں۔ لیکن یہ دورہ ابھی برسوں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی عام صحت کچھ ایسی خراب نہیں ہے۔ ان حالات میں جو تم نے بیان کئے کمپنی کے خط کا ایسا اثر نہیں ہو سکتا۔ منشی جی کے دل پر کوئی اور فکر و غم ضرور ہوگا۔

کملا:- (بہن سے) لیلا، ناشتہ کو بڑی دیر ہو گئی، باپو جی نے صبح سے چائے تک نہیں پی۔ ذرا تم دیکھنا، تیار ہوئی یا نہیں۔

ڈاکٹر:- (لیلا کے باہر جاتے ہی آہستہ سے) کملا، لیلا اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔

یہ فقرہ سن کر فتح نرائن اچھل پڑا۔ لیکن کملا بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

کملا:- (ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر) میں نے بھی یہی بات کہنے کے لئے لیلا کو اٹھایا تھا۔

ڈاکٹر:۔ اس گفتگو کے درمیان میں مجھے یہ شبہہ پیدا ہو چلا تھا۔ اب جو تم نے لیلا کو اُٹھایا تو معاً وہ شبہہ یقین سے بدل گیا۔ تمہارے باپ کو اس بات کا علم ہو گا؟

کملا:۔ جی، ان کو معلوم ہے۔

ڈاکٹر:۔ بس اب ساری گرہیں کھل گئیں۔ سب حال آئینہ ہو گیا۔ منشی جی نے اپنی مالی پریشانی اور ساہو لال کی بروقت ہمدردی و ایثار اور اپنے جذبۂ احسان شناسی سے متاثر ہو کر لیلا کی مرضی کے خلاف یہ رشتہ منظور کر لیا تھا اب کمپنی کا خط دیکھتے ہی مالی منفعت کی خوشی سے زیادہ ان کے دل پر یہ چوٹ لگی کہ لیلا مفت میں قربان ہوئی، ناحق ماری گئی۔ چونکہ پرانی وضع کے آدمی ہیں۔ ایک بار زبان دے کر پھیر نہیں سکتے۔ اس لئے اپنے آپکو بالکل بے بس پایا۔ یہ صدمہ بیشک اس دورہ کا سبب ہو سکتا ہے۔ اب تم مفصل حال بیان کرو۔

کملا نے فتح نرائن کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر:۔ معلوم ہوتا ہے فتح نرائن اس راز سے بیخبر ہیں۔ جب ہی چونکے تھے۔

کملا:۔ میں خبر کرنا بھی نہ چاہتی تھی۔ ان کا کچھ اعتبار نہیں۔

ڈاکٹر:۔ (مسکرا کر فتح نرائن کی طرف دیکھ کر) بی۔ اسے پاس بچہ نہیں رہتا۔

کملا:۔ یہ تو بچوں کے باپ ہو کر بھی بچے ہی رہیں گے۔ طبیعت ہی کچھ ایسی لااُبالی پائی ہے۔

ڈاکٹر:۔ کیا کہتے ہو فتح نرائن۔

فتح نرائن:۔ کملا اپنے آپ کو بڑی بوڑھی سمجھتی ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتیں کہ ایک لااُبالی مزاج شخص بھی وقت و موقع کی ضرورت و اہمیت کو سمجھ سکتا ہے

ڈاکٹر:۔ بالکل درست ہے۔ اب تو اطمینان ہو گیا کملا۔

کملا نے اب وہ منظر بیان کر دیا جو کمپنی کے دوالیہ ہونے کا تار آنے کے بعد منشی جی اور کملا اور لیلا کے درمیان گزرا تھا۔

فتح نرائن: (غصے سے پیچ و تاب کھا کر) لیلا کنور سے محبت کرتی ہے اور تم اس کو ساہو لال کے ہاتھ بیچ رہی ہو!

کملا: (ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر) میں نے کیا کہا تھا!

ڈاکٹر: ٹھہرو فتح نرائن۔ تیزی کا موقع نہیں۔ ضبط سے کام لو۔ تم نے اس معاملے کی اہمیت اور دشواری کو نہیں سمجھا۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب کوئی معجزہ ہی ہو جائے تو پلٹ آئے۔ تمہارے باپ ایک بار "ہاں" کر کے "نا" نہ کریں گے۔

کملا: اور خود لیلا کب پلٹے گی۔ اس نے باپ کی آبرو بچانے کے لئے اپنی قربانی کی ہے۔ کیا اب بات بدلنے میں عزت و آبرو کا سوال نہیں ہے۔ اب تو دونوں کے لئے ہے، بلکہ ہم سب کے۔ سارے کنبے کیلئے۔

ڈاکٹر: خیر دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔ بالفعل تسلی کے لئے یہ بات کافی ہے کہ منشی جی کو کہیں سمندر کے کنارے رہ کر کئی مہینے آرام و سکون حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ابھی ساہو لال کی فرمائش پوری نہیں ہوسکتی اس عرصہ میں ساہو لال رنگون چلے جائیں گے۔

۱۴

گذشتہ واقعات سے چند روز بعد ایک دن کنور محبت سنگھ رات کے وقت کلب سے پیدل واپس آرہے تھے۔ خیالات میں ایسے محو ہوئے کہ خبر نہ رہی کدھر جا رہے ہیں پھر چونکے اور ادھر ادھر دیکھا تو راستہ سمجھ میں نہ آیا۔ اندھیری رات تھی۔ کوئی راہ گیر سڑک پر نہ تھا۔ سوچ رہے تھے کہ سڑک کی دوسری طرف سے ایک شخص آتا ہوا نظر آیا۔ ارادہ کیا کہ سڑک کو پار کر کے اس سے پوچھیں، لیکن اس کی کاواک رفتار سے معلوم ہوا کہ نشے میں ہے۔ وہ خود سڑک کی اسی جانب آرہا تھا۔ ابھی بیچ سڑک پر پہنچا تھا کہ ایک تانگہ پوری رفتار سے آتا نظر آیا۔ ادھر سے کنور نے اُدھر سے تانگے والے نے زور زور سے چیخنا شروع کیا لیکن وہ

شخص سڑک کے بیچ میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کنور خطرے کو سمجھ کر دوڑے اور اُس کو پکڑ کر زور سے کھینچا، لیکن تانگہ الکدم نہ رُک سکا اور دونوں زد میں آ گئے۔ کنور اُٹھ کر کھڑے ہوتے تو زخمی تھے، لیکن وہ شخص اُٹھ بھی نہ سکا۔ کنور اور تانگے والے نے دیکھا تو وہ بیہوش تھا۔

تانگے والا:۔ (کنور سے) حضور میری اس میں کیا خطا تھی۔ میں نے بہت روکا۔ لیکن تانگہ ڈھال سے اُتر رہا تھا۔ اور یہ سڑک کے بیچ میں جم کر رہ گیا۔ حضور دوڑ کر نہ کھینچ لیتے تو تانگہ اس کے اوپر سے گزر جاتا۔ سرکار کے تو چوٹ نہیں آئی؟

کنور:۔ نہیں۔ لیکن اس کو تو دیکھو۔ بڑی چوٹ آئی ہوگی؟

دونوں نے دیکھا تو اُس کے چہرے پر خون بہہ رہا تھا اور وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔

تانگے والا:۔ حضور یہ نشے میں تھا۔

کنور:۔ ہاں بیچارہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھا۔ اچھا اب اس کو شفاخانہ لے چلو۔

دونوں نے احتیاط سے اُٹھا کر تانگے میں لٹایا۔ کنور اس کو سنبھالے رہے۔ بڑے شفاخانہ میں پہنچے۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا، "آپ بہت بُرا کیس لائے ہیں، سر میں چوٹ لگی ہے۔ بازو کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اور کثرت شراب نوشی کے سبب سے تمام اعضائے رئیسہ کمزور ہیں۔ صحت نہایت خراب ہے۔ مہربانی فرما کر آپ اپنا پتہ لکھوا دیجئے۔ تحقیقات کے سلسلے میں ضرورت ہوگی۔"

کنور نے اپنے نام کا کارڈ نکال کر دیا۔ ڈاکٹر پر نظر ڈالتے ہی آداب بجا لایا۔

کنور:۔ ڈاکٹر صاحب اِس کے علاج میں کسر اُٹھا نہ رکھی جائے۔ میں تمام صرفہ برداشت کروں گا۔

ڈاکٹر:۔ کنور صاحب، بہتر سے بہتر علاج جو ممکن ہے کیا جائے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ تمام معالجہ شفاخانہ کی طرف سے ہوگا۔ جناب کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

کنور دوسرے دن صبح کو شفاخانہ آئے تو معلوم ہوا کہ مریض پہلے سے اچھا ہے۔ ہوش میں ہے۔

کنور اُس کے بستر کے پاس گئے تو نرس نے مریض سے کہا، "ایک صاحب تمہیں دیکھنے آئے ہیں اُن کو پہچانتے ہو؟" مریض نے کنور کی طرف دیکھا اور ناگواری اور غصّے کے آثار اُس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔

مریض:۔ (نرس سے) تم نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ میں کسی بات کا اقرار کرنے والا نہیں۔ تم کو اس سے کیا میں ان کو جانتا ہوں یا نہیں جانتا۔

نرس:۔ بھائی غصّے نہ ہو۔

کنور:۔ (مریض سے) آج طبیعت کیسی ہے؟

مریض:۔ (سر ہلا کر) اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ تم سارے دن یہاں کھڑے رہو گے جب بھی مجھ سے کچھ معلوم نہ کر سکو گے۔ نہیں نہیں، میں بیوقوف نہیں ہوں۔

نرس:۔ (مریض کی نبض پر ہاتھ رکھ کر کنور سے) معلوم ہوتا ہے اس کا دماغ صحیح نہیں لیکن تعجب ہے، ابھی ذرا دیر پہلے بالکل ہوش و حواس کی باتیں کر رہا تھا۔ اور اس وقت بخار بھی بالکل نہیں ہے۔

کنور:۔ تعجب ہے۔ خیر میں اب جاتا ہوں، پھر آؤں گا۔

یہ کہہ کر کنور دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ کملا اور ریلا اندر داخل ہوئیں۔ پہلے کملا کی نظر کنور پر پڑی، ریلا پیچھے تھی۔ کملا نے اس کا پلو کھینچا۔ کنور اور ریلا کی نظریں اک لمحہ کے لئے ملیں اور جھک گئیں۔

کنور:۔ کملا دیوی آپ یہاں کہاں؟

کملا:۔ اور آپ؟

کنور:۔ میں اس مریض کو دیکھنے آیا تھا۔ رات میرے سامنے اس پر ایک حادثہ گزر گیا۔

تینوں مریض کے پلنگ کے پاس کھڑے تھے۔ اور وہ تینوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

کملا:۔ کیا واقعہ ہوا؟

کنور:۔ تانگے سے ٹکرا گیا۔

اتنے میں وہی رات والا ڈاکٹر آ گیا۔

ڈاکٹر:۔ آداب عرض ہے کنور صاحب۔ آج تو آپ نے ہمارے مریض کو اچھا پایا ہوگا،

کنور:۔ جی ہاں، مگر کچھ بدحواس ہے۔

ڈاکٹر:۔ مطلق نہیں۔ شروع میں تو بدحواس رہا، لیکن اب ہوش و حواس بالکل درست ہیں۔

کملا:۔ ڈاکٹر صاحب، کیا حادثہ پیش آیا۔

ڈاکٹر:۔ کنور صاحب نے تو کچھ بیان نہیں کیا۔ تانگے والے کا بیان ہے کہ یہ شخص رات کو سڑک کی ایک طرف سے دوسری طرف جا رہا تھا اور ڈھال پر سے تانگہ پوری رفتار سے آ رہا تھا۔ کنور صاحب خطرے کو محسوس کر کے دوڑے اور اُس کو زور سے پکڑ کر گھسیٹا لیکن تانگہ قریب آ چکا تھا اس کی ٹکر کا نتیجہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ تانگے والا کہتا تھا کہ کنور صاحب اپنی جان پر کھیل کر اس کو نہ بچاتے تو تانگہ اوپر سے گزر جاتا۔

یہ باتیں آہستہ آہستہ ہو رہی تھیں، لیکن مریض بھی سُن رہا تھا، یہ واقعہ سُنتے ہی اس نے نحیف و کمزور آواز سے ایک چیخ ماری۔ اور پھر بولا۔

مریض:۔ یہ کیا قصہ ہے، کیا کہہ رہے ہو، کیا اُنھوں نے یہ کام کیا؟ انھوں نے مجھے بچایا؟

ڈاکٹر:۔ بیشک۔ دیکھو کنور صاحب کی پیشانی پر زخم موجود ہے۔ یہ ثبوت ہے۔

مریض:۔ (پیچ و تاب کھا کر) یہ جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ۔ مجھ سے قبلوانے کی ترکیب ہے یہی بات ہے، یہی بات ہے۔

ڈاکٹر:۔ یہ بالکل سچ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صرف کنور صاحب کی ہمت اور ہمدردی کی بدولت تم اس وقت زندہ ہو۔ ان کا شکریہ ادا کرو۔

لیکن سب کے سب یہ دیکھ حیران رہ گئے کہ اس شخص نے شکریہ ادا کرنے کی جگہ ہاتھ سے اپنا مُنھ چھپا لیا اور ایک کراہ کے ساتھ اُن کی طرف سے مُنھ پھیر لیا۔

کنور:۔ غریب بیحد کمزور ہے۔ خدا جلدی صحت دے۔ آیئے کملا دیوی یہاں سے چلے چلیں (دروازے پر پہنچ کر) ڈاکٹر صاحب اس کا کیا نام ہے۔

ڈاکٹر:۔ گھاسی رام، آپ نے پہلے کبھی اس کا نام سنا ہے؟ اس کو دیکھا ہے؟

کنور:۔ کبھی نہیں۔

وارڈ سے باہر نکل کر کنور نے کملا سے منشی جی کی خیریت دریافت کی۔

کملا:۔ خدا کا شکر ہے بہت اچھے ہیں۔ پرسوں تو آپ دیکھنے آئے ہی تھے۔ جب سے بھی اب اچھے ہیں

کنور:۔ اس مریض کے قصے میں یہ بات تو رہ ہی گئی کہ آپ شفا خانہ کیوں آئی تھیں۔

کملا:۔ چاچا کو دیکھنے کے لئے ہماری ایک رشتے کی دادی آئی ہیں۔ ان کی کوئی پڑوسن بھولی یہاں پہلے سے زیر علاج ہیں۔ آپریشن ہوا ہے۔ ان کی خیریت پوچھنے کے لئے دادی نے ہمیں بھیجا ہے۔ فتح نرائن سے کہا تھا، اُس نے کہا میں زنانہ وارڈ میں کیونکر جا سکتا ہوں۔ ان میں سے کسی کو بھیجو۔ جاکر دیکھ آئے گی۔ اب ہم زنانہ وارڈ سے نکل کر چلے تو لیلا نے (اس لفظ پر لیلا نے کملا کا پلو کھینچا لیکن یا تو کملا نے اشارہ نہ سمجھا یا اشارہ ماننے کا وقت نہ رہا تھا) لیلا نے کہا ادھر دیکھتے چلیں کونسا وارڈ ہے۔ قریب آئے تو آپ کی آواز آئی تعجب ہوا، سامنے آئے تو آپ نظر آ گئے۔

اس سے میسرے دن کملا اور لیلا کی مہمان دادی نے لڑکیوں سے پھر شفا خانے جانے کو کہا، کملا نے لیلا سے کہا "آج تم اکیلی ہو آؤ۔ میں بھی جاؤں گی تو یہاں کے کام سب رہ جائیں گے بڑی دیر لگ جاتی ہے۔ وہ مریضہ جلدی آنے نہیں دیتیں، اُن کی خاطر سے بیٹھنا پڑتا ہے۔" پھر فتح نرائن کی طرف دیکھ کر کہا، "چاہے نتی کو ساتھ لیتی جاؤ، یہ باہر ٹھہرے رہیں گے۔"

فتح نرائن :- میری "دلیل" کیوں بولی گئی - یہ تو اندر جاکر گپّیں ہانکنے لگیں گی -
لیلا :- (جلدی سے) تم باہر تانگہ ہانکنا -
فتح نرائن :- پھر ٹاپتی رہ جاؤ گی - میں تانگہ لے کر چلا آؤں گا -
کملا :- (گھبراکر) پھر لفظی ہیر پھیر شروع ہو گیا - بس ختم کرو - لیلا تم تیاری کرو - فتّی جلدی سے تانگہ منگا لو -

لیلا تانگے میں شفا خانہ پہنچی - مریضہ سے ملی - دیر تک بیٹھی رہی - آخر رخصت ہو کر باہر نکلی تو خیال آیا اس مریض کو بھی دیکھتی چلوں - اس دن اس نے عجیب حرکت کی - آج تو اچھا ہوگا - یہ سوچتی ہوئی دوسرے وارڈ کی طرف چلی - لیکن اندر جاتے ہوئے جھجکی - مردانہ وارڈ میں بے ضرورت جانا ٹھیک نہیں - دروازہ پر پہنچی تو سامنے نرس کھڑی تھی، اُس نے دیکھ کر کہا تشریف لائیے - اپنی ہم جنس کو دیکھ کر ہمت ہوئی، اندر چلی گئی - لیلا کو دیکھتے ہی مریض گھاسی رام کے چہرے پر رونق آگئی، جیسے اُس کا منتظر و مشتاق تھا - لیلا اُس کے قریب جاکر کھڑی ہو گئی، اور نرس سے اُس کا حال پوچھا - نرس نے بیان کیا - گھاسی رام برابر لیلا کو غور سے دیکھتا رہا، پھر بولا -

گھاسی رام :- آپ کا کیا نام ہے ؟
لیلا :- میرا ؟ میرا نام لیلا ہے -
گھاسی رام :- لیلا بائی بیٹھ جائیے - (لیلا کے بیٹھنے پر) آپ اُس دن کنور محبت سنگھ کے ساتھ آئی تھیں -
لیلا :- نہیں، میں اپنی بہن کے ساتھ آئی تھی - کنور صاحب تو یہاں اتفاق سے مل گئے تھے -
گھاسی رام :- آپ سے ان سے کیا رشتہ ہے ؟
لیلا :- (چہرے کو پُر سکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے) کچھ نہیں، وہ میرے بھائی کے دوست ہیں - ان کے ساتھ کے پڑھے ہوئے ہیں (بات کو بدلتے ہوئے) اب تو تم پہلے سے بہت اچھے معلوم ہوتے ہو، اُمید ہے کہ جلد تندرست ہو جاؤ گے -
گھاسی رام :- میں اب تندرست نہیں ہو سکتا - یہ چوٹ تو اچھی ہو جائے گی - لیکن اب زندگی ختم

ہی ہے۔ مجھے کچھ زندہ رہنے کی خواہش بھی نہیں ہے۔ کنور جی نے بے کار مجھے مرنے سے بچایا، اُن کو معلوم ہوتا جو مجھے معلوم ہے تو اپنی جان پر کھیل کر مجھے نہ بچاتے۔

لیلا:۔ (اک ذرا جوش کے ساتھ) تم کنور صاحب کو جانتے نہیں۔ انسان تو انسان ہے وہ ایک کُتّے کے لئے اپنی جان لڑا دیتے۔ (اپنے جوش کا احساس کر کے اور دل میں نادم ہو کر) اب میں جاتی ہوں۔

گھاسی رام:۔ (لیلا کو غور سے دیکھ کر) آپ کنور جی کی بڑی طرفدار ہیں۔

لیلا اپنی حالت اضطراب چھپانے کے لئے کھڑی ہو گئی، اور دروازہ کی طرف چلی۔ نرس اخلاقاً اس کے ساتھ آئی۔ باہر جا کر دس روپیہ کا نوٹ نرس کو دیا کہ جب یہ مریض صحت یاب ہو کر شفا خانے سے جائے تو اُسکو دیدینا۔

(۱۶)

لیلا کی شادی منشی اقبال نرائن کی ناگہانی علالت کے سبب سے ملتوی ہو گئی، لیکن ساہو لال نے سارے شہر میں شہرت دیدی۔ اسی طرح اپنی بہن اندرا کی نسبت کنور محبت سنگھ کے ساتھ مشہور کر دی۔ شہر کے اعلیٰ طبقے میں اکثر ان تعلقات کا ذکر اور ان پر رائے زنی ہونے لگی۔ منشی جی کے گھر شادی کی تیاری ہوتے ہوتے رُک گئی، لیکن سیٹھ مایا داس نے بیٹے بیٹی دونوں کی شادیوں کا سامان مکمل کر لیا۔ راجہ عزت رائے اپنے راجکمار کی شادی اپنی شان کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ اس کوشش میں وہ قرض سے اور زیادہ زیر بار ہو گئے۔ سیٹھ اور ساہو رنگون جانے والے تھے اس لئے شادی کی کوئی تاریخ مقرر نہ ہو سکی۔

منشی اقبال نرائن بظاہر بالکل تندرست ہو گئے، لیکن ضعف میں ایسی کمی نہ ہوئی جیسی رفع مرض کے بعد ہونی چاہئے۔ ڈاکٹر امراؤ سنگھ یہ حالت دیکھ کر منشی جی کو بمبئی لے گئے۔ لیلا ساتھ جانا چاہتی تھی۔ لیکن منشی جی نے کہا کملا کے شوہر کے کئی خط اُس کو بلانے کے لئے آچکے ہیں۔ اب تم میرے ساتھ چلی جاؤ گی تو تمہاری دادی اکیلی کیوں رہیں گی۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اُن کا رہنا ہمیں ناگوار ہے۔ وہ برسوں میں آئی ہیں اور سارے خاندان

میں وہی سب سے بڑی بوڑھی ہیں۔ میں نے انھیں کے خیال سے کملا کو نہیں جانے دیا۔ غرض منشی جی تنہا چلے گئے۔

منشی جی کے جانے کے تین ہفتے بعد ایک دن کملا، لیلا، فتح نرائن تینوں دادی کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ڈاک آئی۔ اخبارات کے علاوہ دو لفافے تھے۔ فتح نرائن نے ایک لیلا کو دیدیا۔ دوسرا کھول کر پڑھنے لگا۔

فتح نرائن:۔ (خط پڑھ کر) لو لیلا دیوی اب تمہارے مزے ہیں۔

دونوں لڑکیاں چونک پڑیں۔

کملا:۔ فتی یکایک ایسی بات نہ کہا کرو جس سے آدمی ڈر جائے۔

فتح نرائن:۔ ایسے وہمیوں اور بزدلوں سے خدا بچائے۔ یہ ڈرنے کی بات تھی یا خوش ہونے کی؟

لیلا:۔ کچھ کہو گے بھی؟

فتح نرائن:۔ چاچا کے نام رائے بہادر خوشحال سنگھ کا خط آیا ہے۔ اُن کو "سر" کا خطاب ملا ہے۔ اس خوشی میں دعوت ہے۔ اس لفافے میں ایک چھپا ہوا دعوت نامہ ہے اور ایک رائے بہادر صاحب کا دستی خط ہے اس میں اپنی بیوی کی طرف سے تم دونوں کو اور بیٹی کی طرف سے لیلا کو خاص طور پر بلایا ہے۔ لیلا اُس کے ساتھ کی پڑھی ہوئی ہے۔ اور تاکید کے ساتھ لکھا ہے کہ ہم سب کو ورنہ لڑکیوں کو ضرور دو روز رہنا ہوگا۔ لیلا کی ہمجولی کہتی ہے کہ میں لیلا کو نہ جانے دوں گی۔ اور یہ دعوت اور جلسہ اُن کے شہر کے مکان میں نہیں بلکہ گاؤں کی نئی کوٹھی میں ہوگا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ میں اپنے لاگے لکچر چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ گاؤں یہاں رکھا ہے؟ چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہوں کہ تیسرے پہر کے جلسے میں شریک ہوں اور شام تک واپس آجاؤں۔ کملا دادی کو چھوڑ کر نہیں جاسکتیں، بس اک تم رہ گئیں لیلا دیوی، جاؤ اور چین کرو۔

لیلا:۔ میرے پاس یہ خط ان کی لڑکی شانتی کا آیا ہے۔ اس نے الگ بلایا ہے۔

کملا:۔ بس ٹھیک ہے۔ جانا ہی چاہیے۔ فتی تم کو ایک وقت جاکر ضرور شریک ہونا چاہیئے۔ چاچا نہیں ہیں۔ ان کے رائے بہادر سے خاص مراسم ہیں۔

پانچویں روز فتح نرائن اور لیلا رائے بہادر سر خوشحال سنگھ کے گاؤں خوشحال نگر پہنچے۔ ان کی کوٹھی اور باغ خوشحال وِلا کے نام سے مشہور ہیں۔ جنگل کے وسط میں باغ، پارک، لان، تالاب، کوٹھی، سب کچھ ایسے حسنِ سلیقہ اور مذاقِ سلیم کے ساتھ تعمیر کئے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج تو واقعی جنگل میں منگل ہی ہو رہا تھا۔ نہایت شاندار گارڈن پارٹی کا اہتمام تھا۔ صدہا مہمان مدعو تھے۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔

شانتی لیلا کو دیکھتے ہی لپٹ گئی اور اپنے ساتھ لے گئی۔ باغ اور کوٹھی کی سیر کرائی۔ آدھ گھنٹہ میں پارٹی شروع ہو گئی۔ خوشنما پارک میں ایک وسیع حلقے کے اندر جا بجا میزیں کرسیاں لگی ہوئی اور کھانوں سے لدی ہوئی تھیں شانتی لیلا کو ساتھ لئے ہوئے ایک طرف سے داخل ہوئی اور مجمع کے درمیان سے گزرتی ہوئی، ایک جگہ کھڑی ہو گئی اور سارے مجمع پر نظر دوڑانے لگی۔ لیلا نے کہا۔ کھڑی کیا کر رہی ہو۔ جہاں جگہ خالی ہو بیٹھ جاؤ۔ شانتی نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر یکایک لیلا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اور جلدی جلدی دو چار میزوں کے پاس سے گزر کر ایک میز کے قریب پہنچی اور جلدی سے ایک کرسی پر بیٹھ کر کہا، "آداب عرض ہے کنور صاحب" اور لیلا کا ہاتھ کھینچ کر دوسری کرسی پر بٹھا دیا۔

یہ حرکت شانتی نے ایسی پھرتی اور صفائی سے کی کہ لیلا کو اس لمحہ سے پہلے شانتی کی شرارت کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ کنور پہلے سے اس کرسی پر نہ بیٹھے تھے، شانتی نے دور سے ان کو اِدھر آتے دیکھ لیا اور لیلا کے دیکھنے سے پہلے اس کو کھینچ کر لے آئی اور کنور کے بیٹھتے بیٹھتے اُس کو بھی لا بٹھایا لیلا کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی، چہرے پر شرم و حجاب کی ہلکی سی سُرخی آ گئی۔ سر میں چکر سا محسوس ہوا، لیکن فوراً سنبھل گئی۔ اور میز پر رکھے ہوئے گلدستے پر نظر جما دی۔ اُدھر کنور محبت سنگھ اک لمحہ کے لئے مبہوت سے ہو گئے۔ لیکن میز پر ہاتھ جما کر فوراً جواب دیا۔

کنور:- آداب عرض شانتی بائی۔ آپ کو بہت دنوں میں دیکھا، مبارک ہو یہ اعزاز اور یہ شاندار مہمان نوازی

شانتی :۔ شکریہ عرض کرتی ہوں ۔ آپ کو بھی مبارک ہو ۔

کنور :۔ لیلا دیوی کو کہاں سے پکڑ لائیں ، یہ تو کہیں آتی جاتی نہیں ہیں ۔

شانتی :۔ (لیلا کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے) آپ کو لیلا کے آنے جانے کی کیا خبر ؟ یہاں نہ آتیں تو مجھ سے ان سے عمر بھر کے لئے لڑائی ہو جاتی ۔

کنور :۔ کملا دیوی نہیں آئیں ؟ ۔ فتح نرائن تو آئے ہیں ، ملے تھے ۔

شانتی :۔ (لیلا کا شانہ ہلا کر) جواب دو لیلا ، تم سے سوال ہے ۔

لیلا :۔ (شانتی کی طرف دیکھ کر) مجھ سے نہیں ہے ۔

شانتی :۔ تمہارے متعلق تو ہے ۔ کنور صاحب کملا بہن گھر گرستی والی ہیں ۔ بچے کو ساتھ لانا بھی مشکل تھا چھوڑ کر آنا بھی دشوار ۔

کنور :۔ (گھبرا کر ، جلدی سے) شانتی بائی ! خدا کے لئے !

لیلا بھی پیچ و تاب کھا کر غصے سے شانتی کو دیکھنے لگی ۔

شانتی :۔ (بیاختہ ہنس کر) کنور صاحب میں جھوٹ نہیں کہتی ۔ ان کی ایک رشتے کی دادی مہمان آئی ہیں اور وہ بہت بوڑھی ضعیف ہیں ۔ ان کے مارے کملا نہیں آئیں ۔ کہتے ہیں بچہ بوڑھا برابر ہوتا ہے ۔ پھر میں نے کیا جھوٹ کہا ۔

لیلا اور کنور دونوں ہنس پڑے ۔

کنور :۔ واہ شانتی بائی ، باتیں بنانا کوئی تم سے سیکھے ۔

شانتی :۔ لیلا سے کہئے یہ بھی سیکھ لیں ۔ دیکھئے اتنی دیر سے ایک بات بھی نہیں کی ۔ اور کچھ کھاتی بھی نہیں ۔ ایک آدھ دانہ انگور کا لیا ہوگا ۔ یہ مٹھائی اور کیک پیسٹری کس کام کے لئے ہیں (اِدھر اُدھر اور میزوں کی طرف دیکھ کر) اہا ۔ اندرا بائی ہیں ۔ آداب عرض ہے اندرا بائی ۔ (اٹھ کر قریب کی میز کی طرف اندرا کے پاس جاتے ہوئے)

معاف کیجئے میں نے دیکھا ہی نہیں۔ آپ کب آکر بیٹھ گئیں۔ مزاج اچھا ہے۔ آپ کے والد صاحب اور بھائی صاحب بھی آتے ہیں؟

اندرا:۔ (شانتی سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آداب عرض۔ مزاج شریف۔ میں تو دیر سے یہیں بیٹھی ہوں۔ آپ کی باتیں سن رہی تھی۔ کیسی مزے کی باتیں کرتی ہیں۔

شانتی:۔ (جلدی سے) تو آئیے، ہماری میز پر آجائیے، ایک کرسی خالی ہے۔ (اندرا کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے) کنور صاحب بھی بیٹھے ہیں۔

اندرا:۔ (جھینپ کر) میں یہیں سے سنتی رہوں گی۔ (اپنی ساتھی عورتوں کی طرف اشارہ کرکے) یہ کہیں گی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔

شانتی اپنی میز کی طرف لوٹی ہی تھی کہ اس کے باپ رائے بہادر صاحب ٹہلتے ہوئے آگئے۔ قریب کے لوگ دیکھ کر کھڑے ہونے لگے۔

رائے بہادر:۔ (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) تشریف رکھئے، تشریف رکھئے۔ میں تو دیکھتا پھرتا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو حاضر کردوں۔

شانتی:۔ (باپ سے) پاپا، کلکٹر صاحب گئے؟

رائے بہادر:۔ ابھی گئے ہیں۔ شام کی گاڑی سے باہر جا رہے ہیں۔ اس لئے ذرا جلدی چلے گئے۔

شانتی:۔ میں اس دن سے کلکٹر صاحب سے ڈرنے لگی ہوں۔

رائے بہادر:۔ (متحیر ہو کر) کس دن سے بٹیا؟

شانتی:۔ جس دن انھوں نے مجھے پیار کیا تھا۔

رائے بہادر:۔ (بیاختہ قہقہہ لگاکر) تو بڑی شوخ ہے شانتی۔ ارے بٹیا، وہ آج کی بات ہے؟ آٹھ برس ہوئے، جب کلکٹر صاحب یہاں سٹی مجسٹریٹ ہو کر آئے تھے۔ اس وقت تو چھ سات برس کا بچہ تھی۔

مجھے یاد آگیا۔ اس دن جب تو نے اِن کے بنگلے سے آتے ہوئے شکایت کی تھی اور بُرا مانا تھا۔ تو میں نے دوسرے وقت ان سے ذکر کیا تھا، وہ بہت ہنسے تھے۔

شام تک پارٹی خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اور مہمان رخصت ہوگئے۔ رائے بہادر صاحب اور اُن کی بیوی بیٹی نے چند خاص مہانوں کو رات کے قیام کے لئے روک لیا تھا۔ جن میں اور مردوں عورتوں کے علاوہ راجہ عزت رائے، کنور محبت سنگھ، لیلا، اندرا بھی تھیں، رات کو کھانے کے بعد کوٹھی کے وسیع ڈرائنگ روم میں بعض مہمان جمع تھے۔ ایک چھوٹی سی میز کے پاس لیلا اور شانتی بیٹھی البم کی سیر کر رہی تھیں۔ اس کے قریب کوچ پر اندرا اور ایک اور لڑکی میٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کمرے کے دوسرے سرے پر راجہ اور کنور ایک کوچ پر بیٹھے تھے۔ کنور کی نظر بار بار لیلا کی طرف اُٹھتی تھی، اگر صرف ایک لمحہ کے لئے۔ تھوڑی دیر میں کنور نے دیکھا کہ شانتی لیلا کے پاس سے اُٹھ کر باہر گئی اور ایک دو منٹ کے بعد آکر کوئی چیز لیلا کے سامنے البم کے اوپر رکھ دی۔ اور مُسکراتی ہوئی پھر باہر چلی گئی۔ کنور کو دور سے ایسا معلوم ہوا کہ تصویر کا فریم ہے۔ کنور راجہ سے باتیں کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ذرا سی دیر میں پھر جو کنور کی نظر ادھر اُٹھی تو دیکھا کہ لیلا میز پر کہنیاں ٹیکے، دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے اس فریم کو تک رہی ہے اور شانتی لیلا کی پشت کی طرف کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے۔ اُسی لمحے میں اندرا اپنے کوچ سے اُٹھ کر آہستہ سے کھڑی ہوئی، لیلا کی میز اور البم کو ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھتی ہوئی پشت کی کانس پر سے بُک آف نالج کی ایک جلد اُٹھا کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت لیلا اپنے خیالات سے چونکی اور آہستہ سے فریم کو البم کے نیچے رکھ کر کرسی پر لیٹ سی گئی۔ یہ دیکھ کر شانتی بھی دروازے سے غائب ہوگئی۔

لیلا کو کرسی پر گرتا دیکھ کر کنور یکایک کھڑے ہوگئے۔ یہ خاموش سین کیا تھا، لیلا کیا چیز دیکھ رہی تھی، دیکھتے دیکھتے کیوں کرسی پر گر پڑی۔ بے اختیار جی چاہا کہ لیلا کے پاس جا کر دیکھیں پوچھیں لیکن خلاف آداب سمجھا مجبور ہو کر

پھر بیٹھ گئے۔ راجہ نے شاید کچھ دیکھا سمجھا نہ تھا۔ کنور کو اُٹھتا دیکھ کر کہا۔

راجہ:۔ باہر جاتے ہو؟

کنور:۔ (بیٹھتے ہوئے) جی نہیں۔

راجہ:۔ (لیلا کی طرف دیکھ کر) یہ لڑکی کیسی بھولی، شرمیلی ہے۔ (اب لیلا لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھی) کچھ مغموم معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو منہ فق ہو رہا ہے۔

کنور:۔ یہ تو بڑی مصیبت زدہ ہے۔

راجہ:۔ (حیران ہوکر) ہیں! افسوس! افسوس!

کنور:۔ ایک شخص نے اس کو بڑا دھوکا دیا۔

راجہ:۔ (بے چین ہوکر) کیا؟ کیا؟

کنور:۔ پہلے اس کا دل لے لیا، پھر ایک مالدار لڑکی کے لئے اس کا دل توڑ دیا۔

راجہ:۔ (غصے سے سُرخ ہوکر) کمبخت! کمینہ!

کنور:۔ جی ہاں، اس شخص کو کسی مالدار عورت سے شادی کرنا ضروری تھا۔

راجہ:۔ تو صرف کمینہ ہی نہیں، گدھا بھی تھا۔ ساری دنیا کی دولت بھی اس لڑکی کے مقابلہ میں ہیچ ہے

کنور:۔ جی سچ ہے۔ بیشک احمق تھا۔ دنیا میں سب سے بڑا احمق۔

راجہ:۔ ہائے اس غریب کی تقدیر۔ اس کی آنکھوں میں تو دنیا اندھیر ہوگئی ہوگی۔ تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟ کون ہے؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

کنور کی خوش قسمتی سے اسی وقت رائے بہادر خوشحال سنگھ باہر سے آگئے اور کنور باپ کو جواب دینے سے پہلے کھڑے ہوگئے۔ راجہ بھی میزبان کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ اور اپنے برابر بٹھالیا۔ کنور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ٹل گئے۔ اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ راجہ صاحب نے دو ایک اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے رائے بہادر

صاحب سے کہا۔

راجہ:۔ (لیلا کی طرف اشارہ کر کے) یہ کون لڑکی ہے۔ میں نے پہلے کبھی اس کو نہیں دیکھا۔ نام بھی سُننا یاد نہیں۔

رائے بہادر:۔ یہ منشی اقبال نرائن صاحب کی چھوٹی لڑکی لیلا ہے۔

راجہ:۔ کیا؟ کیا فرمایا؟ منشی صاحب کی لڑکی؟ لیلا؟ (یکایک زانو پر ہاتھ مار کر) غضب ہو گیا! یا خدا، یہ کیا ہوا!

رائے بہادر:۔ (گھبرا کر) کیا راجہ صاحب؟ کیا بات ہے؟

راجہ:۔ آپ سے کیا چھپانا ہے۔ ارے صاحب، اسی لڑکی پر تو میرا لڑکا جان دیتا ہے۔

رائے بہادر:۔ کنور مجت سنگھ؟

راجہ:۔ اور کون؟ اور یہ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ لڑکے نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ منشی جی کو اس لڑکی کے لئے اس کا پیام دوں۔ لیکن میں راضی نہ ہوا۔ اس کا لڑکپن سمجھا۔ اور کنور کو مجبور کیا کہ سیٹھ کی لڑکی اندرا سے شادی کرلے۔ ہائے یہ میں نے کیا کیا!

رائے بہادر:۔ (کچھ سوچ کر) آپ سچ کہتے ہیں۔ بہت دن ہوتے شانتی کی ماں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ ان سے شانتی نے کہا تھا اور خوشامد کی تھی کہ اماں تم پاپا سے کہو۔ ان کے راجہ صاحب اور منشی صاحب دونوں سے تعلقات ہیں۔ پاپا دونوں کو اس رشتے پر راضی کریں۔ میں نے کہا ہم کو تم کو دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ کوئی ہم سے پوچھے تو ہم مشورہ دے سکتے ہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اس کے بعد سُنا کہ کنور اور لیلا کے رشتے سیٹھ کی لڑکی لڑکے سے طے ہو گئے۔

راجہ:۔ سیٹھ کا لڑکا باپ سے زیادہ کمینہ اور عیار ہے۔ اس کا اور بھی افسوس ہے کہ ایسی لڑکی ایسے کے پلّے بندھتی ہے۔

یہ الفاظ راجہ کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ یکا یک ساہو لال دروازے سے اندر داخل ہوا، اور ادھر اُدھر دیکھ کر رائے بہادر صاحب کی طرف بڑھا۔

ساہولال :- رائے بہادر صاحب آداب عرض ہے۔ راجہ صاحب کو تسلیمات عرض کرتا ہوں (راجہ صاحب نے صرف سر کے اشارے سے جواب دیا) رائے بہادر صاحب، معاف فرمایئے۔ میں بے بُلائے حاضر ہوا ہوں

رائے بہادر :- (اخلاق کے ساتھ) جی نہیں، سیٹھ صاحب۔ بِن بُلائے کیوں۔ بعد از وقت کہئے۔ بہر حال شوق سے تشریف لایئے۔

ساہولال :- ناوقت آنے کا سبب یہ ہے کہ میری بہن اندرا یہاں مہمان ہے۔ اور مجھے اس سے کچھ ضروری بات کہنی تھی۔ کہاں ہے اندرا........ وہ بیٹھی ہے۔

اندرا نے بھائی کو آتے ہی دیکھ لیا تھا۔ اور حیرت سے اُس کو دیکھ رہی تھی۔ ساہو تو رنگون گیا ہوا تھا۔ صبح تک اس کے آنے کی کچھ خبر نہ تھی۔ کب آیا، کیوں آیا، یہاں اس وقت آنے کا کیا کام تھا؟

لیلا اور شانتی الگ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ساہو پر نظر پڑتے ہی لیلا کا رنگ زرد ہو گیا یہ دیکھ کر شانتی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیلا کانپ رہی تھی۔

لیلا :- (کانپتی ہوئی آواز سے) شانتی!

شانتی :- لیلا پیاری، ڈرنے کی کیا بات ہے، دل مضبوط رکھو،

لیلا :- باہر چلو۔

دونوں اُٹھتی ہی تھیں کہ دیکھا ساہو لال انھیں کی طرف آرہا ہے۔ ابھی قریب نہ آیا تھا کہ شانتی لیلا کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور ساہو ان سے دو گز کے فاصلے پر آکر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا، لیکن فوراً سنبھلا اور پلٹ کر اندرا کے پاس کوچ پر آکر بیٹھ گیا۔

اندرا :- (آہستہ سے) دیکھا؟

ساہو:۔ خاموش!
اندرا:۔ تم اس وقت کیوں اور کہاں سے آگئے؟ کیا حادثہ پیش آیا؟
ساہو:۔ تنہائی میں کہوں گا۔
اندرا:۔ میں اپنے کمرے میں جاتی ہوں جو پشت کی دیوار سے تیسرا کمرہ ہے۔ وہیں آجانا۔
رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے جانے والے تھے
رائے بہادر نے اتنی وسیع کوٹھی بنائی تھی کہ کم سے کم ایک درجن مہمان الگ الگ کمروں میں قیام کرسکیں۔ چنانچہ آج کے مہانوں کے لئے الگ الگ کمرے متعین و آراستہ کردئے گئے تھے۔
راجہ "شب بخیر" کہہ کر اپنی خواب گاہ کو جانے لگے تو کنور سے کہہ گئے کہ سونے سے پہلے میرے پاس آنا۔ پندرہ منٹ بعد کنور پہنچ گیا۔
راجہ:۔ (کنور کو دیکھتے ہی) بیٹا میں بڑا بدنصیب ہوں۔ آج جو صدمہ ہوا ہے بیان سے باہر ہے۔
کنور:۔ (گھبرا کر) کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟
راجہ:۔ میرا خیال تھا کہ تم ماضی کو بھول چکے ہو۔ اور مستقبل کی اُمیدوں پر خوش ہو۔ لیکن آج میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ تم اس لڑکی سے اب بھی محبت کرتے ہو! میں نے دیکھ لیا ہے۔
کنور:۔ (بے چین ہو کر) آپ مجھے کیوں ستاتے ہیں؟
راجہ:۔ اور وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔ دونوں کی نظروں کو میں نے دیکھا ہے۔
کنور:۔ خدا کے لئے اب کچھ نہ کہئے۔ اب کہنے سننے سے کیا فائدہ ہے۔ میں اور وہ اب دونوں بے دست و پا ہیں۔
راجہ:۔ (جوش کے ساتھ) نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ میرے ہاتھوں نے وہ پھندا ڈالا تھا میرے ہی ہاتھ اس کو کھولیں گے۔ ریاست نہ رہے، راج بھون نہ رہے، دولت نہ رہے، میں نہ رہوں، کچھ پروا نہیں۔

یہ نہ ہوگا کہ تمہاری زندگی کی تباہی کا صدمہ اُٹھا کر مروں۔ تم اسی لڑکی سے شادی کرو گے جس کو چاہتے ہو۔ میں نے آج اس کو اور تم کو دیکھ کر فیصلہ کر لیا ہے۔

اتنے میں برابر کے کمرے کی بلند کھڑکی کھلی۔ اور کسی کے بولنے کی آواز آئی۔

"کہیں غش کھا کر نہ گر پڑنا"

یہ ساہو لال کی آواز تھی جس کے لہجہ سے سختی و سنگدلی ٹپک رہی تھی۔

اندرا:۔ نہیں، لیکن تم نے اس طرح سے اچانک کیوں یہ بات کی؟ کھڑکی کھلی رہنے دو۔ دم گھٹا جاتا ہے تمہیں اس کی کب خبر ہوئی اور کیونکر؟

ساہو:۔ آج تمہارے یہاں آنے کے فوراً بعد میں سفر سے واپس آیا۔ تیسرے پہر کو دادا (اپنے باپ سیٹھ بایاداس کو کہتا ہے) کے دفتر میں گیا، ان کی پرائیویٹ اکاؤنٹ بک (کتاب حساب تجارت) میز پر کھلی رکھی تھی۔ بھولے سے کھلی چھوڑ گئے ہوں گے۔ کچھ دنوں سے وہ بہت زیادہ پینے لگے ہیں۔ میں نے حساب دیکھا، کچھ شبہہ ہوا، سیف (آہنی الماری) کھول کر ان کے کاغذات نکالے۔ ذرا سی دیر میں یہ بھید کھل گیا کہ رئیسِ اعظم سیٹھ بایاداس ملک التجار اور کروڑپتی مٹی کا کھلونا، کاغذ کا گھر اور مجسم فریب و عیاری ہیں۔ تباہی کے غار پر تو بہت دنوں سے کھڑے تھے، اب اس کے اندر گرے پڑے ہیں، ایسے کہ نکل نہیں سکتے۔

راجہ یہ سن کر اچھل پڑے اور کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ کنور نے اشارے سے کہا خاموش رہیئے۔

راجہ:۔ (آہستہ سے) ہم سن رہے ہیں۔ بھید لے رہے ہیں۔

کنور:۔ بے ایمان لوگ سازش کریں تو ایمانداروں کو ان کا بھید لینا جائز ہے

پھر اندرا کی آواز آئی، "تم کو یقین ہے؟ پکا یقین؟"

ساہو:۔ اس میں شک شبہہ کی گنجائش ہی نہیں۔ مدت سے کسی کام میں نفع نہیں ہوا۔ کوئی ٹھیکہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس رنگون کے ٹھیکے نے بالکل تباہ کر دیا۔ اسی لئے مجھے چھوڑ کر آنا پڑا۔ اس معاملہ میں

تو گھر کا بھی سب کچھ چلا گیا۔ اس نے بالکل کمر توڑ دی۔

اندرا:۔ لیکن تم نے اپنا گھر تو بھر رکھا ہے؟

ساہو:۔ یہ بھی تمہارا غلط خیال ہے۔ میں بیشک دولت مند تھا۔ لیکن سیٹھ جی نے مجھ سے بھی قرض لیا۔ اور میں بھی تباہ ہو گیا۔ سب کچھ کھو بیٹھا۔

اندرا:۔ اور ساتھ ہی لیلا کو بھی!

ساہو:۔ خاموش! اس کا نام نہ لینا۔ لیلا کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ لیکن تم کیا اب بھی اس شخص سے شادی کرو گی جس کے گھر اور ریاست کو بچانے کی اب تم میں قدرت نہیں رہی۔

اندرا:۔ کنور سے؟ ہاں، ارادہ تو ہے۔

ساہو:۔ تو اس سے تم کو محبت ہے؟

اندرا:۔ محبت؟ کیا میں ایسے سے محبت کر سکتی ہوں جو دوسری عورت پر مرتا ہو کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو؟ مجھے کنور سے محبت تو کبھی بھی نہ تھی۔ لیکن اب تو نفرت ہو گئی ہے۔ میں نے آج ہی آج میں جو کچھ دیکھ لیا وہ صرف نفرت کے لئے نہیں، بغض، حسد، کینہ کے لئے کافی ہے۔ آج کی گارڈن پارٹی میں کنور جن نظروں سے لیلا کو دیکھتا رہا وہ میری نگاہ سے چھپی نہ تھیں۔ پھر ابھی گھنٹہ بھر پہلے کا ذکر ہے ڈرائنگ روم میں کنور کی نظر ایک منٹ کے لئے لیلا کی طرف سے نہ ہٹی۔ میں بھی اسی کمرے میں موجود تھی۔ میری طرف بھول کر بھی نہیں دیکھا۔ پھر اور سنو، رائے بہادر کی لڑکی شانتی نے کنور کی تصویر لا کر لیلا کو دی اور وہ گھنٹوں اسی کو دیکھنے میں محو رہی۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھوں تو سہی یہ کس چیز کو دیکھ رہی ہے۔ کانس پر سے کتاب اتارنے کے بہانے سے کھڑی ہوئی تو دیکھا کنور کا فوٹو لیلا کے سامنے رکھا ہوا ہے۔ کنور گھوڑ دوڑ کے لباس میں گھوڑے پر تھا۔ (تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ) ہاں، ساہو لال، میں کنور سے ضرور شادی کروں گی۔ ریاست جاتے جاتے بھی کچھ نہ کچھ رہ جاتے گی، راجہ کا خطاب تو ہر حال میں رہے گا۔ میں رانی بن ہی جاؤں گی۔ لیکن اب جس طرح ہو شادی کی تکمیل جلدی ہی کرنی چاہیئے۔ راجہ

اور کنور کو ہماری تباہی و بربادی و مجبوری کی خبر نہ ہونی چاہیے۔ کنور میری دولت کے لالچ میں مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور میں شادی کرکے انتقام لینا چاہتی ہوں۔ شادی کے بعد اس سے کہنا چاہتی ہوں کہ تم نے ایک ریاکار عیار کی لڑکی کو رانی بنایا، پھر بھی اپنی ریاست اور محل کو نہ بچا سکے! اور تم لیلا کو بیاہ لاؤ گے تو اس سے بھی میرا انتقام پورا ہو جائے گا۔ اس نے بھی تمہاری دولت کے لئے جال پھیلایا ہے۔

ساہو:۔ (بات کاٹ کر) لیلا نے جال پھیلایا ہے؟ نہیں اندرا! تمہیں خبر نہیں، میں نے اس کے لئے جال پھیلایا ہے۔ میں نے اس کے باپ کی ساری دولت تجارت میں لگا کر بڈھے کو اپنے قابو میں کیا ہے۔ لیکن میں لیلا سے سچی محبت رکھتا ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتیں، تم دل ہی نہیں رکھتیں۔

اندرا:۔ نہیں، میں تو صرف انتقام کی پیاس رکھتی ہوں۔ بدلہ لینے کی خوشی میں مفلسی کا بھی رنج نہیں رہا۔ میں تو یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ دوالیہ کی بیٹی راجہ کی بہو اور ریاست کی آیندہ رانی بن جائے اور ریاست پر نیلام کی ڈگڈگی بج جائے۔ اچھا بس اب یہ باتیں ختم کرو۔ جاؤ سو رہو۔ کھڑکی بند کرتے جاؤ۔

راجہ اور کنور نے کھڑکی کے بند ہونے اور ساہو کے باہر جانے کی آواز سنی۔

راجہ:۔ ریاست، راج بھون سب ختم!

کنور:۔ جی ہاں، ختم ہوئے۔

راجہ:۔ لیکن تم بچ گئے! یہ کہہ کر راجہ نے کنور کو گلے سے لگا لیا۔

۱۹

صبح کو لیلا کی سوتے سے آنکھ کھلی تو فوراً یاد آگیا کہ ساہو لال اسی کوٹھی میں موجود ہے۔ اس کا خیال آتے ہی چہرہ زرد ہوگیا۔ لیکن فوراً ہی یہ خیال آگیا کہ چاچا باہر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے دل قوی ہوگیا۔ ہمت بندھ گئی۔ ابھی سورج نہ نکلا تھا۔ شانتی سو رہی تھی۔ لیلا آہستہ سے اٹھ کر کپڑے پہن کر

باہر چلی گئی اور باغ میں ٹہلنے لگی۔ ایک جگہ درختوں کے بیچ میں بینچ پڑی ہوئی تھی۔ اس پر بیٹھ گئی۔ ابھی ذرا سی دیر ہوئی تھی کہ سامنے سے ساہو لال آتا ہوا نظر آیا۔ اُس کو دیکھ کر لیلا کا چہرہ پہلے زرد پھر سُرخ ہو گیا۔ اور اُٹھ کر کوٹھی کی طرف جانے لگی۔ ساہو لال نے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور جلدی سے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

ساہو:۔ لیلا دیوی، ایک بات سُنتی جاؤ۔ اب میرے تمہارے درمیان ایسی اجنبیت نہیں رہی ہے کہ میرا بات کرنا خلاف آداب اور ناگوار ہو (لیلا سر جھکائے ساہو کی طرف سے منہ پھیرے بینچ کے پاس کھڑی تھی) لیلا، تم کو معلوم ہے میں کیوں اتنی جلدی رنگون سے واپس آیا ہوں؟ (لیلا کو چکر سا آنے لگا جلدی سے بینچ پر بیٹھ گئی، ساہو کھڑا رہا) میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔

لیلا خاموش رہی۔ اس کی زبان سے کوئی لفظ ہی نہ نکلتا تھا۔

ساہو:۔ لیلا، اب زیادہ انتظار میں نہ رکھو۔ منشی جی تو اب اچھے ہو گئے۔

لیلا حیران تھی کہ اس بے حیا کو کس طرح ٹالے، کیا جواب دے۔ آخر ہمت کر کے بولی۔

لیلا:۔ میرے بزرگوں سے کہیے۔ مجھ سے کہنے کا آپ کو کچھ حق نہیں۔

ساہو:۔ ٹھیک ہے۔ میں تمہاری مرضی دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اب تم سے کچھ نہ کہوں گا۔ چلو، ناشتہ تیار ہو گا۔

لیلا:۔ (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) جائیے۔

ساہو لال نظر سے اوجھل ہو گیا تو لیلا اُٹھی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ بینچ کے پیچھے وہی شفا خانہ والا مریض گھاسی رام کھڑا ہے۔ لیلا اس کو دیکھ کر لڑکھڑا گئی اور بینچ کو پکڑ لیا۔

لیلا:۔ گھاسی رام، تم نے مجھے ڈرا دیا۔ تم یہاں کہاں؟

گھاسی رام:۔ معاف کیجئے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ مگر میں نے یہ کچھ بے جا بات کی؟

لیلا:۔ نہیں کچھ ہرج نہیں۔

گھاسی رام:۔ اچھا، یہ تو بتائیے، کنور صاحب یہیں ٹھہرے ہوتے ہیں؟

لیلا :- یہیں ہیں - ان سے ملنا چاہتے ہو ؟ وہ تم کو تندرست دیکھ کر خوش ہوں گے ۔
گھاسی رام :- میں اُن کے اخلاق اور ہمدردی کو جانتا ہوں ۔ نہیں میں ملنا نہیں چاہتا میرا ذکر کسی سے نہ کیجئے ۔ میں اب جاتا ہوں ، بندگی ۔

گھاسی رام کا انداز اس وقت کچھ ایسا عجیب تھا کہ لیلا اُس کی طرف برابر دیکھتی رہی ۔ جب وہ نظر سے غائب ہوگیا ، تو فوراً لیلا کو خیال آیا کہ یہ یکایک پنج کے پیچھے نمودار ہوگیا تھا کیا دیر سے کہیں قریب میں چھپا ہوا تھا ؟ اس کی اور ساہو رام کی باتیں سُن رہا تھا ؟

یہ سوچتی ہوئی لیلا کوٹھی کی طرف چلی تو سامنے سے شانتی دوڑتی ہوئی آئی اور آکر لیلا کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے ۔ اور کہا ، " بڑی شوقین ہوا خوری کی ! مجھے سوتا چھوڑ کر چپکے سے چلدیں ! میں ڈھونڈھتی پھرتی ہوں کہ بے کہے سُنے گھر نہ چلدی ہوں ۔ وہیں سے پکڑ کر لاتی ۔ چلو ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے "

(۲۰)

ناشتے کے بعد ساہو اور اندرا کمرے میں اکیلے کھڑے باتیں کر رہے تھے ۔
ساہو :- میں نے لیلا سے کہہ دیا ہے کہ اب شادی میں جلدی ہونی چاہئے ۔
اندرا :- لیلا ، لیلا ! تمہیں اپنی فکر ہے ، میری کچھ فکر نہیں ۔
ساہو :- کیوں نہیں ، آج ہی جاکر سیٹھ جی سے راجہ کو تقاضے کا خط لکھواتا ہوں ۔ ہم آتش فشاں پہاڑ پر کھڑے ہیں ۔ اگر ہوشیاری سے کام لیا تو سب ٹھیک ہے ۔

اتنے میں یکایک کنور کمرے میں داخل ہوئے اندرا نے اُن کی طرف دیکھا اور ایک نظر ڈالتے ہی کھٹک گئی کہ تیور اچھے نہیں ہیں ۔
کنور :- سیٹھ ساہو لال اچھا ہوا آپ بھی یہاں موجود ہیں ۔ (دونوں بہن بھائی چونک کر کنور کا منہ تکنے لگے ،

کسی تمہید کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کی بہن کو منگنی کی پابندی سے آزادی دینے کے لئے آیا ہوں۔

اندرا بے حس و حرکت کھڑی رہی، لیکن ساہولال لڑکھڑا گیا، چہرہ سُرخ ہو گیا۔

ساہو:۔ کیا! آپ میری بہن کے ساتھ اپنی منگنی توڑتے ہیں؟

کنور:۔ میں ان کو آزادی کا موقع دیتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ بغیر کسی مزید سوال و جواب کے اس رشتے کو اسی وقت اسی جگہ قطع کر دیا جائے۔

اندرا یہ سُن کر غصے سے پیچ و تاب کھا کر باہر جانے لگی۔

ساہو:۔ ٹھہرو اندرا۔ کنور صاحب بڑے آدمی ہیں۔ لیکن بڑے آدمی اور راجہ مہاراجہ بھی اتنا بڑا کام بغیر سبب بیان کئے نہیں کر سکتے۔

کنور:۔ آپ مجبور نہ کیجئے۔ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے کہ مجھ سے سبب نہ پوچھئے۔

اب اندرا سے نہ رہا گیا۔ غصے سے کنور کی طرف دیکھا۔

اندرا:۔ سچ ہے۔ سبب بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہم کو معلوم ہے۔ آپ ایک عورت سے محبت کرتے ہوئے دوسری سے شادی نہیں کر سکتے۔ ساہولال، معزز کنور صاحب ایک رشتہ پکا کر کے اُس ذلیل لڑکی کے لئے توڑنا چاہتے ہیں جو تمہاری بیوی بننے والی ہے۔ لیلا کا شکریہ ادا کرو۔

ساہو کا چہرہ سفید ہو گیا اور دانت پیسنے لگا۔

کنور:۔ (غصے کو ضبط کر کے) آپ لوگ معاملے کو یہیں ختم کرنا نہیں چاہتے۔ اچھا سُنئے۔ میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اپنے وعدے پر قائم رہتا اور منگنی کو برقرار رکھتا، اگرچہ اس میں میری مسرت کا عمر بھر کے لئے خاتمہ ہو جاتا۔ سیٹھ جی آپ ہنستے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ میں نے آپ کی دولت کے لئے یہ رشتہ کیا تھا۔ مجھے ہر حال میں اپنے گھر کی بربادی سے زیادہ اپنی بات کا پاس لحاظ ہوتا لیکن سُنئے، میرے والد کا کمرہ اندرا بائی کے کمرہ سے ملا ہوا ہے۔ میں رات والد کے پاس تھا۔ آپ دونوں میں جو باتیں ہوئیں ہم نے حرف بحرف سُنی ہیں۔

ساہو:- (طعنہ کے لہجہ میں) اچھا شریف و ایماندار کنور صاحب، آپ کا یہ سلوک اس لئے ہے کہ ہم تباہ و مفلس ہوگئے ہیں۔ اور میری بہن آپ کے لئے وہ دولت نہیں لاسکتی جس کی خاطر آپ نے اپنے آپ کو بیچا تھا!

کنور:- نہیں، اور تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے سب کچھ سُنا ہے، سب کچھ! (پھر اندرا سے مخاطب ہوکر) کیا تم مجھے مجبور کرتی ہو کہ وہ قابل تعریف اور شریفانہ خیالات و جذبات یاد دلاؤں جن کا تم نے میرے متعلق اظہار کیا تھا؟ کیا تم مجھے اس بات کے کہنے پر مجبور کرتی ہو کہ میں ایسی عورت کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کرتا ہوں جو مجھ سے محبت کے سبب سے نہیں بلکہ کینہ و انتقام کے لئے شادی کرتی ہے۔

اندرا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ساہو لال اپنی عیاری کے بے نقاب ہو جانے سے غضبناک ہوگیا، اور گھونسا تان کر کنور کی طرف بڑھتا تھا کہ کنور نے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر ایسا گھونسا رسید کیا کہ ہاتھ کے ساتھ ساہو لال بھی پیچھے ہٹ گیا۔ اسی وقت راجہ اور رائے بہادر اندر آگئے۔ آوازیں بے اختیاری میں بلند ہوکر باہر پہنچ گئی تھیں۔

راجہ:- (ڈانٹ کر) اس کے کیا معنی؟ کیا ممکن ہے کہ میرا بیٹا کسی معزز میزبان کے گھر کوئی ناشائستہ حرکت کرے۔

کنور:- (مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر) معاف فرمائیے گا رائے بہادر صاحب۔

رائے بہادر:- لیکن بات کیا ہے؟

ساہو لال:- (طنزیہ انداز سے) بات یہ ہے کہ شرافت پناہ کنور صاحب بہادر نے میری بہن کی توہین کی ہے۔ یعنی اُنھوں نے رات چوری سے ہماری باتیں سُن لیں اور اس وقت میری بہن سے اپنی منگنی توڑنے آئے ہیں۔

رائے بہادر:- کنور صاحب کیا یہ سچ ہے؟

کنور:- میں اندرا بائی کے ساتھ اپنی نسبت منقطع کرتا ہوں۔

اندرا:- اور میں کنور صاحب کے ساتھ اپنی نسبت توڑتی ہوں۔ چاہے وہ اب بھی ریاست کے راجکمار

ہوں۔ اگرچہ اصل یہ ہے کہ بالکل مفلس و محتاج ہیں!

ساہو لال:۔ بیشک مفلس و محتاج ہیں۔ (پھر راجہ سے مخاطب ہو کر) راجہ صاحب، آپ کو اُمید تھی کہ ہم آپ کی ریاست کو تباہ ہونے سے بچالیں گے۔ رات آپ نے سُن لیا کہ ہم تباہ ہو گئے۔ لیکن ہم کو اپنی تباہی سے اتنی تسلی بھی ہے کہ آپ کو بھی اپنے ساتھ لے کر ڈوبیں گے۔ (اپنی بہن سے) آؤ اندرا، چلو، اب میرا تمہارا اور لیلا کا اس گھر میں کچھ کام نہیں۔

یہ الفاظ منہ سے نکلے ہی تھے کہ لیلا اور شانتی آگئیں۔ اور راجہ کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ ساہو لیلا کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھا، لیلا شانتی کا ہاتھ کھینچ کر اور بھی راجہ اور رائے بہادر کے قریب ہو گئی۔

شانتی:۔ (ہاتھ کے اشارے سے ساہو کو روک کر) وہیں سے کہیے جو کہنا ہو۔

ساہو لال:۔ (جز بز ہو کر) لیلا، چلو اپنے گھر چلو۔ یہاں ہمارا تمہارا ٹھکانا نہیں۔ لیلا، میں اور میرے والد تباہ و مفلس ہو گئے ہیں۔ اسی سبب سے کنور صاحب نے میری بہن سے اپنی نسبت توڑ دی۔ کیا تم اس مصیبت میں میرا ساتھ نہ دو گی، میری مفلسی کے سبب سے تم بھی مجھ سے پھر جاؤ گی؟

لیلا کا منہ فق ہو گیا، لرزہ سا طاری ہو گیا۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی لیکن ہمت کر کے راجہ صاحب کی طرف دیکھا اور کہا۔

لیلا:۔ راجہ صاحب، سیٹھ جی نے بڑی سخت مشکل میں میرے والد کی مدد کی ہے، اُن کی عزت بچائی ہے اب میں اپنے والد کے حکم سے نہیں پھر سکتی۔

راجہ:۔ میری بچی، اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ رشتہ محبت کی بنا پر نہیں، بلکہ احسان شناسی اور بات کی پچ ہے۔ (ساہو لال سے) اور تم سیٹھ جی اس قدر بے رحم ہو کہ اس بے بس لڑکی کی قربانی گوارا کرتے ہو؟

ساہو لال:۔ راجہ صاحب، اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے، لیلا اپنے ارادے کی پکی ہے۔

راجہ:۔ (لیلا سے) بچی، اس میں شک نہیں کہ سیٹھ کی تباہی کے ساتھ ہماری ریاست بھی تباہ ہو گئی لیکن

اس پر بھی میں اپنے بیٹے کنور کے لئے تمہارے باپ سے تمہاری درخواست کرتا۔

یہ سُن کر لیلا بیتاب ہو گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

راجہ یہ دیکھ کر بے چین ہو گئے اور لیلا کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔ ساہو فوراً لیلا کا ہاتھ پکڑنے کے لئے بڑھا، لیکن لیلا پیچھے ہٹ گئی۔ لیلا اور شانتی دونوں رونے لگیں۔

اتنے میں آہستہ سے دروازہ کھلا اور ایک شخص بیمار وضعیف داخل ہوا۔ اور لکڑی پر سہارا لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور حیرت سے دیکھنے لگے۔ لیکن ساہو لال کا یہ حال ہو گیا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

راجہ:۔ یہ کون شخص ہے؟

کنور:۔ (آگے بڑھ کر) میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ اس کو باہر لئے جاتا ہوں۔

گھاسی رام:۔ (وہی نووارد شخص) نہیں کنور صاحب۔ میں آپ سے ملنے کے لئے نہیں آیا، بلکہ ان لیلا دیوی سے ملنے آیا ہوں۔

ساہو لال:۔ (جلدی سے) نہیں نہیں۔ نکالو اس کو، باہر نکال دو۔

گھاسی رام:۔ (ساہو کی طرف گھونسا تان کر) ہاں مجھے نکال دو، سچی بات کہنے سے پہلے نکال دو۔ کیوں سیٹھ ساہو لال؟

ساہو لال:۔ میں اس شخص کو نہیں جانتا۔

یہ کہہ کر ساہو لال دروازے کی طرف چلا۔ لیکن کنور جلدی سے اس کے اور دروازے کے درمیان حائل ہو گئے

گھاسی رام:۔ (چلا کر) روکئے سرکار، اس کو جانے نہ دیجئے۔ یہ شخص بڑا بدمعاش ہے۔ کنور جی، اسی ساہو لال نے مجھے روپیہ دے کر سرکار کی گھوڑ دوڑ کو خراب کرایا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے ہی وہ ترکیب اس کو سجھائی تھی۔ میں نے ہی آخری دوڑ میں رومال ہلا کر سرکار کے گھوڑے کو بھڑکایا تھا لیکن اس نے مجھے رشوت

دی تھی۔ میں گنہ گار ہوں۔ مجھے سزا دیجئے۔ مار ڈالئے۔ لیکن ساہو لال نے مجھے لالچ دلایا تھا۔

ساہو لال:۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں اس سے بالکل واقف نہیں۔

گھاسی رام:۔ (اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے) کنور صاحب، آپ اس پر بھی گھوڑ دوڑ میں جیت گئے۔ اور اس سے ساہو لال جل گیا۔ اب کے خود اس نے مجھے ایک ترکیب بتائی۔ اس نے مجھ سے حضور کے گھوڑے کو زہر دلوایا۔ بیشک میں نے اپنے ہاتھ سے یہ کام کیا لیکن مجھے اس کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ اسی ساہو لال نے تدبیر بتائی اور رشوت دی۔

ساہو لال: جھوٹا! مکار! بدمعاش!

گھاسی رام:۔ (دانت پیس کر) میں جھوٹا، مکار، بدمعاش ہوں! کیوں ساہو لال جی۔ یہ تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ تم نے ترکیب بتائی ہے کہ کس طرح اصطبل میں جا کر گھوڑے کو زہر کی ملی ہوئی گولی کھلائی جائے۔ لیجئے کنور صاحب یہ تحریر اس کو دکھایئے۔

کنور نے بڑھ کر کاغذ گھاسی رام سے لے لیا۔ اور اک نظر میں اس کا مضمون پڑھ لیا۔

گھاسی رام:۔ میں نے ایسا کام عمر بھر میں کبھی نہ کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے بڑا رنج ہوا۔ زندگی سے بیزار ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر میں کہیں دوسرے ملک کو نہ بھاگ گیا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں ساہو لال کے پاس گیا اس سے کہا کہ مجھے کچھ روپیہ دیدو تو میں کہیں جا کر منہ چھپالوں۔ لیکن اس نے مجھے دھتکار دیا۔ اور پھر ایک روپیہ میرے آگے ڈال دیا جیسے کوئی کتے کو ہڈی ڈال دیتا ہے۔ مجھ کو اس دن سے اس سے نفرت ہو گئی اور اس سے بدلہ لینے کی فکر میں رہنے لگا۔ لیکن اتفاق سے ایک دن میں تانگے سے ٹکرا گیا۔ اندھیری رات تھی۔ میں اپنے ہوش میں نہ تھا لیکن اس وقت کس نے میری مدد کی، کون مجھے بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل گیا۔ یہی کنور صاحب، کنور محبت سنگھ صاحب یہ اسی سڑک پر موجود تھے۔ دوڑے اور مجھے مرنے سے بچالیا۔ اور خود چوٹ کھائی۔ زخم کھائے۔ مجھے ہسپتال پہنچایا۔ مجھے آکر دیکھا پوچھا۔

کنور:۔ (گھاسی رام کے پاس آکر) اِن باتوں کو چھوڑ دو۔ کچھ اور کہنا ہو تو جلدی سے کہہ دو۔

گھاسی رام:۔ جی ہاں۔ ابھی اور بھی کہنا ہے۔ جب آپ ہسپتال میں آئے تو میں نے سمجھا کہ آپ کو میرے جرم کی خبر ہو گئی ہے۔ مجھے پکڑوانے آئے ہیں۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط تھا۔ اور مجھے کچھ اور بھی معلوم ہوا کہ آپ لیلا دیوی سے محبت کرتے ہیں اور لیلا دیوی آپ سے محبت کرتی ہیں۔

کنور:۔ (چونک کر) یہ ذکر نہ کرو، خاموش رہو۔

گھاسی رام:۔ (سر ہلا کر) نہیں سرکار، مجھے کہنے دیجئے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ لیلا دیوی کی شادی ساہو لال سے ہونے والی ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ ایسی شریف لڑکی ایسے کمینہ شخص سے کیسے محبت کرسکتی ہے۔ میں اس بات کی ٹوہ میں رہا۔ جب میں اچھا ہو گیا تو معلوم ہوا کہ لیلا دیوی میرے لئے کچھ روپیہ دے گئی ہیں۔ میں ہسپتال سے نکل کر شہر گیا۔ اور اس بات کی تلاش کی کہ ساہو لال نے کیا جال بچھایا ہے۔ ساہو لال کا ایک بھیدی سسٹر وہاں مجھے مل گیا۔ اس کے نام سے ساہو لال نے دہلی میں دغا بازی کا ایک دفتر کھول رکھا تھا۔ وہ شخص کبھی کبھی یہاں آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے دوستی بڑھائی، اس کو شراب پلائی۔ اس کو ساہو لال کے پیچھے لگایا اور یہ بھید معلوم کر لیا کہ ساہو لال نے لیلا دیوی کے والد منشی اقبال نرائن صاحب کو دھوکا دیکر ایک شوگر مل کے حصے خریدنے میں انکی ساری دولت صرف کرادی۔ ساہو لال جانتا تھا کہ یہ کمپنی چلنے والی نہیں ہے۔ جب کمپنی کے دوالیہ ہو جانے سے منشی جی تباہ ہو گئے تو ساہو لال نے عیاری کے ساتھ مدد کا وعدہ کیا۔ منشی جی کو روپیہ قرض دیا۔ اور لیلا دیوی کو یقین دلایا کہ اُن کی اور اُن کے گھر کی عزت و آبرو کا بچانے والا ساہو لال ہی ہے۔ اس طرح منشی جی کو اپنے قبضے میں کیا۔ انھوں نے احسان شناسی کے سبب سے ساہو لال سے رشتہ کرنا منظور کر لیا اور اسی مجبوری سے لیلا دیوی بھی راضی ہو گئیں۔ یہ ہے سارا قصہ۔ یہ ہے ساہو لال کی بے حیائی اور بدمعاشی کی کہانی۔ کنور صاحب میں نے آپ کے گھوڑے کو مار ڈالا لیکن آج لیلا دیوی کو ایک بدمعاش کے پنجے سے چھڑا لیا۔

یہ لمبی تقریر گھاسی رام جیسے بیمار ضعیف کے لیے بڑا سخت کام تھا۔ خاموش ہوا تو چکر آ گیا۔ گرنے والا تھا کہ

کنور نے جلدی سے بڑھ کر سنبھال لیا۔ اور آہستہ سے لٹا دیا۔ رائے بہادر نے نوکر کو آواز دیکر ڈاکٹر کے لئے بھیجا۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ساہو رام اور اندرا موقع دیکھ کر چپکے سے باہر نکل گئے۔

شانتی نے ان کو جاتے دیکھ کر کہا، "خس کم جہاں پاک"!

رائے بہادر نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بولے

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

۲۱

ابھی دس پندرہ منٹ گزرے تھے، سب لوگ اُس کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں جمع تھے لیلا اور شانتی الگ ایک کونے میں ایک دوسری کی کمر میں ہاتھ ڈالے کوچ پر بیٹھی تھیں۔ راجہ کنور، رائے بہادر دوسری طرف بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور ڈاکٹر امراؤ سنگھ یکا یک آ کھڑے ہوئے۔ اِدھر تینوں مرد اِن کو دیکھ کر کھڑے ہوئے، اُدھر سے لیلا دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

لیلا:۔ باپوجی، آپ کب آئے، چاچا کہاں ہیں، کیسے ہیں۔ ساتھ آئے ہیں؟

ڈاکٹر امراؤ سنگھ:۔ (راجہ وغیرہ سے ہاتھ ملاکر) بیٹا سب خیریت ہے۔ منشی جی بالکل اچھے ہیں۔ اب کوئی شکایت نہیں۔ اطمینان رکھو۔ میں اور وہ آج صبح آئے ہیں۔ اطلاع دینے کا ارادہ تھا، لیکن مجھے راستے میں ایک جگہ ٹھہرنا تھا اس لئے پہلے سے آنے کی خبر نہ کر سکے۔ یہاں آکر معلوم ہوا لیلا یہاں ہے۔ اس وقت مجھے رائے بہادر صاحب کی یہ تقریب یاد آئی۔ میرے پاس دعوت نامہ مکان سے لوٹا کر بمبئی بھیجدیا گیا تھا۔ مبارکباد عرض کرتا ہوں رائے بہادر صاحب۔ میں نے سوچا دیر تو ہوگئی ہے لیکن مبارکباد دے آؤں، لیلا کو بھی آنے کی اطلاع ہو جائے گی۔

رائے بہادر:۔ شکریہ شکریہ۔ بڑا کرم فرمایا۔ دیر آید درست آید والا مضمون ہے۔

اِس کے بعد رائے بہادر صاحب اور راجہ صاحب نے کل سے آج تک کے تمام واقعات اور مناظر بیان کئے۔

ڈاکٹر:۔ (سننے کے بعد اطمینان کا سانس لیکر) شکر ہے۔ لیلا کی جان بچ گئی۔

راجہ:۔ ڈاکٹر صاحب منشی جی سے کہہ دیجئے کہ اب میں کنور کا پیام لیکر اُن کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں کنور کی نگاہ لیلا کی طرف اُٹھی، لیلا نے آنکھیں نیچی کرلیں، شانتی خوشی کے مارے لیلا سے لپٹ گئی۔

رائے بہادر:۔ راجہ صاحب ابھی کیوں نہ چلئے۔ یہ سب پارٹی ابھی منشی صاحب کے پاس چلی چلے۔ اُن کی مزاج پُرسی بھی ہو جائے گی۔ اِن سب واقعات کا بھی ذکر آجائے گا۔ اور آپ کا پیام بھی پہنچ جائے گا۔

چنانچہ راجہ و رائے بہادر کی موٹر کاریں چاروں مردوں اور لیلا و شانتی کو لیکر منشی اقبال نرائن کے مکان پر پہنچ گئیں۔ وہاں سب لوگ اس پارٹی کو دیکھ کر متحیر بھی ہوئے مسرور بھی۔ خیر و عافیت کے بعد رائے بہادر صاحب نے نہایت موزوں اور حسب موقع تفصیل و اجمال کے ساتھ کُل واقعات بیان کئے۔ اس کے بعد راجہ صاحب کی طرف سے کنور کے لئے لیلا کی درخواست کی۔ منشی جی نے کہا آپ صاحبوں کو مجھ سے زیادہ لیلا کا اختیار ہے۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔

ڈاکٹر امراؤ سنگھ:۔ اس بات کا اطمینان ہونے کے بعد اب گزشتہ واقعات کے سلسلے میں کچھ اور عجائبات الم و مسرت مجھ سے سُنئے۔ بہت مختصر طور پر عرض کرتا ہوں۔ میں اِسی روز سے تحقیقات میں مصروف تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کمپنی کا سرقہ و غبن اور ناکامی بھی اسی بدمعاش ساہولال کی کارستانی تھی۔ لیکن وہ بدذات ایسا چالاک تھا کہ کمپنی کے ڈائرکٹر اور ملازموں کو تدابیر سمجھائیں اور آپ الگ رہا۔ اثبات جرم کے لئے اس کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے لیکن اُمید ہے کہ کچھ معتبر گواہ نکل آئیں گے اور وہ کمینہ کیفر کردار کو پہنچے گا۔ یہ تو افسوسناک پہلو ہوا۔ مسرت افزا بات یہ ہے کہ میں نے کمپنی کے معاملے کو منشی جی کی طرف سے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ان کے پندرہ ہزار روپیہ کے حصّے ساٹھ ہزار کی قیمت کے ہوگئے۔ یہ کھیل بھی ایک قسم کا جُوا ہے۔ لیکن میں نے بھی قسمت آزمائی کی اور اسی میں سے پچاس ہزار روپیہ کے حصّے فروخت کرکے ایک سونے کی کان کے حصّے خرید لئے۔ منشی جی اور اُن کے بچّوں پر خدا

کی یہ مہربانی ہوئی کہ تھوڑے عرصے میں اُن کا سرمایہ پانچ لاکھ سے زیادہ ہو گیا۔

یہ سن کر لیلا کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی پھر وہ شانتی کو ہاتھ پکڑ کر الگ لے گئی اور جلدی سے کچھ کہا۔ شانتی اس مجمع کی طرف آئی اور بولی :-

شانتی :- میری پیاری بہن لیلا دیوی اپنے حصہ کی ساری دولت راجہ صاحب اور کنور صاحب کے قدموں پر نچھاور کرتی ہیں۔ اور نہایت عاجزی سے عرض کرتی ہیں کہ اُن کے نزدیک اس کثیر دولت کا اس سے بڑھ کر کوئی مصرف نہیں ہے کہ ریاست اور راج بھون محفوظ ہو جائیں۔ اور وہ نہایت ادب کے ساتھ اِس پیش کش کو قبول کرنے کی درخواست کرتی ہیں۔

راجہ نے اُٹھ کر لیلا کو گلے سے لگا لیا۔ اور تمام حاضرین کی آنکھیں اشکِ مسرت سے لبریز ہو گئیں۔

۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء
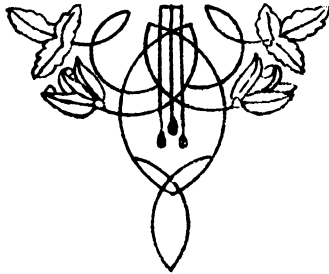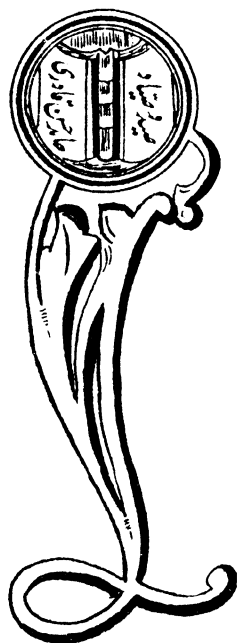
حامد حسن قادری

آسمانی سوار

سنہ ۱۸۶۱ء کا موسم خزاں ہے، صاف و روشن سہ پہر کا وقت۔ ایک سوار گھنے جنگل میں پڑا ہے۔ یہ مقام اس سڑک کے کنارے پر ہے جو مغربی ورجینیا کو جاتی ہے۔ سوار پیٹ کے بل لیٹا ہوا ہے۔ جوتے کی نوک زمین پر کھڑی ہے۔ سر بائیں بازو پر رکھا ہوا ہے۔ پھیلا ہوا داہنا ہاتھ بے خبری میں بھی رائفل پر رکھا ہے۔ صرف اعضا کی باقاعدہ طبعی حالت اور پیٹی سے بندھے ہوئے کارتوس بکس کی خفیف جنبش اس کی حیات کی تصدیق کر رہی ہے۔ سپاہی اپنی ڈیوٹی کے وقت سو رہا ہے۔ اگر اس حالت میں دیکھ لیا جائے تو انصاف و قانون کا تقاضا یہ ہے کہ یہی اُس کی آخری نیند ہو جائے۔

درختوں کے اس دلفریب اور گنجان کنج کے سامنے قد نظر تک بلند پہاڑ ہے، جس کی ایک وسیع و مسطح چٹان باہر کو نکلی ہوئی ہے۔ پہاڑ کے نیچے سوار کی خوابگاہ سے دور ایک عظیم الشان عمیق جنگل واقع ہے۔ ایک پتھر کو ہموار چٹان سے چل کر جنگل کے درختوں تک پہنچنے کے لئے ایک ہزار فٹ کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ سوار جس کنج میں محو خواب ہے اس قدر بلندی پر واقع ہے کہ اگر وہ بیدار ہوتا تو نہ صرف چٹان اس کی نظر کے سامنے ہوتی بلکہ دامن کوہ کے غار اور جنگل کی پہنائی کا بھی اندازہ کر سکتا، جس کی طرف ایک نظر ہی پریشانی حواس اور دوران سر کے لئے کافی ہے

سوار کی آرام گاہ سے کچھ فاصلے پر اس کی فوج پڑی ہوئی ہے۔ دن بھر کی مسافت کے بعد اب دم لیا ہے رات کے وقت پھر کوچ کرے گی اور اس مقام سے گذرتی ہوئی جہاں اس کا غافل سنتری پڑا ہوا ہے کوہستانی راستوں کو طے کر کے سوتے ہوئے دشمن پر حملہ آور ہوگی۔ بے خبری میں دفعۃً حملہ کرنے پر کامیابی منحصر ہے۔ اگر دشمن کا کوئی سپاہی کہیں چھپا ہوا ہو اور ان کی فرودگاہ اور نقل و حرکت سے آگاہ ہو جائے تو شکست ظاہر اور ہلاکت یقینی ہے۔

ورجینیا اُن کی منزلِ مقصود ہے اور اُس کی تسخیر اُن کا مقصدِ سفر۔

یہ جواب سنتری کارٹر ڈرورز ورجینیا کا ایک نوجوان تھا۔ متمول والدین کا فرزندِ یگانہ جس راحت و عیش اور تعلیم و تربیت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے وہ سب اس کو میسّر تھی۔ ایک دن صبح کو ناشتہ کی میز سے اُٹھتے وقت اُس نے نہایت سکون و سنجیدگی کے ساتھ باپ سے کہا "ابا، ایک یونین رجمنٹ گریفنٹن میں آ گئی ہے۔ میں اس میں شامل ہونے کے لئے جاتا ہوں"۔ باپ نے سر اُٹھایا، بیٹے پر ایک لمحہ نظر ڈالی اور کہا: "جاؤ کارٹر۔ اور ہر حالت میں وہی کرنا جو تمہارا فرض ہو۔ ورجینیا جس سے تم دغا کرتے ہو تمہارے بغیر بھی باقی رہ سکتا ہے۔ اگر ہم دونوں جنگ کے بعد زندہ رہے تو اس معاملہ پر گفتگو کریں گے۔ تمہاری ماں کی حالت، جیسا کہ طبیب تم سے بیان کر چکا ہے نہایت نازک ہے۔ چند ہفتوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن یہ زمانہ نہایت قیمتی ہے۔ بہرحال اس وقت اس کو پریشان کرنا مناسب نہیں"۔

کارٹر ڈرورز کا سر اظہارِ تسلیم کے لئے خم تھا۔ باپ نے جس انداز سے رخصت کیا وہ قلبِ مجروح کا پردہ پوش تھا۔ کارٹر اپنے وطنِ آبائی اپنے گہوارۂ طفلی کے خلاف دادِ شجاعت دینے کے لئے روانہ ہو گیا۔ احساسِ فرض و دلیری، وفاداری و سرفروشی کے کارناموں نے اس کو تھوڑے ہی زمانہ میں ہم عمروں سے ممتاز اور افسروں کی نظر میں قابلِ قدر بنا دیا۔ یہی اوصاف تھے اور سرزمینِ وطن سے واقفیت کہ اس وقت اس کو دشمن کی سرحد پر پاسبانی کی خطرناک ڈیوٹی پر مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن کسلِ راہ اور خستگیِ سفر نے عزم و استقلال پر عارضی غلبہ پا لیا تھا اور نیند نے آ دبایا تھا۔

خدا جانے کس نیکی یا بدی کے فرشتے نے خواب میں آ کر اس کو اس خوابِ مجرمانہ سے بیدار کر دیا۔ کسی غیبی کاتبِ تقدیر نے بغیر حرکت اور بغیر آواز کے اس کی چشمِ شعور کو مَس کیا اور اس کی روح کے کانوں میں وہ پُر اسرار و بیدار کن الفاظ پھونک دیئے جو کسی انسانی ہونٹ سے نہیں نکلے اور کسی انسانی حافظے کو یاد نہیں۔ اس نے خاموشی کے ساتھ اپنے بازو سے پیشانی کو اُٹھایا اور داہنے ہاتھ سے رائفل کی گرفت کو سخت کر کے درختوں پر نظر ڈالی۔

سب سے پہلے اس کو ایک مسرت و فرحت کا احساس ہوا جو صناعِ عالم نے مناظرِ قدرت کے اندر رکھ دی ہے۔ پہاڑ کے پُر ہیبت پایہ پر مُسطح چٹان کے آخری کنارے پر اُفق آسمان کے مقابل ایک سوار کا شاندار بُت کھڑا تھا۔ انسانی مجسمہ گھوڑے پر بیباکانہ شان سے بیٹھا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک یونانی دیوتا پتھر سے تراشا گیا ہے۔ سوار کا ہلکا سبز لباس فلک اخضر کے ہمرنگ تھا۔ اس کا چہرہ کسی قدر بائیں جانب مُڑا ہوا تھا، صرف کنپٹی اور داڑھی کا ایک حصّہ نظر آتا تھا وہ نیچے کسی عمیق و وسیع وادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سوار کی فلک پیما بلندی اور قرب دشمن کے احتمال و خوف نے کارٹر کی نظر میں اس مجسمہ کو نہایت ہیبت ناک بنا دیا۔

ایک لحہ کے لئے کارٹر ڈرروز کو یہ محسوس ہوا کہ وہ اختتامِ جنگ تک سوتا رہا ہے اور یہ مجسمہ یادگارِ فتح کے طور پر بلندی کوہ پر نصب کیا گیا ہے۔ لیکن یہ احساس مجسمہ کی خفیف حرکت سے فوراً باطل ہو گیا۔ گھوڑے نے پاؤں کو حرکت دیئے بغیر اپنے جسم کو پیچھے کی طرف کھینچا۔ سوار بدستور بے حس و حرکت رہا۔ کارٹر کے حواس درست ہو گئے، خواب خیال ہو گیا اور موقع کی اہمیت و نزاکت کو دیکھ کر اس نے رائفل کا نشانہ درست کیا۔ نال کو جھاڑی کے اندر سے نکال کر گھوڑا چڑھا لیا اور سوار کے سینہ کو ہدف کے لئے انتخاب کیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اسی وقت انگلی سے ایک اشارہ بھی کر دیتا۔ لیکن اسی لحہ میں سوار نے سر کو جنبش دی اور پوشیدہ دشمن سپاہی کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نگاہیں سپاہی کے چہرے، آنکھوں اور دل کے اندر سرایت کر رہی ہیں۔

کیا جنگ میں دشمن کو ہلاک کرنا اس قدر خوفناک ہے، خصوصاً اس دشمن کو جس نے وہ راز معلوم کر لیا ہے جو ہماری فوج کی حفاظت کا ضامن ہے، اس دشمن کو جو اپنے علم و آگاہی کی بنا پر اپنی کثیر فوج سے زیادہ خطرناک ہے! کارٹر پر موت کی سی زردی چھا گئی، عضو عضو کانپنے لگا، چکر آنے لگے، اور سوار کا مجسمہ ایسا نظر آنے لگا کہ ایک تصویر ہے جو آتشی آسمان کے اندر چکر لگا رہی ہے۔ ہاتھ کی گرفت رائفل پر سُست ہو گئی، اور سر آہستہ آہستہ جھک کر زمین پر پڑی ہوئی پتیوں پر جا لگا۔ بہادر جوان اور جری سپاہی کو جوشِ جذبات سے مغلوب ہو کر غش آرہا تھا۔

یہ حالت دیر تک نہ رہی، دوسرے ہی لحہ میں اس کا سر زمین سے اُٹھا۔ دونوں ہاتھ رائفل پر اپنی اپنی جگہ

پہنچ گئے۔ انگلی نے گھوڑے کو تلاش کر لیا۔ دماغ، دل، نظر درست ہوگئی۔ ہوش و حواس صحیح ہوگئے۔ غنیم کے سوار کو گرفتار کر لینا ممکن نہ تھا اور ہوشیار کر دینا اپنی ہلاکت کا موجب۔ سپاہی کا فرض ظاہر تھا۔ جھاڑی کے اندر سے سوار کو ہدفِ بندوق بنا دینا چاہیئے۔ بغیر اطلاع کے، بغیر ایک لمحہ تیاری مرگ کے، بغیر ایک وقفہ دعائے آخری کے، اُس کو اِس خطرناک مخبری ورازجوئی کی سزا دینی چاہیئے۔ لیکن نہیں۔ ایک ذراسی اُمید باقی ہے۔ ممکن ہے اس نے کچھ نہ دیکھا ہو، ممکن ہے محض مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہونے کے لئے آیا ہو۔ اگر موقع دیا جائے تاأمّل کیا جائے تو وہ اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے گا۔ اور یقیناً اس کے اندازِ مراجعت سے ظاہر ہو جائے گا کہ کس نیت سے آیا تھا۔ اب کارٹر نے پھر مجسمۂ سوار و اسپ پر نظر جمائی اور اب کے نشانہ بنانے کے لئے گھوڑے کو تاکا۔ یکایک اس کے دماغ میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو اس کے باپ نے رخصت کے وقت کہے تھے کہ "ہر حالت میں وہی کرنا جو تمہارا فرض ہو"۔ ان الفاظ نے سکون پیدا کر دیا، دانت عزم و استقلال کے ساتھ بند ہوگئے۔ اعضا سوتے بچے کی طرح ساکن ہوگئے۔ نبض اصلی رفتار پر آگئی، سانس کی آمد و رفت میں باقاعدگی پیدا ہوگئی، فرض شناسی نے فتح پائی۔ روح نے جسم سے کہا: ٹھہر اور ساکن رہ۔ اور اس نے فیر کر دیا۔

کارٹر کی فوج کا ایک افسر جو تفریح کی غرض سے یا معلومات حاصل کرنے کے لئے کیمپ سے نکل کر مصروف سیر و گردش تھا، اِس پہاڑ کے قریب پہنچا۔ اور اسی لمحہ میں جب کارٹر نے فیر کیا افسر کی نظر اُٹھی۔ اور ایک حیرت ناک منظر نظر آیا۔ ایک شخص گھوڑے پر سوار فضائے آسمانی سے گذرتا ہوا وادی کی طرف جا رہا ہے۔ سوار سپاہیانہ وقار کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر جما بیٹھا ہے، لگام کو پوری قوت سے پکڑے ہوئے ہے کہ گھوڑا اِس ہبوط میں غیر ضروری عجلت سے کام نہ لے۔ برہنہ سر پر لمبے بال ہوا میں اُڑ رہے ہیں، داہنا ہاتھ گھوڑے کی اُٹھی ہوئی ایال کے بادل میں پوشیدہ ہے گھوڑے کا جسم ایسا ہموار ہے کہ گویا ہر قدم زمین پر پڑ رہا ہے۔

اس آسمانی سوار کے نظارے سے افسر پر اس درجہ حیرت و ہیبت طاری ہوئی کہ ٹانگیں قابو میں نہ رہیں

اور گر پڑا۔ تقریباً اسی لمحہ میں گہری وادی کے درختوں میں ایک آواز پیدا ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ افسر لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور اس نظارے پر خواب کا گمان کرتا ہوا کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اِس نے یہ سوچ کر کہ ایک ناقابلِ یقین واقعہ کو بیان کرنا اقرارِ حماقت ہے، سکوت اختیار کیا اور کسی سے کچھ نہ کہا۔

کارٹر ڈرونر نے فیر کرنے کے بعد رائفل کو پھر بھر لیا اور پاسبانی شروع کر دی مشکل سے دس منٹ گذرے ہونگے کہ اُس کی فوج کا ایک سارجنٹ آہستہ آہستہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل سرکتا ہوا اُس کے قریب پہنچا۔ کارٹر نے اُس کی طرف مطلق توجہ نہ کی اور بدستور بے حس و حرکت لیٹا رہا۔

"کیا تم نے فیر کیا تھا؟" سارجنٹ نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں"

"کس پر؟"

"ایک گھوڑے پر جو سامنے کی چٹان پر کھڑا تھا۔ دیکھو اب نظر نہیں آتا نیچے غار میں جا پڑا۔"

کارٹر کا چہرہ سفید تھا، لیکن اُس نے اپنے تلاطمِ جذبات کو چھپائے رکھا۔ جواب دے کر منھ پھیر لیا۔ سارجنٹ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک لمحہ سکوت کے بعد بولا:

ڈرونر، ادھر دیکھو، چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں حکم دیتا ہوں کہ رپورٹ دو۔ کیا گھوڑے پر کوئی سوار تھا؟"

"ہاں"

"کون؟"

"میرا باپ!"

سارجنٹ اُچھل پڑا۔ اور بے اختیار اُس کے مُنھ سے نکلا، "اللہ اللہ!" یہ کہا اور خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا۔

(مطبوعہ نگار لکھنؤ ۱۹۲۵ء)

تحفۂ محبّت

ایک (۱) ڈالر اور ۸۷ سینٹ بس یہی سرمایہ تھا۔ ان میں سے ۶۰ سینٹ پینی کی شکل میں تھے۔ ایک ایک دو دو پینی بنئے بقال قصاب کے سودے میں حجت و اصرار کر کے بچائی گئی تھیں جو بظاہر بخل و دنائت کی حد کو پہنچ گیا تھا۔ ڈیلا نے تین مرتبہ گنا۔ ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ۔ اور کل کرسمس کا دن ہے۔

اب سوا اس کے کیا چارہ تھا کہ ٹوٹے کوچ پر گر پڑے اور رونے لگے ڈیلا نے یہی کیا۔ معلوم ہوتا ہی کہ زندگی گریہ آہ۔ اور تبسم سے مرکب ہے جن میں آہ کو غلبہ و کثرت حاصل ہے۔

آٹھ ڈالر فی ہفتہ کرایہ کا مکان فقر و تنگدستی کا نمونہ تو نہ تھا لیکن عیش و راحت کی شان بھی نہ تھی دروازے پر لیٹر بکس لگا ہوا تھا لیکن خطوط سے ہمیشہ بے نیاز رہتا تھا۔ برقی بٹن بھی لگا ہوا تھا لیکن کوئی انسانی انگلی اس میں سے آواز پیدا نہ کر سکتی تھی ایک تختی بھی آویزاں تھی جس پر "مسٹر جیمس ڈلنگھم ینگ" کا نام لکھا ہوا تھا۔ سائن بورڈ کے نقوش کبھی روشن و نمایاں بھی رہ چکے تھے جب اس کے مالک کی آمدنی تیس ڈالر فی ہفتہ تھی۔ اب جبکہ یہ رقم بیس ڈالر رہ گئی تھی تو حروفِ اسم کی تابانی نے بھی مسمیٰ کی بے رونقی کا ساتھ دیا تھا۔

لیکن جب مسٹر جیمس ڈلنگھم ینگ دفتر سے گھر واپس آتا تھا تو مسز جیمس یعنی "ڈیلا" "جم" کہہ کر اُس کا استقبال کرتی تھی اور جم بادۂ محبت سے سرشار ہو کر خمارِ افلاس کو بالکل بھول جاتا تھا۔

ڈیلا رو دھو کر اُٹھی آنسو پونچھے اور کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ سوچنے لگی کل کرسمس ہے اور صرف ایک ڈالر اور ۸۷ سینٹ موجود ہیں۔ اور جم کے لئے بڑے دن کا تحفہ خریدنا ہے دیر تک غور کرتی رہی ان تھوڑے سے داموں میں کیا چیز آ سکتی ہے۔ چیز نفیس اور عمدہ ہو اور جم کے قابل۔ کھڑکیوں کے درمیان شیشہ لگا ہوا تھا۔ ڈیلا کو کچھ خیال آیا

اور دفعتاً شیشہ کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔ آنکھیں ایک خاص کیفیت کے ساتھ چمک رہی تھیں لیکن چہرے کا رنگ بیس سکنڈ ہی کے عرصہ میں فق ہو گیا۔ اس نے جلدی سے بال کھول کر چھوڑ دیئے اور شیشے میں دیکھنے لگی۔

اِن میاں بیوی کی ملکیت میں دو چیزیں تھیں جن پر دونوں کو بجا طور پر فخر و ناز تھا۔ ایک جم کی طلائی گھڑی جو باپ دادا سے ترکہ میں ملی تھی۔ دوسری ڈیلا کے بال۔ اگر ملکۂ سبا کا محل ڈیلا کے مکان کے مقابل ہوتا اور ڈیلا کھڑکی میں کھڑی ہو کر سکھانے کی غرض سے اپنے بال لٹکا دیتی تو ملکہ کا کوئی مرصع زیور اُن کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ اور اگر حضرت سلیمان اپنا بیش قیمت خزانہ نکال کر بیٹھتے اور جم ادھر سے گزرتے وقت جیب سے اپنی گھڑی نکال کر دیکھتا تو ہر مرتبہ گھڑی کو دیکھ کر حضرت اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتے۔

ڈیلا کے خوبصورت بال اس کے جسم کے گرد لٹکے ہوئے تھے گویا سنہرے پانی کا دریا موجیں مار رہا ہے۔ بال ڈیلا کے زانو سے نیچے تک پہنچتے تھے اور اس کے لئے لباس کا کام دیتے تھے۔ اس نے جلدی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بالوں کو لپیٹ کر باندھ لیا۔ ایک منٹ کے لئے ٹھٹکی، خاموش کھڑی رہی اور ایک دو قطرہ اشک میلی سُرخ دری پر ٹپک پڑے۔ لیکن یہ حال صرف ایک لمحہ کا تھا۔ دوسرے لمحہ میں میلی جیکٹ اور پرانی ٹوپی پہن زینہ سے اُتری اور سڑک پر آگئی۔ اور ایک طرف کو روانہ ہو گئی۔ چلتے چلتے جس دوکان پر ٹھہری اُس پر آویزاں تھا۔

میڈم سوفرونی

بالوں کا بنا ہوا ہر قسم کا سامان

ڈیلا زینہ پر چڑھی اور ایک عورت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور پوچھا۔

”میرے بال خرید و گی“؟

”میں یہی کاروبار کرتی ہوں۔ ہیٹ اُتار دکہ ایک نظر دیکھ لوں“

آن واحد میں چمکدار سنہرے بالوں کا دریا لہرانے لگا۔

میڈم نے ماہرومشاق ہاتھوں میں بالوں کو لے کر کہا "بیس ڈالر"

ڈیلا نے فوراً کہا "جلد عنایت کرد۔"

آئندہ دو گھنٹے ڈیلا نے جم کے لئے تحفہ تلاش کرنے میں صرف کئے۔ تمام اسٹور چھان مارے۔ ساری دوکانیں دیکھ ڈالیں آخر تحفہ مل گیا۔ وہ تحفہ جو گویا جم ہی کے لئے بنا تھا۔ یعنی گھڑی کا چین پلٹینم کا بنا ہوا۔ قیمتی۔ نفیس۔ نازک۔ جس کے بیش قیمت ہونے کے لئے قیمتی دھات کا نام ہی کافی تھا۔ یہ چین جم کی گھڑی کے لئے نہایت موزوں تھا۔ ڈیلا دیکھتے ہی پھڑک گئی۔ یہ چیز جم کے قابل ہے۔ سادہ دگراں بہا جیسا جم ہے ویسا ہی یہ چین بھی ہے۔ اکیس ڈالر چین کی قیمت طلب کی گئی۔ فوراً ادا کردی اور ۸۷ سینٹ لیکر گھر چلی آئی۔ یہ چین گھڑی میں لگا ہوگا تو جم ہر جلسے میں بار بار وقت دیکھنے کے لئے بے چین ہوگا۔ گھڑی اس قدر بیش قیمت اور شاندار تھی کہ چمڑے کے تسمہ سے جم کو ندامت ہوتی تھی۔

ڈیلا گھر پہنچی روشنی کی۔ اور زلف پیچ سلاخ آہنی نکال کر اس نقصان کی تلافی میں مصروف ہوگئی جو فیاض محبت نے اس کی صورت میں پیدا کردیا تھا۔ چالیس منٹ کی محنت سے اس کے سر پر چھوٹے چھوٹے گھونگر نظر آنے لگے اور وہ اسکول سے بھاگا ہوا لڑکا معلوم ہونے لگی آئینہ میں اپنی شکل دیکھی اور دیر تک نقادانہ نگاہ سے دیکھتی رہی پھر دل میں کہنے لگی "اگر جم دوسری نگاہ ڈالنے سے پہلے مجھے ہلاک نہ کردے تو کہے گا کہ میں جزیرہ کونی کی رقاصہ لڑکی معلوم ہوتی ہوں لیکن میں کیا کرسکتی تھی۔ ایک ڈالر، ۸۷ سینٹ میں کیا ہوسکتا تھا۔

جم ہمیشہ وقت پر گھر پہنچتا تھا۔ ڈیلا نے چین مٹھی میں دبالیا اور دروازے کے قریب میز کے سامنے بیٹھ گئی۔ زینہ پر جم کے پاؤں کی آہٹ سنی اور ایک لمحہ کے لئے اس کا رنگ سفید ہوگیا۔ اس کی عادت تھی کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لئے بھی دل ہی دل میں دعائیں مانگا کرتی تھی۔ اس وقت اس نے کہا "خدایا۔ اس کے دل میں ڈال دے کہ میں اب بھی خوبصورت ہوں۔"

دروازہ کھلا۔ جم داخل ہوا۔ اور کواڑ بند کر دیئے۔ وہ خلاف معمول مضمحل تھا۔ آہ! صرف بائیس سال کی عمر اور

متاہل زندگی کے انکار! اس کو نئے اور کوٹ کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس دستانے بھی نہ تھے۔ جم نے اندر قدم رکھا اور اُس کی آنکھیں ڈیلا پر جم گئیں۔ آنکھوں سے کچھ ایسا مضمون ظاہر ہوتا تھا کہ ڈیلا مطلق نہ پڑھ سکی اور ڈرسی گئی۔ جم کے چہرے پر نہ غصہ تھا نہ تعجب۔ نہ ملامت نہ خوف۔ کوئی ایسا جذبہ نہ تھا جس کے لئے ڈیلا پہلے سے تیار تھی۔ صرف نگاہیں ڈیلا پر جمی ہوئی تھیں اور چہرے کا خاص انداز تھا۔

ڈیلا میز سے اُٹھی اور اُس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "پیارے جم! اس طرح نہ دیکھو۔ میں مجبور تھی۔ بال کٹوا دیئے اور بیچ ڈالے کیونکہ ممکن تھا کہ کرسمس گزر جائے اور تمہیں تحفہ نہ دوں۔ بال پھر بڑھ جائیں گے۔ ان کا خیال نہ کرو۔ کیوں پیارے! خفا ہو۔ میرے بال تو بہت جلدی بڑھتے ہیں۔ جم! کرسمس کی مُبارکباد دو اور خوش ہو۔ تمہیں خبر نہیں میں تمہارے لئے کیا نفیس تحفہ لائی ہوں۔"

جم بڑی مشکل سے بولا "بال کٹوا دیئے؟" معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اس قدر غور و تامل کے وہ ابھی اس حقیقت تک نہ پہنچ سکا تھا۔

"کٹوا دیئے اور بیچ ڈالے۔ کیا میں یوں خوبصورت نہیں معلوم ہوتی؟ بغیر بالوں کے بھی میں میں ہی ہوں۔ نہیں ہوں؟"

تم کہتی ہو کہ بال نہیں رہے"؟ جم کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اب تک کچھ نہیں سمجھا۔

ڈیلا بولی "اب بالوں کو کیا ڈھونڈھتے ہو۔ وہ تو بیچ دیئے گئے۔ میں کہتی ہوں کہ بال رخصت ہوئے۔ آج کرسمس کی شام ہے۔ پیارے خوشی مناؤ۔ بال تمہارے ہی لئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ میرے سر کے بال شمار کئے جا سکیں۔ لیکن میری محبت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جم کھانا پکاؤں؟"

جم کی وہ کیفیت یکایک دور ہو گئی۔ اور اس نے جلدی سے ڈیلا کو سینے سے لگا لیا۔ دس سکنڈ کے لئے ہم دوسری طرف نظر پھیر لیتے ہیں۔ آٹھ ڈالر فی ہفتہ ہوں یا دس لاکھ سالانہ۔ حساب محبت کی رو سے ان میں کچھ فرق نہیں۔ ریاضی داں فرق بتائے گا۔ لیکن اس کی رائے سطحی ہے اور غلط۔

جم نے اور کوٹ کی جیب سے ایک پیکٹ نکالا۔ اور میز پر ڈال کر بولا "ڈیل! میری نسبت کسی قسم کی غلط فہمی نہ کرو۔ بالوں کا کٹنا، منڈنا۔ چھوٹا ہونا اور بڑا ہونا سب برابر ہے۔ میری محبت ایسی نہیں جو ان باتوں سے کم ہو جائے۔ لیکن تم اس پیکیٹ کو کھولو گی تو معلوم ہوگا کہ میں پہلے کیوں کھویا گیا تھا۔"

خوبصورت۔ سفید۔ تیز انگلیوں نے دوڑے اور کاغذ کو توڑ کر پھینک دیا۔ پیکٹ کا کھلنا تھا کہ ڈیلا کے منھ سے فرطِ مسرت سے ایک چیخ نکلی۔ اور اس کے بعد گریۂ نسائیت شروع ہو گیا جس کی تسکین کے لئے شوہر کو انتہائی قوتِ محبت صرف کرنی پڑی۔ پیکٹ کے اندر کنگھے تھے۔ پہلو و پشتِ سر کے کنگھوں کا سٹ۔ خوبصورت تیل کا بنا ہوا۔ کناروں پر مرصع کار۔ ڈیلا کے حسین بالوں کے لئے کس قدر موزوں تھا۔ ڈیلا کو مدت سے ان کی تمنا تھی۔ بارہا دوکانوں پر دیکھ کر اس کے دل میں شوق و آرزو کا دریا اُمڈا۔ لیکن تنگدستی نے مجبور رکھا۔ اب کنگھے میسر آئے تو بال نہ رہے۔ اس نے بے اختیار کنگھوں کو سینے سے چمٹا لیا اور دیر تک پیار کی نگاہوں سے دیکھتی رہی دیر کے بعد چشم پُرنم اور تبسم برق دم کے ساتھ نظر اُٹھا کر کہا "جم میرے بال بہت جلدی بڑھ جاتے ہیں۔"

اتنے میں یکایک اُچھل کر کھڑی ہوگی اور بے اختیار زبان سے نکلا "او ہو!"

جم نے اپنا خوبصورت تحفہ نہیں دیکھا تھا ڈیلا کی مُٹھی ہی میں دبا ہوا تھا۔ ہاتھ کھول کر جم کو چین دکھایا معلوم ہوتا تھا کہ اس بے نور دھات میں ڈیلا کے جوش و شوق سے روشنی پیدا ہو گئی۔ چین دکھا کر بولی۔

"جم کیسا خوبصورت ہے۔ میں نے اس کی تلاش میں تمام شہر چھان مارا۔ اب تم سو سو بار وقت دیکھا کرو گے لاؤ گھڑی دو۔ دیکھوں اس میں کیسا معلوم ہوتا ہے۔"

گھڑی دینے کے بجائے جم کوچ پر گر پڑا۔ اور سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر مسکرا کر کہنے لگا۔

"ڈیل! ہم کو اپنے اپنے تحفہ کچھ عرصے کے لئے رکھ چھوڑنے چاہئیں۔ یہ اتنے نفیس اور اعلیٰ ہیں کہ ابھی استعمال نہیں ہو سکتے۔ میں نے تمہارے کنگھے خریدنے کے لئے گھڑی بیچ دی۔ اچھا اب کھانا پکاؤ۔"

(مطبوعہ نگار لکھنؤ اگست ۱۹۲۶ء)

شام کا وقت ہے۔ دن میں بوڑھے جانی وہائٹ کی تجہیز وتکفین ہو چکی ہو۔ ایلزبتھ گھر میں آتشدان کے سامنے بیٹھی سوچ رہی ہو کہ اب زندگی کے دن کیونکر کٹیں گے۔ وہ رفیق جو شادی کے دن سے پچاس سالہ تاہل زندگی میں ایک دن کے لئے بھی اس کی نظر سے اوجھل نہ رہا تھا ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ اس کو اس بات کے تصور سے اور بھی اذیت تھی کہ یہ چھوٹا سا گھر اور مختصر سا کھیت اسی ہفتہ کے آخر تک فروخت کر دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ یہ ذراسی جائداد ایک بے ایمان و دغاباز عزیز کی ضمانت میں مکفول ہے۔ اصل زرِ ضمانت ۲۵ پونڈ تھا۔ لیکن لیوک فلنٹ موچی نے جس سے یہ رقم قرض لی گئی تھی شرط کر لی تھی کہ تا ادائے قرض پچاس فی صدی سود دینا پڑیگا۔ رفتہ رفتہ سود کی رقم کھیت اور مکان کی قیمت سے بھی بڑھ گئی اور جان اس صدمہ سے دل شکستہ ہو کر مر گیا۔

ایلزبتھ نے تمام ہمسایوں کو رخصت کر دیا تھا۔ چاہتی تھی کہ جتنے دن اس مکان میں گزریں تنہا رہے اور یاد ایام رفتہ میں وقت گزارے۔ وہ دنیا میں تنہا تھی۔ اس مصیبت میں کوئی اُس کا شریک نہ تھا۔ لیکن حالات اِس درجہ یاس افزا تھے کہ آنکھوں میں آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔

اس نے آپ ہی آپ کہنا شروع کیا "جانی پیارے! وہ منظر اس وقت میری نظر کے سامنے ہے جب شادی کے روز تم میرے ساتھ گرجا سے واپس آ رہے تھے۔ گاؤں بھر میں ایسا خوبصورت جوان نہ تھا۔ لیکن جب تم اپنے کفن میں بھی جب تمہارے رخسار زرد اور بال سفید ہو گئے تھے ایسے ہی حسین تھے۔ کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلی جاتی! جب میں اپنی مسرور زندگی کا تصور کرتی ہوں۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ تم باوجود اس قدر حسین ہونے کے بھی کہا کرتے تھے کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ میں جو کچھ کرتی تھی ہمیشہ اُس کی تعریف ہی کیا کرتے تھے۔ تو میری

حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی ہے۔ آہ اب میں اِس گھر سے جہاں اس قدر پُر لطف زندگی گذری ہے نکالدی جاؤں گی یہ نہایت سخت بات ہے! نہایت روح فرسا ہے۔

وہ اِسی تصور میں محو تھی کہ کمرے کے کواڑ کھلے اور قرض خواہ لیوک فلنٹ موچی داخل ہوا۔ وہ نہایت کریہ منظر شخص تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی آتش دان کی طرف بڑھا اور بغیر انتظار اجازت کے اِس آرام کرسی پر بیٹھ گیا جس پر ہمیشہ جانی دہائٹ بیٹھا کرتا تھا۔ ایلزبتھ غضب ناک ہو کر اُٹھی۔ اُس کا دُبلا کمزور چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بے دانت کا جبڑا حرکت کرنے لگا۔ اُس نے کہا "میں شکر گزار ہوں گی اگر تم اس کرسی پر سے اُٹھ جاؤ گے اس پر ہمیشہ ایک ایمان دار آدمی بیٹھا کرتا تھا۔ اور میں کسی دوسرے شخص کو اس پر بیٹھا نہیں دیکھ سکتی اگر بیٹھنا ہی ہے تو اِس اسٹول پر بیٹھ جاؤ"۔

موچی تعمیل کرنا نہ چاہتا تھا لیکن ایلزبتھ کی شکل ایسی پُر غضب تھی کہ وہ اُٹھ کر دوسری طرف جا بیٹھا اور بولا "ایلزبتھ وہائٹ اِس قدر بد مزاجی کی ضرورت نہیں یہ مکان عنقریب میرا ہونے والا ہے۔ میں اسکو خریدنے والا ہوں اور تم اس دروازے پر آکر بھیک مانگو گی"۔

"میں بھوکوں مرجاؤں گی لیکن تم سے بھیک نہ مانگونگی۔ اِن بیہودہ باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم اِس جگہ سے کوئی چیز نہیں لے جاسکتیں۔ میں اپنی دستاویز کی رو سے تمام چیزیں نیلام کرا سکتا ہوں۔ اگر تم نے کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو تم ہو اور جیل خانہ!"

"میں بہت خوش ہوں گی جب تمہارے قرضہ سے سبکدوش ہو جاؤں گی۔ تمہاری زندگی کا انحصار ہی ایسے لوگوں کو دھوکا دینے پر ہے۔ جیسا میرا جان تھا سیدھا سادھا بھولا بھالا۔ مجھے یقین ہے کہ قانون تمہاری حمایت نہ کرے گا"۔

یہ سُن کر فلنٹ کا رنگ اوّل سفید پڑ گیا۔ لیکن پھر سُرخی جھلک آئی اور بولا۔
"ایلزبتھ دہائٹ تم قانونی چارہ جوئی کر دیکھو۔ میرا بال تک بیکا نہیں ہو سکتا۔ تمہارے شوہر نے قرضہ

کی تحریر لکھ دی ہے اور بصورت عدم ادائے قرض مجھے اختیار ہے کہ اس زمین کو نیلام کرا دوں۔ میں اس کو زمین کہتا ہوں! صرف چند ایکڑ ہیں جس پر گھاس کا پتہ نہیں۔ اس سے تیس پونڈ بھی وصول نہ ہوں گے۔ اور یقین ہے کہ تمام فرنیچر دس پونڈ کا بھی نہ ہو گا۔ پھر بھی تم میری قرضدار رہو گی جس کے بدلے تم کو جیل جانا پڑے گا۔ اور میں اپنی باقی رقم کو صبر کر لوں گا۔"

"میں تمہارے مقروض رہنے کے مقابلہ میں دو سو بار جیل خانہ جانا پسند کرتی ہوں۔ لیکن جب تک اس گھر میں بیٹھی ہوں تمہاری دھمکیاں نہیں سُن سکتی۔ چلے جاؤ بدمعاش آدمی! نکل جاؤ!"

ایلزبتھ نے دروازہ کھولا۔ اور فلنٹ کو جانے کا اشارہ کیا۔ رات تاریک تھی۔ بادِ خزاں سوکھی پتیوں میں حرکت پیدا کر کے منظر کو وحشتناک بنا رہی تھی۔

فلنٹ نے جواب دیا "بوڑھی چڑیل! تجھے اس حرکت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ جب تو اس مکان سے جیل خانہ جانے لگے گی تو میں لوگوں کو تیرے پیچھے لگا دوں گا جو تجھے دیکھ کر قہقہہ لگائیں گے۔"

"یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن ایلزبتھ کے لکڑی اُٹھا لینے سے اُسکی رفتار تیز ہو گئی۔

"جب تک میں اس مکان کی مالک ہوں تمہاری یہ باتیں گوارا نہیں کر سکتی۔ جان قرضہ سے زیادہ روپیہ ادا کر چکا ہے۔ چلو دفع ہو یہاں سے! اللہ اس مردود کو اسی رات میں سزا دے! کم بخت اگر تیری ناپاک ہستی نہ ہوتی تو ابھی برسوں مجھے سوگ میں بیٹھنا نہ پڑتا۔ میری عادت نہیں کہ کسی کو بد دُعا کر دوں۔ لیکن تجھے جو کچھ سزا ملے مناسب ہے۔"

فلنٹ دروازے سے نکل گیا۔ ایلزبتھ نے پھر کواڑ بند کر لئے اور اپنی جگہ بیٹھ کر پھر انھیں اندوہناک تصورات میں محو ہو گئی۔ فلنٹ اندھیری رات میں ایک سمت کو روانہ ہو گیا۔ ایلزبتھ کے غضبناک انداز نے اس کے اعصاب پر خاص اثر کیا تھا۔ اور اس وقت اُس کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"بیشک یہ کوئی چڑیل ہے۔ جادوگرنی ہے۔ آنکھیں کیسی سُرخ تھیں۔ یہ میرے پر دادا کے وقت میں ہوتی

لوگ اس کو دیکھ کر ڈرا کرتے۔"

فلنٹ کی رفتار یکایک رُک گئی اور اُس کو یہ معلوم ہوا کہ کوئی چیز پیچھے سے اس کی پیٹی کو پکڑ کر اوپر کی طرف اٹھا رہی ہے۔ اس ناگہانی آفت سے حواس گم ہوگئے غور کیا تو دیکھا کہ وہ زمین سے بلند ہو کر درختوں کی چوٹی کے برابر پہنچ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر اُس کے مُنھ سے چیخ نکل گئی، "دوڑو! لوگو دوڑو! مجھے بھوت نے پکڑ لیا۔ دانتوں میں پکڑے ہوئے دوزخ میں ڈالنے کے لئے لے جا رہا ہے۔"

لیکن رات زیادہ گزر چکی تھی۔ گاؤں والے نیند میں غافل تھے۔ کون سنتا اور کون دوڑتا۔ فلنٹ برابر اوپر کو اُٹھا جا رہا تھا۔ کوئی جن دانتوں میں دبائے دریا کی طرف لے جا رہا تھا۔ اب فلنٹ نے کہنا شروع کیا۔

"اے خدا مجھے معاف کر۔ مجھے معاف کر۔ میری توبہ ہے۔ آئندہ بے گناہوں کو نہ ستاؤں گا۔ خدایا اگر تو اس مرتبہ مجھ پر رحم فرمائے تو میں اپنے ظلم کی تلافی کر لوں گا۔"

دُعا فوراً مقبول ہوگئی اور وہ جن کے پنجہ سے چھوٹ کر دھم سے دلدل میں گر پڑا۔ دیر تک بیہوش پڑا رہا۔ جب حواس بجا ہوئے تو بڑی مشکل سے نکل کر سڑک پر آیا۔ اور بجائے اپنے گھر کے ایلزبتھ کی طرف چلا۔ آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایلزبتھ کرسی پر سو گئی تھی۔ کھٹکے سے اُٹھی اور دروازہ کھولا۔ اس وقت نیم روشن کمرے میں اس کی ہیبت پہلے سے بھی زیادہ دہشت انگیز نظر آتی تھی۔ فلنٹ کو دیکھ کر بولی۔

"تم پھر آگئے؟ جاؤ۔ اتنی رات گئے کیا کام ہے؟"

فلنٹ کانپ رہا تھا۔ بولا۔

"ایلزبتھ دہائٹ کاغذ لاؤ میں تمہیں قرضہ سے معافی لکھ دوں۔ تم بہت بُری عورت ہو۔ میں آئندہ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔"

ایلزبتھ نے قلم دوات کاغذ سامنے رکھ دیا۔ اور کہا "معلوم ہوتا ہے تمہارے ضمیر نے ملامت کی۔ جو لکھنا ہے لکھ دو اور رخصت ہو۔"

فلنٹ نے قلم اٹھایا اور لکھا "میں لیوک فلنٹ اِس تحریر کے ذریعہ سے ایلزبتھ دہاٹ کو اُس کے شوہر کا قرضہ معاف کرتا ہوں۔ اور اُمید کرتا ہوں کہ آیندہ مجھ سے کوئی کینہ نہ رکھے گی۔"

کاغذ عورت کو دے کر رخصت ہوا۔ اور دل میں بہت خوش تھا کہ آج ایک بڑی بلا سے نجات ملی۔

دو روز کے بعد فلنٹ پھر ایلزبتھ کے پاس آیا اور کہا "وہ تحریر مجھے واپس دیدو۔ تم بڑی ایماندار عورت ہو۔ ضرور دے دوگی۔ میرا خیال تھا کہ تم جادوگرنی ہو اور تم نے کوئی جادو مجھ پر کردیا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ اُس رات کو ایک ہوائی جہاز کا کانٹا میری پیٹی میں اٹک گیا تھا۔ جس کے زور سے میں اوپر کو اٹھتا چلا گیا۔ وہ ہوائی جہاز اشتہارات تقسیم کرتا جارہا تھا۔ رات ہوگئی اور مشین کچھ بگڑ گئی۔ جہاز والے کہیں اُترنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کانٹا لٹکا دیا تھا کہ کسی مضبوط چیز میں اٹک جائے تو نیچے اُتر جائیں۔ لاؤ وہ کاغذ میرے حوالہ کردو۔ تم بڑی خوش معاملہ عورت ہو۔ مجھے یقین ہے کہ انصاف سے کام لوگی۔"

ایلزبتھ نے پھر وہی لکڑی اُٹھائی اور کہا "میں تمہاری کمر دُہری کردوں گی اگر فوراً نہ چلے جاؤگے۔ تم نے مجھے جادوگرنی سمجھا تھا۔ لیکن بیوقوف نہ سمجھنا۔"

(مطبوعہ نیرنگ رام پور ۱۹۲۶ء)

خورد بین سے سراغ رسانی

۱۱ اکتوبر

سنہ ۱۹۲۳ء میں ایک شب کو کیلی فورنیا کی سرحد کے قریب سدرن پنا ما اکسپرس ٹرین نمبر ۱۳ اُس سرنگ کے اندر سے گزر رہی تھی۔ ابھی سرنگ میں داخل ہی ہوئی تھی کہ چند ڈاکوؤں نے انجینیر اور فائرمین کو ریوالوروں سے گھیر لیا۔ انجینیر کو ٹرین کے۔ روکنے پر مجبور کیا اور ان دونوں آدمیوں کو وہیں ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد ڈاک کے درجہ کا ایک حصہ ڈائنامیٹ سے اُڑا دیا جس سے میل کلرک ہلاک ہوگیا اور پھر بریک مین کو بھی گولی مار دی۔ جس وقت پولیس موقع واردات پر پہنچی قزاق پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ لیکن اپنے ساتھ سامان غارت نہ لے جاسکے۔ چار بے گناہ ہلاک ہوئے۔ اور قاتلوں کی نشانی صرف تین ذرے نمک کے ملے۔

موقع واردات پر کرنج کا ایک غلاف ملا۔ جو قزاقوں میں سے کسی ایک شخص کے جوتے پر چڑھا ہوا ہوگا۔ غلاف پر انجیر سے تیار کیا ہوا روغن ملا ہوا تھا۔ ایک مشہور سراغرساں ایڈورڈ آسکر ہین رچ معلم کیلی فورنیا یونیورسٹی نے خوردبین کے ذریعہ سے اس غلاف کا معائنہ کیا اور اس میں نمک کے صرف تین ذرے دریافت کئے۔ اور اپنی قوتِ استقرار سے قیاسات ترتیب دے کر اس عجیب و حیرت انگیز نتیجہ کا اعلان کیا۔

"مجرموں میں سے ایک شخص کے بال بھورے ہیں بائیں ہاتھ سے زیادہ کام کرنے کا عادی ہے۔ عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہیں۔ تقریبًا پانچ فٹ آٹھ انچ قد ہے۔ اپنی عادات میں صفائی پسند ہے ڈاڑھی مونچھیں بالکل صاف رکھتا ہے۔ حال میں نارتھ ویسٹرن اوریگن یا ویسٹرن واشنگٹن میں اُن کیمپوں میں کام کرتا رہا ہے جہاں انجیر کے درخت گرائے گئے ہیں۔"

بڑے بڑے تجربہ کار سراغرسانوں کو ان قیاسات و نتائج کی صحت کا یقین نہ آیا۔ لیکن واقعات نے انکو

درست ثابت کردکھایا۔ اس لئے کہ محض اسی بیان کی مدد سے متواتر چار سال تک دنیا کے مختلف ممالک میں تفتیش کرنے کے بعد آخر تینوں قزاق (جن کے نام ہف۔ رے۔ راتے ہیں) گرفتار ہوئے اور آجکل مقام سیلم میں حبس دوام کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہف جس پر سراغرسانی کا مجوزہ حلیہ وحال بالکل صادق آیا۔ اسی سال نیلا میں فوجی ملازمت کی حالت میں گرفتار ہوا ہے جون میں اس کے دو توام بھائی گرفتار کئے گئے۔ انھوں نے حادثہ ٹرین میں اپنی شرکت کا اقبال کیا قتل کا ملزم ہف ہی کو قرار دیا۔

یہ تمام سراغرسانی صرف تین ذرات نمک کا نتیجہ تھی! کس درجہ عجیب و ناممکن بات نظر آتی ہے! اب اس کا امکان سنئے۔ تجزیۂ کیمیائی سے ہین رچ کو معلوم ہوا کہ یہ نمک اسی قسم کا ہے جیسا مویشیوں کی دوا کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس اشارہ کی مدد سے اس نے مختلف مویشی خانوں کا معائنہ کیا اور ایک مویشی خانہ کے قریب تہ خانہ کے اندر ایک کوٹھری ملی اس میں اس کرتے کے چند ٹکڑے پائے گئے جس سے وہ جوتہ کا غلاف بنایا گیا تھا۔ جو مقام واردات پر ملا تھا۔ ان ٹکڑوں پر ویسا ہی روغن انجیر ملا ہوا تھا۔ اور اس قسم کے درخت انجیر اس مقام پر موجود بھی تھے۔ اس کوٹھری میں ایک تولیہ ملی جس پر ڈاڑھی مونڈنے کے بعد بالوں کو صاف کرنے کے نشانات پائے گئے۔ بالوں کو خوردبین سے معائنہ کرنے پر دریافت ہوا کہ اس تولیہ سے تین آدمیوں نے منھ صاف کیا ہے اب بالوں کا اس فہرست سے مقابلہ کیا گیا جس میں مختلف عمروں میں بالوں کے تغیرات و اختلافات درج ہوتے ہیں۔ اس سے دریافت ہوا کہ ان تینوں میں سے کوئی شخص ۲۵ سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تولیہ پر رخسار کی جلد کے بھی چند ٹکڑے ملے اور ان سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ لوگ ہلکی رنگت اور غالباً لاطینی نسل کے ہیں۔

موقع واردات کو دوبارہ معائنہ کرنے سے ایک کپڑا ملا جس کو ملبوس کے اوپر پہنتے ہیں۔ اس کی جیبوں سے کچھ اور ذرات نمک حاصل ہوتے اور روغن کے دھبے بھی نظر آئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ انکو صرف ایک ہی شخص نے استعمال کیا ہے۔ یہ بھی دریافت ہوا کہ وہ لوگ ہیزم کش ہیں۔ اس ملبوس کی پیمائش و قطع سے ہین رچ سراغرساں نے پہننے والے کا قد دریافت کرلیا اور اس پر جو دھبے لگے ہوتے تھے ان سے قیاس کیا گیا کہ پہننے

والا بائیں ہاتھ سے کام کرتا ہے۔ کچھ ترشے ہوئے ناخن بھی پائے گئے اور ان سے ثابت ہوا کہ وہ شخص صفائی پسند بھی ضرور ہے۔

اِس ملبوس کی ایک جیب میں بگل ملا۔ اور معلوم ہوا کہ اسی جیب میں ریوالور بھی رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی کوٹھری کے قریب ایک ریوالور بھی چھپا ہوا ملا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ ریوالور اوریگین کے ایک تاجر نے واردات سے کچھ عرصہ قبل ایک شخص ولیم ایلیٹ کے ہاتھ فروخت کیا تھا ریوالور کی نال کے نشانات سے گولیوں کے نشانات کا مقابلہ کیا گیا۔ اور ثابت ہو گیا کہ آلۂ قتل بھی ریوالور تھا۔ ولیم ایلیٹ کا سُراغ یوجین کے ایک چھوٹے سے مکان میں ملا۔ جہاں ان بھائیوں کا باپ رہتا تھا معلوم ہوا کہ نام فرضی ہے۔ اسی مکان میں چند بال اور کپڑوں کے ٹکڑے اور انگلیوں کے نشانات ملے۔ ان سے ان قیاسات کی صحت میں کوئی شبہہ نہ رہا۔

تینوں بھائیوں کی تصویریں اور حلیے تمام ریاستہائے امریکہ و دیگر ممالک میں بھیجدیئے گئے۔ انعام کا اعلان کیا گیا مہینے گزر گئے اور کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر ایک روز منیلا کے مقام پر ایک سارجنٹ نے ایک فوجی سپاہی پر اس حلیے کو مطابق پایا۔ چپکے سے اُس کے پاس گیا اور اُس کے ہتھیار اُتار لئے اور حوالات میں بھیجدیا۔ سپاہی ہغ تھا۔ چند ماہ بعد رے اور راے بھی بمقام اوہیو گرفتار ہو گئے۔

(مطبوعہ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۷ء)

مسہری کا راز

میں کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے ایک انگریز دوست کے ساتھ پیرس میں بغرض سیر و تفریح مقیم تھا۔ ہم دونوں جوان تھے اور اس پُر لطف شہر میں آزاد و بے پرواز زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک رات کو ہم پیلے رائل کے قریب ٹہل رہے تھے۔ اور سوچتے تھے کہ اس وقت کیا ذریعہ لطف و مسرت پیدا کیا جائے۔ میرے دوست نے رائے دی کہ فریسکیٹی کے قمار خانہ میں چلنا چاہئے۔ لیکن یہ تجویز مجھے پسند نہ آئی۔ مجھے فریسکیٹی بقول فرانس داوں کے حفظ تھا۔ بارہا وہاں کھیلا، ہارا اور جیتا حتیٰ کہ اس سوسائٹی میں کوئی لطف باقی نہ رہا۔ وہاں کے فیشن ایبل آداب و قواعد سے جی اُکتا گیا تھا۔ میں نے کہا: خدا کے لئے وہاں جانے کا نام نہ لو۔ اب تو ایسی جگہ چلو جہاں سوسائٹی کا اصلی رنگ نظر آئے جو ان کی سادگی فطرت کا آئینہ ہو آج مفلسوں کے قمار خانہ کی سیر کریں گے جہاں کوئی یہ بھی دیکھنے والا نہ ہو کہ انسان کے جسم پر کوٹ بھی ہے یا نہیں۔" میرے دوست نے کہا بہت اچھا۔ اس کام کے لئے پیلے رائل کے حدود سے باہر نکلنے کی بھی ضرورت نہیں ایسا "سیاہ خانہ" ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ دوسرے منٹ میں ہم قمار خانہ کے دروازے پر تھے۔ ہیٹ اور چھڑی دربان کے سپرد کر کے زینہ پر چڑھے اور اطاق قمار میں داخل ہو گئے۔ وہاں کچھ بہت سے آدمی نہ تھے لیکن جتنے تھے سب اپنی جنس کے لئے فصل تھے۔ ہر نوع کے افراد کمرے میں موجود تھے۔

ہم سیاہ خانہ کو دیکھنے گئے تھے۔ لیکن کچھ اس سے بھی بدتر نکلا۔ ہر سیاہ کاری کا ایک پُر لطف پہلو بھی ہوتا ہے لیکن یہاں صرف غم انگیز وحشت زا پہلو نمایاں تھا۔ کمرے کی خاموشی حد درجہ وحشت خیز تھی۔ ایک لاغر دراز مو نوجوان جو اپنی دھسی آنکھوں سے تاش گردانی کو دیکھ رہا تھا بالکل خاموش تھا۔ کثیف بوڑھا آدمی جس کی آنکھیں

گہری سی تھیں اور جس کا اور کوٹ رفو شدہ تھا اور سب کچھ ہار چکنے کے بعد مایوسی کی نگاہ سے کھیل کو دیکھ رہا تھا بالکل خاموش تھا۔ ہوٹا بعد اتمار باز جو ایک بورڈ پر لکھتا جاتا تھا کہ سُرخ رنگ نے کس قدر جتیا اور سیاہ رنگ نے کس قدر، بالکل خاموش تھا۔ خود خزانچی کی آواز بھی کمرے کی فضا کے اثر سے مدہم اور بھرائی ہوئی تھی میں ہنسنے ہنسانے کے لئے گیا تھا لیکن یہ نظارہ گریہ انگیز تھا۔ آخر میں بھی اس رنگ سے متاثر ہو کر میز پر گیا اور کھیلنا شروع کر دیا۔ میری بدقسمتی کہ پہلی ہی بار کامیابی ہوئی۔ جتیا اور برابر جیتنے لگا۔ ہر بازی میں میری جیت تھی۔ مجھے اس رفتار سے مسلسل جیت ہوئی کہ تمام مشاق کھلاڑی میری میز کے گرد آکھڑے ہوئے۔ اور ہر بازی اور ہر شرط کو بیتاب و متعجب نگاہوں سے دیکھنے لگے اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ انگریز آج بینک کا دیوالہ نکال دے گا۔

میں بار ہا کھیلا ہوں، یورپ کے ہر شہر میں کھیلا ہوں۔ لیکن اسرار قمار بازی پر کبھی غور نہیں کیا حقیقت یہ ہے کہ میں اصلی معنوں میں قمار باز کبھی نہ تھا۔ میں قمار بازی کے شوق میں کبھی نہیں کھیلا۔ میرے لئے یہ شغل بھی محض ایک کھیل اور تفریح تھی اور بس۔ میں احتیاج کے سبب سے کبھی قمار کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ اس لئے کہ مجھے خبر ہی نہ تھی کہ احتیاج کیا چیز ہے۔ میں نہ کبھی اتنا کھیلا کہ مقدرت سے زیادہ ہار جاؤں۔ نہ کبھی اس قدر جتیا کہ جیبوں کے وزن کے سبب سے اپنا توازن جسم قائم نہ رکھ سکوں میں قمار خانہ میں اسی طرح جاتا تھا جیسے ناچ گھر یا تھیٹر میں۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ اس سے مجھے تفریح ہوتی تھی اور وقت گزارنے کے لئے اس سے بہتر ذریعہ موجود نہ تھا۔

لیکن اس مرتبہ کیفیت ہی اور تھی۔ اس وقت مجھے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ جنون قمار بھی ایک چیز ہے۔ اپنی کامیابیوں سے اول اول تو مجھے حیرت و مسرت ہوئی اور اس کے بعد میں لفظی معنوں بالکل مخمور و مسحور ہو گیا۔ یہ بات ناقابلِ یقین نظر آئے گی لیکن واقعہ ہے کہ جس قدر میں نے کھیل میں غور و اندازہ سے کام لیا ہار گیا۔ اور جب قسمت پر چھوڑ دیا اور بے تحاشا بازی لگاتا رہا برابر جیتتا رہا۔ اول اول چند آدمیوں نے میرے رنگ پر بازی لگائی۔ لیکن جب میں نے رقم میں بے اندازہ اضافہ کر دیا تو سب چھوڑ بیٹھے۔ اور خاموشی کے ساتھ

کھیل دیکھنے لگے۔

بار بار میں بڑی سے بڑی بازی لگاتا تھا اور جیتتا تھا۔ کمرے میں ہر شخص جوش حیرت سے بیخود تھا۔ ہر مرتبہ سونے کا ڈھیر میری طرف سرکتا جاتا تھا۔ بینکر بھی میری کامیابی پر مجسمۂ حیرت بنا ہوا تھا۔ تمام کمرے میں صرف ایک شخص نہایت استقلال کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اور وہ میرا دوست تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور انگریزی میں کہا کہ بس اب ختم کرو بہت جیت چکے۔ اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر میں اعتراف نہ کروں کہ اس نے بار بار مجھے آگاہ کیا اور کھیل ختم کرنے اور واپس چلنے پر اصرار کیا۔ اور جب میں نے اس کے مشورے پر عمل کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کردیا تو مجبور ہو کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد کسی شخص کی بھاری سی آواز سنائی دی کہ "جناب مجھے اجازت دیجئے کہ نپولین کے دو بُت جو آپ نے گرا دیئے ہیں اُٹھا کر رکھ دوں۔ جناب عالی آپ کی تقدیر نہایت حیرت انگیز ہے۔ ایک بوڑھا سپاہی اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اپنی زندگی کے طویل تجربہ میں مَیں نے ایسی قسمت کسی کی نہیں دیکھی۔ کھیلے جایئے جناب۔ کھیلے جایئے اور بینک کو توڑ دیجئے۔"

میں نے گردن پھیری تو دیکھا کہ ایک دراز قامت سپاہیانہ وضع کا آدمی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے اگر میں ہوش و حواس میں ہوتا تو یہ سپاہی مجھے مشتبہ کیرکٹر کا انسان نظر آنا چاہیئے تھا۔ اس کی آنکھیں خون آلود تھیں۔ مونچھیں بھاری اور ناک شکستہ۔ اس کی آواز سپاہیانہ زندگی کے بدترین نمونہ کو ظاہر کرتی تھی۔ اور اس کے ہاتھ اس قدر ناصاف تھے کہ تمام فرانس میں ان کی مثال مجھے نظر نہیں آئی لیکن ان خصائص جسمانی و آثار ثیابی نے مجھ پر اس وقت کوئی ناگوار اثر پیدا نہیں کیا۔ میں اپنے مجنونانہ جوش کامیابی میں اس وقت ہر ایسے شخص کے ساتھ محبت و اتحاد پیدا کرنے کے لئے آمادہ تھا جو کھیل میں میری ہمت افزائی کرے۔ بوڑھے سپاہی نے مجھے نسوار پیش کی میں نے قبول کی اس کی پیٹھ ٹھونکی اور بڑی تعریف کی۔ میرے فوجی دوست نے پھر پُرجوش آواز میں کہا۔ کھیلے جاؤ۔ کھیلے جاؤ۔ اور جیتے جاؤ۔ بینک کو توڑ دو۔ میرے بہادر انگریز دوست بینک کو توڑ دو۔"

میں کھیلے گیا اور ایسی رفتار سے کھیلا کہ اس کے بعد پندرہ منٹ ہی میں بینکر چیخ اُٹھا: "صاحبو آج شب کے لئے بینک ختم ہو گیا" بینک کے تمام نوٹ اور تمام سونا اب میرے ہاتھوں کے نیچے ڈھیر لگا ہوا تھا۔ قمار خانہ کا تمام سرمایہ میری جیبوں میں جانے کا منتظر تھا۔

بوڑھے سپاہی نے کہا: "روپیہ اپنی جیبی رومال میں باندھ لو۔ باندھ لو۔ جس طرح ہم فوج میں اپنا ناشتہ باندھا کرتے تھے دنیا میں کسی بریچز کی جیبیں اتنی مضبوط نہیں کہ اس تمام دولت کو سنبھال سکیں ہاں۔ ٹھیک ہے اسی طرح نوٹ اور نقد سب باندھ لو۔ واہ کیا تقدیر ہے! ٹھہرو۔ ایک نپولین اور گر پڑا۔ اب جناب اجازت ہو تو میں رومال کے دونوں کناروں پر دُھری گرہیں لگا دوں۔ پھر روپیہ بالکل محفوظ ہو جائے گا۔ اب چھو کر دیکھو ایسا سخت اور گول ہو گیا ہے۔ جیسا توپ کا گولہ۔ کیا حشر ہوتا اگر ایسے گولے ہم پر میدان جنگ میں برسائے جاتے اب ایک پرانے سپاہی اور فرنچ فوج کے بہادر کی حیثیت سے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میرا کیا فرض ہے؟ یہ کہ میں اپنے لائق انگریز دوست سے درخواست کروں کہ میرے ساتھ شیمپین کی ایک بوتل پئیں اور دولت کی دیوی کا جام صحت نوش کریں"

لائق بہادر! بوڑھے جانباز سپاہی! شیمپین۔ بیشک بیشک! بوڑھے بہادر سپاہی کے لئے انگریزی چیرز! ہرّے ہرّے! دولت کی دیوی کے لئے انگریزی چیرز! ہرّے! ہرّے!

"شاباش انگلش مین! لائق و با مروت انگلش مین جس کی رگوں میں فرنچ خون گردش کر رہا ہے! ایک اور گلاس؟ ہا۔ ہا۔ بوتل خالی ہو گئی۔ کچھ پروا نہیں! ہیں۔ بوڑھا سپاہی ایک اور بوتل کا آرڈر دیتا ہوں"

"نہیں۔ نہیں۔ بہادر سپاہی اور نہیں! بس یہی بوتل جام صحت فرنچ فوج کا! نپولین اعظم کا! تمام موجودہ جلسہ کا! خزانچی کا! خزانچی کی بیوی اور بیٹی کا اگر ان کا وجود ہو! دنیا کے ہر شخص کا!"

دوسری بوتل کے ختم ہوتے ہوتے مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نے آتش سیال پی لی ہے۔ میرے دماغ سے شعلے نکلنے لگے۔ کثرت مے نوشی نے اس سے پہلے کبھی یہ اثر نہ کیا تھا۔ کیا یہ وجہ تھی کہ میں نے انتہائی جوش

وہیجان کی حالت میں پی تھی ؟ میرا معدہ آج خصوصیت کے ساتھ از کار رفتہ تھا ؟ یا شیمپین غیر معمولی تیز تھی ؟
میں مجنونانہ جوش سے چلّایا "فرینچ فوج کے بہادر ! میرے آگ لگ رہی ہے۔ تمھاری کیا حالت ہے؟ تم نے تو آگ لگادی۔ سنتے ہو ؟ اس شعلے کو بجھانے کے لئے تیسری بوتل پینی چاہئے ۔"
بوڑھے سپاہی نے سر ہلایا، اور خونخوار آنکھیں پھرائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں حلقۂ چشم سے نکل پڑینگی کثیف انگلی ٹوٹی ہوئی ناک پر رکھی اور کہا "کافی" ! اور یہ کہہ کر جلدی سے اندر کے کمرے میں چلا گیا۔
اِس لفظ نے تمام حاضرین پر جادو کا اثر کیا۔ اور سب کے سب ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ غالباً اُن کو یہ اُمید تھی کہ میرے مخمور ہونے سے کچھ فائدہ حاصل کرسکیں گے۔ لیکن جب دیکھا کہ میرا نیا دوست نہایت محبت اور ہمدردی کے ساتھ مجھے بدمست و مدہوش ہونے سے روک رہا ہے تو میری دولت میں سے حصہ حاصل کرنے کی اُمید نہ رہی۔ بہرحال وجہ جو کچھ ہو۔ سب کے سب اُٹھ کر چلے گئے۔ اور جب سپاہی واپس آیا اور میرے مقابل میز پر مبیٹھ گیا تو کمرے میں صرف ہم دونوں تھے۔ خزانچی باہر ایک گوشے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ خاموشی پہلے سے بھی زیادہ گہری تھی۔ اس وقت سپاہی کے انداز میں ایک قسم کی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ پہلے سے زیادہ سنجیدہ بنا ہوا تھا نہ بات بات پر قسمیں کھاتا تھا۔ نہ انگلیاں نچاتا تھا نہ بار بار چلّا اُٹھتا تھا۔
پُراسرار انداز سے کہنے لگا ! سنو ! ایک بوڑھے سپاہی کی نصیحت سنو۔ میں اس مکان کی مالکہ کے پاس گیا تھا۔ بہت دلفریب عورت ہے اور کھانا پکانے میں خاص ملکہ رکھتی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اس وقت ہم کو تیز اور عمدہ کافی کی ضرورت ہے۔ گھر جانے سے پہلے یہ کافی پی لینی چاہئے تاکہ شراب کا نشہ اُتر جائے۔ میرے نیک اور لائق دوست یہ بات نہایت ضروری ہے رات کے وقت اس قدر دولت گھر لے جانے کے لئے ہوش وحواس کا قائم رکھنا لازم ہے بہت سے لوگوں کو علم ہے کہ تم نے آج بے انتہا دولت جیتی ہے۔ آج شب میں جو لوگ جمع تھے وہ سب ایک حد تک قابلِ اعتماد اور نیک ہیں۔ لیکن پھر انسان ہیں۔ اور بشریت کی کمزوریوں سے خالی نہیں کیا مجھے کچھ اور کہنے کی ضرورت ہے ؟ نہیں۔ نہیں۔ آپ سمجھ گئے ! اب آپ کو یہ کام کرنا چاہئے کہ جب اپنے

آپ کو بالکل اصلی حالت میں پائیں تو ایک گاڑی منگائیں اور اُس کے اندر بیٹھ کر تمام کھڑکیاں بند کردیں۔ اور کوچبان کو حکم دیں کہ بڑی سڑکوں اور روشن راستوں سے گاڑی لے جاتے۔ بس ایسا ہی کیجئے آپ اور آپ کا مال بالکل محفوظ رہے گا۔ ہاں ایسا ہی کیجئے تو کل آپ ایک بوڑھے سپاہی کی نصیحت کا شکریہ ادا کریں گے۔"

بہادر سپاہی کی تقریر ختم ہوتے ہی کافی آگئی۔ دو پیالیاں بنی ہوئی آئیں۔ میرے دوست نے ایک پیالی ادب کے ساتھ مجھے پیش کی۔ میرا حلق پیاس کے مارے خشک ہو رہا تھا۔ ایک گھونٹ میں سب پی گیا۔ پیتے ہی معلوم ہوا کہ سر چکرا رہا ہے اور کامل نشے کی حالت طاری ہے۔ کمرہ گھومتا نظر آنے لگا۔ کانوں میں ایسی آوازیں پیدا ہوگئیں کہ کچھ سنائی ہی نہ دیتا تھا۔ گھبراہٹ، بے بسی اور بدحواسی چھاگئی میز کو پکڑ کر کرسی سے اُٹھا اور لڑکھڑانے لگا طبیعت اس قدر مضمحل دناساز معلوم ہوتی تھی کہ حیران تھا کس طرح گھر پہونچوں گا۔

سپاہی نے کہا "میرے عزیز دوست اس حالت میں جانا دیوانہ پن ہے۔ ساری دولت لٹ جائیگی اس حالت میں آپ کو لوٹ لینا اور قتل کر دینا کچھ دشوار نہیں۔ میں آج اسی مکان میں سوؤں گا۔ تم بھی یہیں سو رہو اور سو کر شراب کا اثر دور کر دو۔ کل دن میں روپیہ لے کر خیریت کے ساتھ چلے جانا"

میری حالت اس وقت ایسی تھی کہ دل میں صرف دو خیال باقی تھے۔ ایک یہ کہ روپیوں کا رومال ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے دوسرے یہ کہ جلد سے جلد کہیں لیٹ جانا چاہتے۔ اس لئے میں نے سپاہی کی رائے سے اتفاق کیا۔ خزانچی آگے اور ہم دونوں پیچھے پیچھے چل دیئے۔ اور زینوں پر چڑھ کر ایک کمرے کے سامنے پہونچ گئے۔ یہ کمرہ میرے سونے کے واسطے تجویز کیا گیا۔ سپاہی نے گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ صبح کا ناشتہ ہم دونوں ساتھ کھائیں گے۔ اور اس کے بعد خزانچی کے ساتھ واپس چلا گیا۔

میں کمرے میں داخل ہوتے ہی جلدی سے منہ دھونے کے طشلے کے پاس گیا۔ جگ میں پانی پیا اور باقی پانی طشلے میں اُلٹ کر اپنا منہ اُس میں ڈال دیا۔ اُس کے بعد کرسی پر بیٹھ کر حواس مجتمع کرنے لگا۔ فوراً افاقہ معلوم ہوا۔ قمارخانہ کی بند ہوا کے مقابلہ میں اس کمرے کی سرد و سبک ہوا نے دماغ کو فرحت بخشی۔ وہاں کے گیس کی تیز روشنی

کے مقابلہ میں یہاں کی شمع کی ہلکی روشنی نے آنکھوں کو راحت دی اور سردپانی کی خوشگوار تازگی نے جان سی پیدا کردی۔ دوران سر جاتا رہا اور میں ہوش میں آگیا۔ سب سے پہلے خیال آیا کہ قمار خانہ میں تمام رات گزارنا خطرہ سے خالی نہیں پھر سوچا کہ اتنا مال لے کر رات کو تن تنہا پیرس کی سڑکوں سے گزرنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے یہ سوچ کر میں نے ارادہ کر لیا کہ دروازے کو مقفل کرکے تن بہ تقدیر صبح کرنی چاہیئے۔

چنانچہ حفاظت کے تمام سامان جو میسر تھے کر لئے۔ مسہری کے نیچے جھانک کر دیکھا الماریوں کا معائنہ کیا کھڑکیوں کی زنجیر اور چٹخنی پر خوب زور لگا لیا کہ باہر سے کھل تو نہ جائیں گی۔ اس طرح اطمینان کرکے کپڑے اتارے روشنی کو آتش دان پر رکھا۔ اور مسہری پر لیٹ گیا اور روپیہ کے رومال کو تکیہ کے نیچے رکھ لیا۔

لیٹتے ہی معلوم ہو گیا کہ نیند کا کیا ذکر آنکھیں تک بند نہیں ہوسکتیں۔ سخت بخار چڑھا ہوا تھا۔ جسم کی رگ رگ کانپ رہی تھی۔ اور تمام حواس نہایت ذکی الحس ہو گئے تھے۔ کروٹیں بدلیں۔ لوٹا پوٹا۔ ہر پہلو پر لیٹنا چاہا۔ پلنگ کے سب سے سرد حصہ پر لیٹا۔ لیکن سب بیکار۔ نیند کا پتہ نہ تھا۔ کبھی کپڑوں سے ہاتھ باہر نکالے۔ کبھی کپڑوں کے اندر کرلئے۔ ابھی سیدھا لیٹا تھا۔ ابھی گٹھری بن کر پڑ گیا۔ تکیہ کو جھٹکا۔ اس کا سرد پہلو اوپر کیا۔ ہاتھ سے اس کی سطح برابر کی اور چت لیٹ گیا۔ پھر یکا یک اٹھ بیٹھا۔ تکیہ کو خوب زور سے دہرا کیا۔ ایک کنارے پر کھڑا کیا۔ مسہری کے تختہ سے لگا کر رکھا۔ اور سہارا لگا کر بیٹھ گیا۔ غرض ہر طرح کوشش کی کہ کسی پہلو آرام مل جائے آخر معلوم ہو گیا کہ ساری رات آنکھوں میں کٹے گی۔

اب کیا کروں؟ کوئی کتاب نہیں کہ اس سے وقت گزاروں۔ کوئی شغل نہ ہوگا تو وحشت انگیز و پریشان کن خیالات پیدا ہوں گے کہنیوں کے سہارے اٹھا اور کمرے پر نظر ڈالی۔ کھڑکی میں سے چاند کی روشنی آرہی تھی۔ اور کمرہ روشن تھا۔ دیکھا کہ کمرے میں کوئی تصویر یا آرائش کا سامان ہے یا نہیں؟ تمام فرنیچر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سب سے پہلے تو مسہری ہی تھی جس پر میں لیٹا تھا۔ مسہری کی چھت چار ستونوں پر قائم تھی۔ اور اس پر جھینٹ لگی ہوئی تھی۔ چاروں طرف جھالر تھی پردے بھی حسب معمول موجود تھے۔ جن کو میں نے لیٹتے وقت محض

بے خیالی میں ہٹا کر ستونوں کے برابر کر دیا تھا۔ اس کے بعد منہ دھونے کے طشلے کی میز تھی جس کا تختہ بجائے لکڑی کے سنگ مرمر کا تھا۔ اس کے بعد دو چھوٹی کرسیاں جن پر میرے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ ایک آرام کرسی جس میں دراز لگی ہوئی تھی۔ ایک سنگھار کی میز جس پر ایک چھوٹا سا آئینہ اور ایک پن کُشن رکھا ہوا تھا۔ ایک میلی پُرانی تصویر بھی تھی۔ یہ تصویر ایک آدمی کی تھی جو اونچی ہسپانی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اور ٹوپی کے تاج پر پَر لہرا رہے تھے۔ یہ شخص صورت سے بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ آنکھ پر ہاتھ سے سایہ کئے ہوئے غور کے ساتھ اوپر دیکھ رہا تھا ممکن ہے پھانسی کو دیکھ رہا ہو جس پر لٹکایا جانے والا ہو اس لئے کہ اس کی شکل سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ پھانسی پانے کے قابل ہے۔

اس تصویر سے مجھ پر ایک خاص اثر ہوا اور میں اوپر مسہری کی چھت کو دیکھنے لگا۔ چھت تصویر سے اوپر تھی چھت میں کوئی دلچسپ بات نظر نہ آئی تو پھر تصویر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور اس شخص کی ٹوپی کے پر گننے لگا۔ پانچ پر تھے۔ تین سفید اور دو سبز۔ میں حیران تھا کہ یہ شخص اوپر کس چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھ نہیں سکتا ایسا بدمعاش نہ ہیئت داں ہو سکتا ہے نہ منجم پھانسی ہی کو دیکھ رہا ہو گا۔ میں نے پھر پروں کو گنا تین سفید اور دو سبز۔

انھیں تصورات میں تھا کہ خود بخود خیالات منتشر ہونے لگے۔ چاند کی روشنی کو دیکھ کر اپنے وطن کا ایک جلسہ تفریح یاد آ گیا۔ اس جلسہ کو مدتیں گزر چکی تھیں۔ لیکن خاص حالات میں انسان کو کیا کیا اور کہاں کہاں کی باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ کسی اور وقت چاہتا بھی تو شاید اس جلسہ کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔ اور اس وقت صرف چاند کی کرن نے اس چاندنی رات کے جلسہ کی تمام تفصیل یاد دلا دی۔ ابھی ان گزشتہ مناظر و تفریحات کے تصور میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکایک رشتۂ خیال ٹوٹ گیا اور میں نہ جانے کیوں پھر تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔

میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ یا اللہ! تصویر کے آدمی نے ٹوپی اپنی پیشانی پر جھکا لی! نہیں ٹوپی غائب ہے! ٹوپی کا ابھار کہاں گیا؟ پر کہاں ہیں؟ تین سفید اور دو سبز! غائب ہیں؟ ٹوپی اور پروں کی جگہ کیا چیز اس کی

پیشانی، آنکھوں اور اُٹھے ہوئے ہاتھ کو چھپاتے ہوئے ہے؟
کیا مسہری کی چھت حرکت کر رہی ہے؟
میں نے کروٹ بدلی اور اوپر دیکھا۔ کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ نشے میں ہوں؟ سو رہا ہوں؟ سر چکرا رہا ہے یا واقعی مسہری کی چھت آہستہ آہستہ. باقاعدہ رفتار سے۔ خاموشی کے ساتھ نیچے کو آ رہی ہے اور پوری چھت میرے اوپر گر رہی ہے جبکہ میں اُس کے نیچے لیٹا ہوا ہوں؟
میرا خون خشک ہو گیا۔ مردنی سی چھا گئی۔ میں نے تکیہ پر اپنے سر کو پھیرا۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ: واقعی چھت حرکت کر رہی ہے یا نہیں تصویر پر آنکھیں جمائیں.
صرف ایک نظر کافی تھی۔ چھت کی جھالر جو تصویر سے بلند تھی اب پیکر تصویر کے متوازی تھی اور میں نے دیکھا کہ باقاعدگی اور آہستگی کے ساتھ تصویر اور فریم کا کنارہ جھالر سے چھپتا جاتا ہے۔
میں سب کچھ سہی۔ لیکن اگر کچھ نہیں ہوں تو بزدل نہیں ہوں۔ زندگی میں بہت سے خطرے پیش آئے اور ایک لمحہ کے لئے میرے حواس باطل نہیں ہوتے۔ لیکن اس وقت جب مجھے یقین ہو گیا کہ مسہری کی چھت حرکت کر رہی ہے اور مجھے کچل کر ہلاک کر دینے کے لئے آہستہ آہستہ میرے اوپر آ رہی ہے تو میں اس مہلک مشین اور اس قاتل مسہری کے تصور سے کانپ گیا اور اس قدر خوف زدہ ہوا کہ حس و حرکت کی قوت باقی نہ رہی شمع جل کر ختم ہو چکی تھی۔ لیکن چاند کی شعاعوں سے کمرہ روشن تھا۔ مسہری کی چھت بغیر آواز کے نیچے آ رہی تھی۔ اور میں خوف کے مارے اب تک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ چھت کے کپڑے کی ناگوار بو ناک میں پہنچی اس آخری لمحہ میں زندگی کی خواہش اور جان بچانے کے خیال نے میری وہ کیفیت دور کی۔ صرف اتنی جگہ باقی تھی کہ میں مشکل سے لیٹے لیٹے کھسک کر مسہری سے نیچے گر پڑا۔ گرتے گرتے چھت کا کنارہ میرے شانے کو لگ گیا۔

بغیر سانس لئے۔ بغیر پسینہ پونچھے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور چھت کو دیکھنے لگا۔ اس وقت باہر سے کوئی

آہٹ ہوتی تو میں نہیں سن سکتا تھا۔ بھاگنے کی کوئی صورت غیب سے پیدا ہو جاتی تو مجھ میں حرکت کی قوت باقی نہ تھی ساری روح آنکھوں میں کھنچ کر آگئی تھی۔

تمام چھت مسہری کے اوپر رکھی ہوئی تھی۔ اور اس قدر چسپاں تھی کہ چھت اور مسہری کے درمیان ایک انگلی رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے چھو کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں جس کو محض چھت گیری یا شامیانہ سمجھے ہوئے تھا وہ نہایت سخت اور موٹی چیز تھی جو چھت کے کپڑے اور جھالر سے چھپی ہوئی تھی اوپر نظر اٹھائی تو مسہری کے چاروں ڈنڈے خالی نظر آئے۔ مسہری کی چھت کے بیچ میں ایک بڑا لکڑی کا پیچ تھا جو کمرے کی چھت میں سوراخ کر کے اوپر نکالا گیا تھا۔ کمرے کی چھت کے اوپر سے اس پیچ کو گھما کر مسہری کی چھت کو نیچے سرکایا گیا تھا اس خوفناک مشین کو چلاتے وقت خفیف سی آواز بھی پیدا نہ ہوئی اور اس وقت بھی کمرے کے اوپر سے کسی قسم کی آواز نہ آتی تھی۔ میں متحیر وحشت خیز و دہشت انگیز سکوت میں کھڑا تھا اور انیسویں صدی میں فرانس کے مہذب دارالسلطنت کے اندر خفیہ قتل کی ایک عجیب مشین میرے سامنے تھی مجھ پر اس درجہ حیرت طاری تھی کہ حرکت تنفس بھی مشکل سے جاری تھی۔ رفتہ رفتہ تحیر دور ہوا اور مجھے نظر آیا کہ میرے خلاف کیسی قاتلانہ سازش کی گئی تھی۔

میری کافی کی پیالی میں خواب آور دوا ملائی گئی تھی اور قتل کی تمام تدابیر مکمل تھیں۔ خدا کو جان بچانی تھی کہ تیز نکا ہو گیا اور باوجود ہزار کوشش کے نیند نہ آئی۔ میری طرح خدا جانے کتنے لوگ اس قاتل مسہری پر سلائے گئے ہوں گے۔ اور پھر دنیا نے ان کا نام و نشان بھی نہ سنا ہوگا۔ میں تو اس تصور ہی سے کانپ اٹھا۔

ان خیالات کے دوران میں پھر میری نظر مسہری پر پڑی۔ اس کی چھت تقریباً دس منٹ تک پڑی رہنے کے بعد آہستہ آہستہ اٹھنی شروع ہوئی اور اپنی جگہ پر جا لگی۔ اب نہ کوئی سوراخ نظر آتا تھا نہ پیچ۔ بالکل معمولی مسہری معلوم ہوتی تھی۔ نہایت غور کرنے سے بھی کوئی عیب۔ کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آتی تھی۔

اب پہلی مرتبہ مجھ میں نقل و حرکت کی قوت پیدا ہوئی۔ اٹھا۔ کپڑے پہنے اور بھاگنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ ذرا سا شور ہلکی سی آہٹ پیدا ہوئی یا ذرا بھی ان لوگوں کو ناکامی قتل کا شبہہ ہوا اور جان گئی۔ میں نے

کان لگا کر سُنا باہر کوئی آہٹ نہ تھی۔ اوپر کے کمرے سے بھی کوئی آواز نہ آتی تھی۔ کامل سکوت و سکون طاری تھا میں نے کمرے کو مقفل کرنے کے علاوہ لکڑی کا ایک پُرانا صندوق بھی سرکا کر کواڑوں سے اڑا دیا تھا۔ بغیر آواز کے صندوق کو وہاں سے ہٹانا ممکن نہ تھا۔ اس صندوق کے اندر کیا ہوگا؟ اس تصور سے خون خشک ہو گیا!

مکان کے اندر سے نکل کر جانے کا ارادہ جنون سے کم نہ تھا۔ صرف ایک راستہ باقی تھا۔ یعنی کھڑکی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ کھڑکی تک پہنچا کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اس پر میری زندگی منحصر تھی۔ ذرا کواڑوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی یا قبضوں سے آواز نکلی اور میں جان سے گیا۔ کھڑکی کھولنے میں کم سے کم پانچ منٹ لگے جو مجھے پانچ گھنٹے سے کم نہ معلوم ہوتے تھے آخر بغیر کسی آواز کے کھڑکی کھل گئی۔ جھانک کر دیکھا تو زمین سے بہت زیادہ بلند تھی۔ اتنی بلندی سے کودنا یقینی ہلاکت تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بائیں طرف دیوار سے ملا ہوا پانی کا خوب موٹا پائپ لگا ہوا ہے۔ جو کمرے کے اوپر سے آتا ہوا کھڑکی کے بیرونی کنارے سے متصل نیچے گزرتا ہے یہ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ اب جان بچ گئی۔

بہت سے لوگوں کے لئے یہ تدبیر فرار مشکل ہوگی۔ لیکن میرے لئے پائپ کے سہارے پھسل کر اُتر جانا کوئی بات ہی نہ تھی۔ لڑکپن میں جمناسٹک کی کافی مشق کی تھی اور جانتا تھا کہ میرا سر۔ ہاتھ اور پاؤں کسی دشوار سی دشوار چڑھائی یا اُتار میں میرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ میں نے ایک پاؤں کھڑکی سے باہر نکال دیا تھا کہ یاد آیا کہ روپیہ کا رومال تکیہ کے نیچے رکھا ہوا ہے۔ اس حالت میں مجھے دولت کی پروا یا لالچ مطلق نہ تھا۔ لیکن ان قاتلوں اور بدمعاشوں سے پورا انتقام لینا چاہتا تھا۔ اور اُن کو قتل و غارت گری دونوں ارادوں میں ناکام رکھنا چاہتا تھا اس لئے پھر اُترا اور رومال کو کس کر باندھ لیا پھر کھڑکی سے لٹک کر پائپ کو پکڑ لیا اور اس کے سہارے پھسل کر زمین پر آ گیا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی نہایت تیزی سے دوڑا۔ مجھے علم تھا کہ پولیس اسٹیشن قریب ہی ہے وہاں پہنچا۔ اتفاق سے سب پرفیکٹ (سب انسپکٹر پولیس) اور چند کانسٹبل جاگ رہے تھے۔ اور کسی پُراسرار و مخفی قتل کا ذکر کر رہے تھے جو حال ہی میں واقع ہوا تھا اور قاتل کا پتہ نہ لگ سکا تھا۔ جب میں نے جلدی جلدی ٹوٹی پھوٹی فرنچ زبان میں اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا تو

اُن لوگوں کو شبہہ ہوا کہ میں کوئی شرابی انگریز ہوں اور کسی کو لوٹ مار کر بھاگا ہوں۔ لیکن قصہ ختم ہونے سے قبل ہی سب پرلفیکٹ نے اپنے سامنے کے کاغذوں کو سمیٹا اور چند سپاہیوں کو لے کر میرے ساتھ چل دیا۔

راستے میں سب پرلفیکٹ ایک ہی سانس میں مجھ سے جرح بھی کرتا جاتا تھا اور میری کامیابی پر مبارکباد بھی دیتا جاتا تھا۔ ہم قمار خانے پہنچے۔ سپاہیوں نے مکان کا محاصرہ کر لیا اور دروازے کو کھٹکھٹایا۔ کھڑکی میں سے روشنی نمودار ہوئی مجھے سپاہیوں کے پیچھے چھپا دیا گیا اور حکم دیا کہ قانون کے نام پر دروازہ کھول دو۔ فوراً تعمیل حکم کی گئی سب پرلفیکٹ اندر گیا اور ایک ملازم سے کہا۔

"ہم اس انگریز سے ملنا چاہتے ہیں جو اس مکان میں سو رہا ہے۔"

"وہ کئی گھنٹے ہوئے چلا گیا۔"

"ایسا نہیں ہوا۔ اس کا دوست چلا گیا تھا وہ خود رہ گیا تھا۔ ہمیں اُس کے سونے کا کمرہ دکھاؤ۔"

"سب پرلفیکٹ صاحب میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ یہاں نہیں ہے۔"

"جناب میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ وہ موجود ہے۔ وہ یہاں سویا۔ تمہارے بستر پر اُس کو آرام نہ ملا۔ اُس نے آکر ہم سے شکایت کی چنانچہ ہمارے ساتھ موجود ہے میں اُس کی مسہری کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں (ایک سپاہی کی طرف مخاطب ہو کر) اس شخص کو حراست میں لے لو اور مشکیں کس لو۔ اب صاحبو اوپر کی منزل پر چلو۔"

قمار خانہ کے سب مرد و زن حراست میں لے لئے گئے۔ بوڑھے سپاہی کو سب سے پہلے گرفتار کیا۔ پھر میں نے اپنے کمرے کی نشان دہی کی۔ کمرے کی چھت پر کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آتی تھی۔ سب پرلفیکٹ نے چاروں طرف دیکھا۔ سب کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ اور چھت پر دو مرتبہ پاؤں مارا۔ اس کے بعد روشنی منگائی اور حکم دیا کہ چھت کے فرش کو نہایت احتیاط کے ساتھ اُٹھایا جائے۔ فوراً تعمیل کی گئی اور ہم نے دیکھا کہ اوپر کے کمرے کے فرش اور نیچے کے کمرے کی چھت کے درمیان خلا ہے اور اس میں لوہے کا ایک صندوق لگا ہوا ہے۔ صندوق کے بیچ میں ایک پیچ ہے جس کا تعلق مسہری کی چھت سے ہے۔ پیچ خوب تیل میں تر ہے اور ریور پرفیلیٹ چڑھا ہوا ہے

اس کے بعد ایک بہت بڑے شکنجہ کا تمام بالائی حصہ صاف نظر آنے لگا۔سب پریفکٹ نے تھوڑی سی محنت کے بعد مشین کو چلتا کر دیا۔ اور اپنے آدمیوں کو اس کے چلانے کا حکم دے کر میرے ساتھ نیچے کے کمرے میں آ گیا۔مسہری کی چھت نیچے کھسکنی شروع ہوئی۔ لیکن اس کی حرکت پہلے کی طرح بے آواز نہ تھی۔ جب میں نے سب پریفکٹ سے یہ بات کہی تو اس نے جواب دیا کہ "میرے آدمیوں کو پہلا اتفاق ہے اور وہ لوگ مشاق و ماہر تھے"۔

ہم مکان کو دو پولیس کے آدمیوں کو سپرد کر کے وہاں سے چل دیئے۔ اور قمار خانہ کے آدمیوں کو فوراً جیل خانہ بھجوا دیا۔سب پریفکٹ نے اپنے دفتر میں میرا بیان لکھا۔ اور میرا پاسپورٹ دیکھنے کے لئے میرے ساتھ ہوٹل میں آیا۔ میں نے پاسپورٹ دیتے وقت کہا۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ اس مسہری پر بہت سے لوگوں کو ہلاک کیا گیا ہوگا؟

اس نے جواب دیا کہ میں نے درجنوں ڈوبے ہوئے آدمیوں کو مارگو پر پڑا پایا ہے جن کی پاکٹ بک میں خط پائے گئے۔ ان خطوں میں لکھا ہوا تھا کہ قمار خانہ میں سب کچھ ہار جانے کی وجہ سے ہم دریائے سین میں ڈوب کر خودکشی کرتے ہیں۔ کس طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس قدر تعداد قمار خانے میں داخل ہوئی ہوگی جس طرح تم داخل ہوئے، بازیاں جیتی ہونگی جس طرح تم نے جیتیں۔ اس مسہری پر سوئے ہوں گے۔ ہلاک کئے گئے ہوں گے اور دریا میں ڈال دیئے گئے ہوں گے اور قاتلوں نے خود ان کی طرف سے خط لکھ کر ان کی پاکٹ میں رکھ دیئے ہوں گے کون کہہ سکتا ہے کہ کتنے آدمی اسی موت کے پنجے میں گرفتار ہوئے جس سے تم بچ کر نکل آئے۔ قمار خانہ والوں نے مسہری کا راز ہم پولیس والوں تک سے پوشیدہ رکھا۔ اور مقتولوں نے ان کی رازداری کی تکمیل کی۔ اچھا گڈ نائٹ بلکہ گڈ مارننگ (اس لئے کہ اب آثار صبح نمودار ہو گئے تھے) صبح ۹ بجے میرے دفتر میں پھر تشریف لائیے

باقی داستان بہت مختصر ہے۔ مجھ سے کئی بار جرح کی گئی۔ قمار خانہ کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ گرفتاروں میں سے دو شخصوں نے جن کا جرم ہلکا تھا اقبال جرم کر لیا۔ معلوم ہوا کہ بڑھا سپاہی قمار خانہ کا مالک تھا۔ خزانچی یا بینکر اور وہ عورت جس نے کافی بنائی تھی اس کے رازدار تھے۔ باقی ملازموں کو یہ راز معلوم نہ تھا۔ تینوں اصلی

مجرموں کو پھانسی دی گئی ۔ باقی کو سزائے قید ہوئی ۔ ایک ہفتہ تک تمام پیرس میں میرا اور میری عجیب داستانِ انکشاف کا چرچا رہا ۔ تین مشہور ڈرامانویسوں نے اس واقعہ پر ڈرامے لکھے لیکن محکمۂ احتساب نے قمار خانہ کی صحیح مسہری کا خاکہ اسٹیج پر پیش کرنے اجازت نہ دی ۔

ایک مفید نتیجہ یہ البتہ برآمد ہوا کہ میں نے آئندہ کے لئے "سیاہ خاتون" کو تفریح گاہ بنانے سے توبہ کر لی ۔ میز کا سبز کپڑا ۔ تاش کی گڈی اور روپیہ کا ڈھیر ہمیشہ مجھے اس مسہری کو یاد دلا دیتا تھا جو میرا دم گھوٹنے کے لئے نیچے اُتر رہی تھی ۔

(مطبوعہ مرقع لکھنؤ اکتوبر ۱۹۲۷ء)

عید پر عید

ستائیسواں روزہ ہے۔ رشید اور اُس کی بیوی عتیقہ اپنے مختصر سے مکان میں خاموش بیٹھے ہیں۔ دونوں جوان ہیں۔ خوبصورت ہیں۔ تندرست ہیں۔ لیکن دونوں کے چہرے مضمحل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سحری کے روزہ رکھ لیا ہے۔ رشید کے ہاتھ میں کتاب ہے اور عتیقہ کے کوئی کپڑا۔ لیکن نہ وہ پڑھ رہا ہے۔ نہ یہ سی رہی ہے۔ دونوں کسی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ چار پانچ برس کا ایک خوبصورت بچہ صحن میں تنہا گیند بلے سے کھیل رہا ہے۔ ماں باپ دونوں کبھی کبھی نظر اٹھا کر بچے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں اور پھر سر جھکا کر سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔

اتنے میں بچہ کھیل سے تھک کر دوڑتا ہوا آیا اور ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر بولا "اماں عید کب ہوگی؟"

عتیقہ۔ بٹیا ابھی تو تین دن ہیں" ان الفاظ کے ساتھ ہی منہ سے خفیف سی آہ بھی نکلی۔

بچہ۔ "اماں میرے عید کے کپڑے کب بنیں گے؟"

عتیقہ۔ "شفیق! اللہ میاں سے مانگو۔ وہ بنا دیں گے۔ جاؤ گیند کھیلو"

شفیق۔ "اللہ میاں عید کے کپڑے بنا دو!" یہ کہہ کر پھر صحن میں دوڑ گیا۔

رشید۔ (بیوی کی طرف دیکھ کر) کئی مہینے ہو گئے گھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ نہ وہاں کی خیریت معلوم ہوئی ابا میاں کا حال مدت سے معلوم نہیں۔ سنا ہے کہ رنگون میں کام شروع کیا ہے میں نے تو سوائے اس کے کبھی کوئی نافرمانی نہیں کی کہ تلاش معاش میں گھر سے نکل گیا۔ ابا میاں مجھ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں اور میری تمنا ہے کہ ان سے اپنا قصور معاف کراؤں۔ مجھے ان کی دولت کی آرزو نہیں۔ ہماری یہ حالت بھی انشاء اللہ باقی نہ رہے گی۔

عتیقہ۔ انشاء اللہ

رشید۔ تصنیف و تالیف سے روزی پیدا کرنا حقیقت میں بہت دشوار ہے پہلی دو تین کتابوں میں اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔ اس سے امید بندھ گئی۔ یہ ناول جو اب بھیجا ہے میرے ناولوں میں بہترین ہے اور کافی معاوضہ کی اُمید ہے۔ آگرہ کی "**بزمِ ادب**" قابل ادیبوں کی جماعت معلوم ہوتی ہے اس کے سکرٹری ایم۔ اے ہیں پریزیڈنٹ ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ہیں اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اچھی کتابوں کے قدرداں ہیں۔ معقول معاوضہ دینا اور اعلیٰ طباعت کے ساتھ کتاب کو شائع کرنا ان کا مقصد ہے۔ بشرطیکہ کتاب بھی اعلیٰ ہو۔ خواہ کسی مضمون کی ہو۔ میں نے ناول حتی الامکان بہتر سے بہتر لکھا ہے۔ اُمید ہے کہ "**بزمِ ادب**" پسند کرے گی۔ اسی ہفتہ میں جواب آجانا چاہئے۔ اچھا یہ تو بتاؤ اب دام کتنے باقی ہیں۔ یہ تین روزے اور عید بھی گذر جائے گی یا نہیں۔ اور ہاں شفیق کے لئے عید کے کپڑوں کا کیا ہوگا۔ اس کو بڑی مایوسی ہوگی۔

عتیقہ۔ اللہ مالک ہے۔

جس آواز میں عتیقہ نے یہ فقرہ کہا وہ دل شکستگی اور مایوسی کی آواز نہ تھی۔ بلکہ شکر و رضا۔ اُمید و اعتماد کا ہمت آفریں لہجہ تھا۔ عتیقہ حسین تھی اس لئے رشید اس سے محبت کرتا تھا۔ عتیقہ جوان و تندرست تھی اس لئے رشید اس پر فدا تھا۔ لیکن عتیقہ بہترین دل و دماغ کی عورت تھی اس لئے رشید اس پر فخر کرتا تھا۔

رشید (شگفتہ ہو کر) یہ دونوں باتوں کا جواب ہوا؟

عتیقہ (مسکرا کر) دونوں کا۔

رشید۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر طرح کی اُمیدیں ہیں۔ مجھے تو شفیق کی عید کا زیادہ خیال ہے۔

عتیقہ۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ میرے ریشم اور اطلس کے کپڑے رکھے ہوتے ہیں۔ پردیس میں ان کا لانا

ہی فضول تھا۔ میں تو نہ لاتی کہ پردیس میں کہیں آنا نہ جانا ان کپڑوں کا بوجھ کیوں باندھا جاتے لیکن خالہ اماں نے نہ مانا کہ نہیں لیتی جاؤ۔ کام آئیں گے۔ سو یہ اب کام آتے معلوم ہوتے ہیں کہ عید سے ایک دن پہلے اگر اور کوئی صورت نہ ہوئی تو کوئی کپڑا کاٹ کر شفیق کی اچکن سی دوں گی۔ ترکی ٹوپی دھو کر قالب پر چڑھا دوں گی۔ بوٹ اچھا خاصہ ہے، پالش سے نیا معلوم ہونے لگے گا (مسکرا کر) کہو تو تمہارے لئے بھی واسکٹ سی دوں؟

رشید (جوشِ محبت سے ہنس کر) دور بیٹھی ہو!

عتیقہ (سمجھ کر) نہیں تو کیا کرتے؟ یہ کہہ کر گردن جھکالی۔

اتنے میں دروازے پر پوسٹ مین نے آواز دی۔ شفیق آنگن میں کھیل رہا تھا۔ دوڑ کر گیا اور ایک لفافہ لے آیا۔ رشید نے لفافہ کھولا اور آہستہ آہستہ پڑھنے لگا۔ پڑھتا جاتا تھا اور چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ عتیقہ خاموش بیٹھی شوہر کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ جب رشید نے خط ختم کرکے لمبا سانس لیا تو بولی۔

عتیقہ۔ خیریت تو ہے؟ کس کا خط ہے؟

رشید۔ شکر ہے کچھ پریشانی کی بات نہیں۔ لیکن عجیب خط ہے!

عتیقہ۔ کیا؟

رشید۔ سنو!

> عزیزمن۔ سلام مسنون۔ تم نے اپنے آپ کو ایسا گم کیا کہ برس گذر گئے۔ کچھ پتہ ہی نہ ملا۔ کھانے کمانے کو نکلتے ہیں تو عزیزوں دوستوں سے قطع تعلق نہیں کر لیا کرتے۔ تم نے اپنے والد کے ذرا سے طعنہ کا کہ "رشید کو کھانے کی فکر ہے کمانے کی نہیں" اتنا خیال کیا کہ جانے کے لئے اطلاع و اجازت کی

بھی ضرورت نہ سمجھی ۔ اور پھر ایسے روپوش ہوئے کہ باپ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے
تھک گئے ۔ اب بھی تمہارا کیا پتہ چلتا اگر شکر ہے کہ تم نے غالباً حال ہی میں ایسا پیشہ
اختیار کر لیا ہے جس میں اعلان ناگزیر ہے ۔ کل اتفاق سے تمہاری کتاب
"رفیق حیات" نظر آگئی ۔ نہ پوچھو کس قدر خوشی ہوئی کتاب سے اتنی نہیں جتنی تمہارا
پتہ معلوم ہونے سے ۔ تمہارا افسانہ بھی میں نے ختم کر کے ہی ہاتھ سے رکھا لیکن
اس پر اظہار رائے اس وقت مقصود نہیں ہے ۔ بلکہ اس سے زیادہ اور بہت
زیادہ ضروری بات کے لئے یہ خط لکھ رہا ہوں ۔

تم کو معلوم ہوگا کہ تمہارے والد رنگون چلے گئے تھے ۔ وہیں انھوں نے
کاروبار جاری کیا ایک بار ادھر آئے تھے ۔ تمہاری گمشدگی کا ان کو نہایت صدمہ
تھا ۔ کہتے تھے کہ "رشید کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ میں اس سے ناراض ہوں ۔ خدا
جانتا ہے مجھے اس کی جدائی کا کتنا صدمہ ہے وہ ہوتا تو کاروبار سنبھالتا اور میرا
دست وبازو بنتا" بہرحال پھر وہ وطن نہیں آئے ۔ اور ہم لوگوں کو ان کا کچھ حال
معلوم نہ ہوا ۔ اب چند مہینے ہوئے ان کا کارندہ منشی کمال الٰہی واپس آیا ہے یہی
شخص ان کا رفیق سفر و معاون کار تھا ۔ اس نے بیان کیا کہ تمہارے والد منشی محمد فرید
نے تمام کاروبار بند کر کے اور فروخت کر کے تیس ہزار روپیہ نقد حاصل کیا جس میں
سے دس ہزار روپیہ اپنے کارندہ کمال الٰہی کو بطور حق الخدمت کے دیئے اور
دس ہزار روپیہ خود لے کر ہجرت کی نیت سے سفر حجاز کے لئے روانہ ہو گئے ۔
میں نے یہ واقعہ سنا تو ہوش اڑ گئے ۔ تمہارے والد کی دریا دلی اور سیر چشمی سے
یہ بات بیشک بعید نہیں کہ وہ کسی کو دس ہزار کیا اپنا سارا سرمایہ دیدیں لیکن میں

ان کو اس قدر نا عاقبت اندیش اور مصلحت ناشناس نہیں سمجھتا کہ وہ کسی غیر مستحق یا کم مستحق کو اتنی بڑی رقم دیدیں اور اپنے بیٹے کو عاق کر دیں اور اس کے لئے کچھ نہ چھوڑیں۔ میں خود کارندہ سے ملا۔ اس نے تمام حالات مفصل بیان کئے اور ان کی تحریر دستخطی اپنے نام دس ہزار روپیہ عطیہ کی دکھائی۔

میں متحیر رہ گیا لیکن کیا کہہ سکتا اور کر سکتا تھا۔ اسی وقت سے برابر تمہارا خیال آرہا تھا۔ آخر شکر ہے کہ تمہارا پتہ مل گیا۔ مجھے محض اس واقعہ کے عجیب ہونے کی وجہ سے وہ تحریر مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ تم فوراً آؤ کہ اس معاملہ میں مناسب کارروائی کی جائے۔ ایک دن ضائع کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ابھی کمال الہٰی نے اپنا روپیہ بنک میں رکھ چھوڑا ہے لیکن عنقریب وہ تعمیر مکان و خرید جائداد میں اس کو صرف کرنے والا ہے۔ میں بے چینی کے ساتھ منتظر رہوں گا۔

تمہارا منہ بولا چچا

داؤد

عتیقہ۔ (خط سن کر) پھر کیا ارادہ ہے؟

رشید۔ کیا بتاؤں۔ جانا تو چاہئے۔ عید بعد دیکھا جائے گا۔

عتیقہ۔ عید بعد؟ وہ تو لکھتے ہیں کہ فوراً آؤ۔ جانا ہے تو بسم اللہ کرو۔

رشید۔ خرچ کہاں ہے؟

عتیقہ۔ میرے سونے کے کڑے موجود ہیں۔ ایسی ہی ضرورتوں کے لئے رکھے ہیں سفر کے لئے تو ایک کڑا ابھی بہت ہے۔ لیکن دونوں لے لو۔ وہاں خدا جانے کیا ضرورت پیش آئے

رشید۔ میرا تو جی نہیں چاہتا۔ سفر کا خدا جانے کچھ نتیجہ نکلے یا نہ نکلے۔ چیز ہاتھ سے چلی جائے گی۔

عتیقہ۔ چیز کے جانے کا غم نہیں۔ یہ بھی ایک کام ہے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوگی انشاء اللہ! چچا ابا تمھیں محروم نہیں چھوڑ سکتے۔ اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔

رشید۔ تو کڑے گروی رکھ دوں۔

عتیقہ۔ نہیں بیچ ڈالو۔ گروی میں روپیہ کم ملیں گے اور رچھڑانے کا کیا حال معلوم ہے۔

رشید۔ کوئی ڈیڑھ سو کے ہوں گے۔

عتیقہ۔ پورے ڈھائی سو کے تھے۔ اب جتنے کو بکیں۔ تو بس آج ہی چلے جاؤ۔ عید سے تو پہلے ہی آجاؤ گے؛

رشید۔ کام ہو یا نہ ہو۔ عید کے دن تمھیں اور شفیق کو اکیلا نہ چھوڑوں گا میری عید تو یہیں ہے۔

۲

منشی کمال الٰہی اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے میز پر کچھ کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ اتنے میں نوکر نے اطلاع کی کہ تین صاحب تشریف لائے ہیں ملنا چاہتے ہیں۔

کمال الٰہی۔ (گھبرا کر) کون صاحب ہیں؟ نام پوچھا؟

نوکر۔ ایک کو تو میں جانتا ہوں۔ حاجی داؤد خاں ہیں۔ باقی دو کو نہیں جانتا۔ پوچھوں کون کون ہیں؟

کمال الٰہی (کاغذات سمیٹتے ہوئے) نہیں۔ بلا لو

تینوں ملاقاتی کمرے میں داخل ہوئے۔ منشی صاحب نے کھڑے ہو کر تعظیم دی۔

منشی۔ آئیے حاجی صاحب۔ بہت دنوں میں ملاقات ہوئی۔ کہیے مزاج تو اچھا ہے (باقی دونوں سے) تشریف لائیے حضرات۔ مزاج شریف!

حاجی داؤد۔ (ایک ساتھی کی طرف اشارہ کرکے) آپ منشی محمد فرید صاحب کے صاحبزادے

منشی محمد رشید صاحب ہیں۔

منشی کمال الٰہی (رشید سے مصافحہ کرکے) آہا رشید میاں ہیں۔ میں نے پہچانا بھی نہیں۔ دیکھے ہوئے بہت عرصہ ہوا۔ بہت بدل گئے۔ کہئے مزاج کیسا ہے۔ (حاجی داؤد سے تیسرے مہان کی طرف اشارہ کرکے) آپ کی تعریف کیجیے۔

حاجی داؤد۔ آپ مولوی دبیر احمد صاحب وکیل ہیں۔ بڑے لائق ہیں۔ کام شروع کئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا لیکن کافی نام پیدا کر لیا ہے۔

منشی کمال الٰہی۔ ماشاء اللہ بیشک آپ نئے ہوں گے۔ مجھے نیاز حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔

حاجی داؤد۔ منشی صاحب آپ کو تکلیف دینے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو علم ہوگا کہ رشید میاں عرصہ سے غائب و روپوش تھے۔ ان کے والد نے ہر چند جستجو کی یہ ہاتھ نہ آئے۔ ان کی مصلحت یہ جانیں بہر حال اب ان کو آپ کے رنگون سے واپس آنے کا حال معلوم ہوا ہے تو یہ آپ سے ملنے آئے ہیں کہ اپنے والد کے حالات دریافت کریں۔

منشی۔ بیشک بیشک۔ منشی محمد فرید صاحب خدا ان کو خوش رکھے اور مقاصد میں کامیاب فرمائے خوب آدمی ہیں۔ رنگون میں خوب کام چلایا۔ بہت ترقی کی سال بھر ہوا یکایک ان کو خیال پیدا ہوا کہ حج کرنا چاہئے۔ نہ صرف حج بلکہ ترک ہندوستان کرکے حرمین شریفین ہی میں بقیہ زندگی گزار دیں۔ میں نے ارادۂ ہجرت کی مخالفت بھی کی۔ مگر آپ جانتے ہیں عجیب مضبوط ارادے کے انسان ہیں نہ مانے۔ آخر کار دربار ختم کرکے نقد روپیہ حاصل کر لیا اور تشریف لے گئے۔ آپ واقف ہیں کہ میں نے سالہا سال ان کی خدمت میں صرف کر دئے۔ میں اس قابل تو نہ تھا لیکن انھوں نے میرا حق فراموش نہیں کیا۔ اور مجھے برابر کا شریک گردانا۔ حاجی صاحب کہتے ہوئے میرا دل دکھتا ہے لیکن خدا جانے کیوں وہ رشید میاں سے خوش نہ تھے۔ ان کے ذکر پر بھی تُرش رُو ہو جاتے تھے

مجھے ہمیشہ اس بات سے رنج ہوتا تھا۔

رشید۔ منشی صاحب اگر سوءِ ادب نہ سمجھیں تو میں ابا میاں کی وہ تحریر دیکھنا چاہتا ہوں جو آپ کے نام ان کا ہبہ نامہ ہے۔

منشی۔ ضرور ضرور۔ بھلا اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ کھلا معاملہ ہے۔ دستخطی تحریر ہے لیجئے۔ شوق سے دیکھئے۔

یہ کہہ کر منشی کمال الہٰی نے میز کی دراز کا قفل کھولا۔ ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے ایک کاغذ نکال کر رشید کو دے دیا اور کہا۔

منشی۔ رشید میاں آپ یقین نہ کریں گے لیکن مجھے واقعی افسوس ہے کہ آپ کے والد صاحب نے آپ کو کچھ حصہ نہ دیا۔ مجھے آپ کے والد سے خلوص و محبت کے تعلقات تھے تو آپ کو بھی دل سے عزیز رکھتا ہوں اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کی خدمت کرنے کے لئے خوشی سے تیار ہوں۔

رشید۔ (کاغذ سے منشی کی طرف نگاہ اٹھا کر) منشی صاحب آپ کے کرم کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن آپ اس کا تصور بھی نہ فرمایئے۔ اگر ابا میاں نے دینا پسند نہ کیا تو میں اسی مال کو اس طرح لینا کیونکر پسند کر سکتا ہوں۔

یہ کہہ کر رشید نے پھر غور سے ہبہ نامہ کو دیکھنا شروع کیا۔ دیر تک غور کرنے اور سوچنے کے بعد کاغذ سے نظر ہٹائی اور ایک گہرا سانس لیا۔ جس کو منشی کمال الہٰی نے مایوسی کا سانس سمجھا۔ حاجی داؤد نے رضا بقضا کا لیکن مولوی دبیر احمد وکیل کے ذکی دماغ نے اس سانس کو عقدۂ مشکل کے احساس پر محمول کیا اور کہا کہ "اس تحریر کو میں دیکھ سکتا ہوں؟"

رشید نے کاغذ وکیل صاحب کو دے دیا۔ وکیل صاحب نے ہبہ نامہ کو اونچا اٹھا کر اپنے منہ کے سامنے کر لیا اور پڑھنے لگے۔ رشید ان کے برابر ہی کرسی پر بیٹھا تھا منشی صاحب اور حاجی صاحب میز کے دوسری طرف ان کے

مقابل بیٹھے تھے۔ حاجی داؤد نے غالباً بالقصد منشی صاحب کو باتوں میں لگا لیا۔ لیکن منشی کے کان حاجی صاحب کی طرف تھے۔ اور آنکھ وکیل و رشید کی طرف۔ وکیل نے تحریر کے دستخط پر انگلی رکھ کر نیچے گھٹنے سے رشید کے گھٹنے کو دبایا۔ رشید وکیل کے ہاتھ میں کاغذ کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے اور نگاہ کو بدستور قائم رکھ کر وکیل کے پاؤں کو اپنے پاؤں سے دبایا۔ یہ اشارہ باقی دونوں صاحبوں کے لئے بالکل غیر محسوس تھا لیکن وکیل کے نزدیک اس کنایہ میں تصریح کی دنیا مضمر تھی۔ وکیل صاحب جلدی سے اُٹھے اور کاغذ کو لئے ہوئے باہر دھوپ میں چلے گئے اور یہ کہتے گئے کہ "ذرا میں روشنی میں دیکھ لوں"۔ منشی صاحب گھبرا کر اُٹھنا چاہتے تھے لیکن حاجی صاحب نے یہ کہہ کر بٹھا لیا کہ "تشریف رکھئے۔ وکیل صاحب ابھی آتے ہیں"۔

وکیل صاحب نے کاغذ کو آفتاب کی طرف اُٹھا کر دیکھا تو اُس میں آبی حروف میں کاغذ بنانے کے کارخانہ کا نام "سلطان پیپرز لمیٹڈ بمبئی" لکھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر تاریخ تحریر پر نظر ڈالی تو ۱۲ر جولائی ۱۹۲۶ء تھی۔ وکیل صاحب نے ایک لمحہ کچھ سوچا اور کاغذ کو لئے ہوئے اندر چلے آئے اور بجائے کرسی پر بیٹھنے کے میز کے پاس کھڑے ہو گئے۔ اور بولے

وکیل منشی کمال الٰہی صاحب اس کا جواب دیجئے کہ آپ نے منشی محمد فرید صاحب کی طرف سے یہ جعلی تحریر کیوں لکھی؟

منشی کے حواس وکیل کی صورت دیکھتے ہی غائب ہونے لگے تھے تاہم ضبط کر کے جواب دیا۔

منشی۔ وکیل صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیسا جعل؟

وکیل۔ یہ تحریر ۱۲ر جولائی ۱۹۲۶ء کو لکھی گئی ہے اور جس کاغذ پر لکھی گئی ہے وہ "سلطان پیپرز لمیٹڈ بمبئی" کا بنایا ہوا ہے۔ آپ کی بدقسمتی یہ کہ یہ کارخانہ ۲۵ر اپریل ۱۹۲۸ء کو قائم ہوا ہے اور میری خوش قسمتی یہ کہ میں اس کارخانہ کا حصہ دار ہوں اور اس کے افتتاحی جلسہ میں شریک تھا دستخط کا جعل ثابت کرنا بھی چنداں دشوار نہ ہوتا۔ لیکن کاغذ نے تو زبان حال ہی سے سارا ماجرا کہہ دیا۔"

اب منشی کمال الٰہی کی حالت قابلِ دید تھی۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور چہرے پر خوف و ندامت غیبی روشنائی سے لکھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بالکل سکوت طاری رہا۔ آخر وکیل صاحب ہی بولے۔

وکیل۔ منشی صاحب میرے مؤکل منشی محمد رشید صاحب سخت گیر آدمی نہیں ہیں۔ چونکہ معاملہ تنہائی و خلوت میں طے ہو گیا ہے۔ اس لئے افشا و اعلان کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی بنیک کی پاس بک نکالئے۔

منشی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پاس بک نکال کر میز پر رکھ دی وکیل صاحب نے اس کی ورق گردانی کر کے رشید کے سامنے پاس بک رکھ دی اور کہا

وکیل۔ اس میں نو ہزار روپیہ باقی ہیں۔ میری رائے یہ ہے اگر آپ بھی پسند کریں کہ باقی ایک ہزار کی کوئی باز پرس نہ کی جائے۔

رشید۔ میں بخوشی راضی ہوں۔

وکیل۔ (منشی سے) منشی صاحب آج ۲۹ رمضان ہے۔ کل غالباً عید ہو جائے گی اور بنیک بند ہو نگے رشید صاحب کو آج ہی روانہ ہو کر کل صبح اپنے بیوی بچوں میں عید کرنی ہے۔ وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں۔ ساڑھے دس بجے ہیں اسی وقت بنیک تشریف لے چلئے اور یہ رقم رشید صاحب کے نام منتقل کر دیجئے۔

رات کے دو بجے ہیں۔ رشید ریل گاڑی میں سوار چلا جا رہا ہے۔ چاند ہو گیا۔ کل عید ہے۔ رشید ہر چند کوشش کرتا ہے کہ تھوڑی دیر نیند آ جائے لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہیں۔ آج کا دن رشید کی زندگی میں عجب ہنگامہ خیز و انقلاب آفریں گزرا ہے۔ مفلس رشید آج ہزاروں کا مالک ہے۔ پاس بک ہینڈ بیگ میں اور پانچ سو کے نوٹ جیب میں ہیں بیوی بچہ کے لئے تحفے اور بیوی کے لئے نئے سونے کے کڑے ساتھ ہیں۔ لیکن رشید کے دل میں غرورِ دولت کا شائبہ

بھی نہیں۔ خدا کی قدرت پر حیرت اور اُس کے فضل و رحمت پر شکر کر رہا ہے۔ اس انقلاب سے اس کو کوئی خوشی ہی تو عتیقہ اور شفیق کی خاطر۔ ساتھ ہی بار بار خیال آ رہا ہے کہ آبا میاں کی قدمبوسی نصیب نہ ہوئی۔ اِن سے قصور معاف کرا لیتا۔

خدا جانے کتنی دیر ان خیالات میں رہا ہوگا کہ یکایک بہت زور کا دھکا لگا اور رشید بنچ سے نیچے گر پڑا۔ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ متواتر صدموں ٹکروں۔ شور و غوغا سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ گاڑیوں میں تصادم ہوگیا۔ رشید اِنّا لِلّٰہِ کہتا ہوا بڑی مشکل سے کھڑا ہوا اور ہینڈ بیگ کو ٹٹول کر ہاتھ میں مضبوط پکڑا اور گاڑی سے باہر نکلنے کی کوشش کی نہایت دشواری سے تختوں شیشوں کی خراشیں سہتا ہوا باہر نکلا تو عجب عالم برپا تھا۔ معلوم ہوا کہ اَپ اور ڈاؤن دونوں گاڑیاں لڑ گئیں۔ دونوں گاڑیوں کے مسافروں پر جو گزر رہی تھی قابلِ بیان نہیں۔ رشید زخمی مسافروں اور شکستہ اسباب کے انبار سے گذرتا ہوا جا رہا تھا کہ قریب ہی سے ایک آواز آئی "ارے مجھے اُٹھاؤ" رشید ٹھٹک کر آواز کی طرف متوجہ ہوا تو پھر آواز آئی "ارے کوئی مجھے تو نکالو" رشید نے دیکھا کہ ایک بڑے تختے کے نیچے ایک شخص دبا ہوا ہے جلدی سے تختے کو زور لگا کر سرکایا اور اس شخص کو سہارا دینے کے لئے جھکا۔ تو بیساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

"آبا میاں!"

وہ شخص۔ کون؟ بیٹا رشید!

رشید۔ جی میں ہوں رشید۔ آئیے۔ چوٹ تو نہیں لگی؟

منشی فرید (اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) شکر ہے ٹانگوں میں تو چوٹ نہیں لگی۔ شانے میں درد ہو رہا ہے۔ بیٹا تم بھی گاڑی میں تھے؟ تمہارے چوٹ تو نہیں لگی؟

رشید۔ میں اَپ ٹرین میں تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہیں چوٹ نہیں آئی۔ آپ ڈاؤن ٹرین کے پاس تھے اسی میں ہوں گے آپ میرے شانے پر سہارا لگا لیجئے۔ چلئے یہاں سے نکل چلیں۔

رشید ایک ہاتھ میں بیگ لئے دوسرے سے باپ کو سہارا دیئے حدودِ تصادم سے باہر آیا اتفاق سے قریب ہی سڑک مل گئی۔ اس کے کنارے ایک درخت کے نیچے دونوں بیٹھ گئے۔

رشید۔ ابا میاں آپ کو کچھ تکلیف تو نہیں؟

منشی فرید۔ نہیں بیٹا۔ کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہے۔ بیٹا تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔

رشید۔ میں سب کچھ عرض کروں گا۔ آپ کے ساتھ اسباب کیا تھا۔ وہ تو رہ ہی گیا۔

منشی فرید۔ یہ بھی اللہ کا کرم ہوا کہ میں نے اپنا تمام سامان آدمی کے ساتھ صبح روانہ کر دیا تھا۔ میں ایک ضرورت سے دوسری گاڑی کے لئے رہ گیا تھا۔

رشید۔ ابا میاں میں نے سنا تھا کہ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے

منشی فرید۔ بیشک چلا گیا ہوتا۔ تیار تھا لیکن منشی کمال الٰہی نے دغا کی۔

رشید۔ کیسے؟

منشی فرید۔ قصہ تو طویل ہے۔ پھر کہوں گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ میں نے کاروبار ختم کرکے سب کو نقد روپیہ بارہ ہزار لے لیا۔ اس میں سے دو ہزار منشی کو اس کا حق الخدمت دیدیا۔ دس ہزار لے کر وطن جانے کا ارادہ تھا کہ پانچ ہزار تمہارے نام جمع کرکے پانچ ہزار لے کر چلا جاؤں میرا ایک ہزار روپیہ ایک شخص پر قرض تھا۔ وعدے پر اس کو وصول کرنے کے لئے خود گیا تھا۔ منشی بھی ساتھ تھا۔ روپیہ وصول کرکے ہم دونوں واپس آرہے تھے کہ ریل گاڑی لڑ گئی۔ بیٹا میرے لئے یہ تصادم نیا نہیں ہے۔ اس مرتبہ میں سخت زخمی ہوا۔ بچنے کی اُمید نہ رہی تھی۔ مہینوں شفاخانہ میں پڑا رہا۔ زندگی تھی کہ بچ گیا اب واپس جاتا ہوں تو نہ روپیہ ہے نہ منشی۔ مجھے تصادم کے وقت بھی اتنا خیال تھا کہ منشی کے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہوگا۔ اور اب تقریباً ایک سال تک میرے غائب رہنے کی وجہ سے میری موت کا یقین ہو گیا ہوگا۔ اب گھر جا رہا تھا کہ یہ تصادم پیش آیا۔ اس تصادم

میں روپیہ کھویا تھا۔ اس تصادم میں اس سے عزیز تر بیٹا پا لیا۔ (یہ کہہ کر آبدیدہ ہو گئے)۔

رشید۔ (بھرائی ہوئی آواز سے) ابا میاں اس تصادم میں آپ نے وہ کھویا ہوا روپیہ بھی پا لیا۔

منشی فرید۔ (متحیر ہو کر) وہ کیسے؟

اتنے میں دور سے ایک موٹر لاری کی آواز آئی۔ رشید یہ کہتا ہوا کہ "میں عرض کرونگا" کھڑا ہوا۔ لاری قریب آئی تو رشید نے چلا کر ڈرائیور سے روکنے کو کہا۔ اول تو اس نے کچھ پروا نہ کی۔ لیکن تھوڑی دور چل کر موٹر لاری ٹھہر گئی۔ رشید دوڑ کر گیا چند لمحوں میں ضروری معلومات حاصل کر کے واپس آیا اور باپ کو لے گیا۔ دونوں لاری میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

(۴)

عید کا دن ہے۔ صبح کے ۸ بجے ہیں۔ شفیق صبح سے اٹھا ہوا ہے۔ عتیقہ شاید رات بھر جاگتی رہی ہے۔ دودھ سویاں صبح ہی صبح تیار کر رکھی ہیں۔ شفیق بار بار پوچھتا ہے "ابا نہیں آئے۔ کب آئیں گے؟" عتیقہ صبح سے تو یہی کہتی رہی کہ "ابھی گاڑی کا وقت نہیں ہوا۔ آتے ہی ہوں گے"۔ لیکن گاڑی ساڑھے چھ بجے آتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی تاخیر سے وہ بھی اب پریشان سی ہے۔ ہر تانگہ اکہ کی آواز پر شفیق دوڑ کر جاتا ہے اور مایوس پھر آتا ہے۔ اب کے ایک موٹر کار کی آواز آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ دروازے پر آ کر رک گئی۔ شفیق چلایا "ابا آئے" دوڑ کر جانا چاہتا تھا کہ عتیقہ نے یہ کہہ کر روک لیا کہ "یہ تو موٹر کی آواز ہے۔ خدا جانے کس کی ہے۔ کیوں ٹھہری ہے"۔

ابھی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور رشید یہ کہتا ہوا داخل ہوا۔ "شفیق دادا ابا تشریف لاتے ہیں۔ ابا میاں آئیے۔ اندر آ جائیے"۔

اب رشید کے گھر کی عید کا کیا پوچھنا! شفیق دوڑ کر باپ سے چمٹ گیا۔ "ابا بڑی دیر میں آئے"۔

رشید۔ غنیمت جانو کہ خیریت سے آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا ورنہ عید کیا جان کے لالے تھے۔

ریل گاڑی لڑی۔ موٹر لاری میں پنکچر ہوا۔ سو میل سے زیادہ فاصلہ طے کرنا باقی تھا۔ اتفاق سے ایک کار مل گئی۔ کرایہ اس نے منہ مانگا وصول کیا لیکن شکر ہے کہ عید کی نماز سے پہلے پہنچا دیا۔

ابھی یہ باتیں اور تفصیلیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا رشید گیا تو دروازے پر ایک صاحب کھڑے تھے ادھیڑ عمر، پستہ قد۔ دہرا جسم۔ عینک لگائے۔ نیچی باڑہ کی ترکی ٹوپی اور چوڑے پائنچوں کا سفید پاجامہ اور نہایت قیمتی سرج کی شیروانی پہنے ہوئے۔ رشید سے مصافحہ کر کے نام کی تصدیق چاہی اور کہا۔ میں آگرہ سے آیا ہوں۔ آپ سے نماز عید کے بعد ملنے کا ارادہ تھا۔ اس وقت عیدگاہ جاتے میں ادھر سے گزرا تو دروازے پر آپ کا سائن بورڈ نظر آیا۔ سوچا کہ نماز میں دیر ہے ابھی ملتا چلوں۔ بار امانت سے سبکدوشی ہو جاوے۔ میں **بزم ادب آگرہ** کا ممبر اور خزانچی ہوں۔ آپ کی کتاب "فردوس زمیں" بزم ادب نے پسند کر لی (واسکٹ کی جیب میں سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے) اس کے معاوضہ میں یہ چک ایک ہزار روپیہ کا آپ کو بھیجا ہے۔ مہربانی فرما کر باقاعدہ رسید عنایت فرمائیے"

رشید نے شکریہ ادا کر کے کہا کہ آپ تشریف رکھئے۔ سویاں پیش کرتا ہوں۔ عیدگاہ میں بھی ساتھ چلوں گا۔

رشید اندر آیا اور یہ کہہ کر باپ کے ہاتھ میں چک دے دیا "لیجئے ابا میاں! وہ دینے پر آتے ہیں تو پھر بس نہیں کرتے۔ عِیدٌ وَعِیدٌ وَعِیدٌ صِرْنَ مُجْتَمِعَہ"۔

(مطبوعہ عالمگیر لاہور عید نمبر ۱۹۳۰ء)

عجیب جدّت

اس فاقد الجدّت اور محرومِ ذہانت ملک میں معمولی جرائم کا ارتکاب اس قدر پامال اور یکساں طریقوں سے ہوتا رہتا ہے کہ جب دنیائے جرائم کی کوئی اختراع فائقہ سامنے آتی ہے تو ہم پولیس افسروں کے لئے جن کو تفتیش و انسداد جرائم کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ مقوی اعصاب کشتہ سے کم ثابت نہیں ہوتی۔ واقعہ زیر عنوان جس سے زیادہ عجیب کارروائی کبھی میرے سامنے نہیں آئی۔ ہمیشہ مجھے یاد رہے گا۔ لیکن اس واقعہ سے میری خاص دلچسپی کا سبب ایک اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اسی واقعہ کی تفتیش کے دوران میں مجھے پہلی مرتبہ مشہور و نامور سراغرساں عاقل خاں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

میں افواہیں سنا کرتا تھا کہ یہ حیرتناک انسان اپنے کمرے میں بیٹھا بیٹھا بڑے بڑے امیروں کے گم شدہ جواہرات کا سراغ لگا دیتا ہے اور رئیسوں اور بیگموں کے راز سربستہ اس کی مٹھی میں ہیں۔ اور یہ سب کام ایسی ساحرانہ قوت اور معجزانہ ذہانت کے ساتھ انجام دیتا ہے کہ نہ کسی پولیس مین کو بیٹی کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے نہ کسی جج کو کلاہ عدالت سر پر کج رکھنے کی۔

ان خبروں پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن مجھے حیرت ضرور تھی اس لئے بڑی مسرت ہوئی جب میرے ایک پرانے ہم مکتب کے حیرت انگیز قصہ نے مجھے اپنے اس اشتیاق کو پورا کرنے کا موقعہ دیا۔ میں نے اپنے دوست جہانگیر سہراب جی کو چار برس سے نہ دیکھا تھا وہ افریقہ میں تجارتی کاروبار کے لئے گیا ہوا تھا۔ جب وہ میرے دفتر پولیس میں جہاں میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر پولیس مامور ہوں داخل ہوا تو میں اس کو پہچان نہ سکا۔ وہ جب بمبئی سے گیا تھا تو جوان تھا اور اب اپنے خستہ جسم اور مضمحل چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دور شباب سے بہت دور نکل گیا ہے۔

"یار تم نے اچھا کاروبار کیا کہ اپنی زندگی ہی تباہ کر لی" میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "تم کو ٹھیکے کا کام ختم ہوتے ہی واپس آجانا چاہئے تھا۔ لیکن سنا ہے کہ تم وہاں سونا کھودنے کی فکر میں لگے رہے"

"میں خدا سے چاہتا ہوں کہ واپس آگیا ہوتا۔ مقبول! ہائے مجھے کس قدر حسرت ہے کہ کیوں نہ آگیا" اس نے نہایت دردناک لہجہ میں کہا "ممکن ہے کہ میں اس خوفناک واقعہ کی پیش بندی کر سکتا۔ تم کو شیریں بائی یاد ہے؟"

میں نے سر کے اشارے سے اقرار کیا۔ یہ خوبصورت لڑکی جس سے وہ منسوب ہو چکا تھا۔ میری یاد میں تازہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جس شخص نے اس کو ایک بار دیکھ لیا ہے پھر بھول نہیں سکتا۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کچھ عرصہ سے وہ ان حلقوں اور جلسوں میں نظر نہیں آئی جہاں وہ ملکہ حسن بن کر دلوں پر حکومت کیا کرتی تھی۔

یکایک جہانگیر نے میز پر کہنی رکھی اور ہاتھوں میں سر پکڑ کر رونے لگا۔ اس کا تمام جسم تھرا رہا تھا۔ کس قدر دردناک نظارہ تھا کہ ایسا قوی جوان بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ دفعتہً اس نے سر اٹھایا اور اس طرح بولا گویا اس گریہ طفلانہ سے نادم نہیں ہے۔

"مقبول جنوبی افریقہ نے مجھے تباہ نہیں کیا۔ مہینہ بھر ہوا جب میں جہاز سے اترا تھا تو نہایت قوی تندرست بشاش و مسرور تھا۔ اپنی تباہی کا قصہ اب بیان کرتا ہوں اور یاد رکھو میں تم سے تمہارے پیشہ کی امداد لینے آیا ہوں"

اس نے جو داستان بیان کی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ فوراً شیریں بائی کے مکان پر گیا جو ایرانی روڈ میں واقع ہے ملازم سے معلوم ہوا کہ وہ مکان پر موجود نہیں ہے۔ اپنا کارڈ نوکر کو دے کر چلا آیا کہ پھر آؤں گا۔ دوسرے دن گیا تو نوکر نے صاف کہہ دیا کہ شیریں بائی موجود ہے لیکن کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ اس نے پوچھا کہ کارڈ دیدیا تھا۔ نوکر نے اثبات میں جواب دیا۔ اور فوراً دروازہ بند کر لیا۔ جہانگیر واپس آیا اور نہایت اشتیاق آمیز خط لکھا کہ تھوڑی دیر کے لئے ملاقات کا موقع دیا جائے اور یہ بتادیا جائے کہ ایسے وفادار عاشق سے جو صرف اس امید پر ہندوستان واپس آیا ہے کہ اس سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ بدستور قائم و مستحکم ہوگا اس غیر متوقع سلوک کا کیا سبب ہے تین دن تک جواب کا انتظار کیا لیکن منتظر و محروم رہا۔

اس کے بعد جہانگیر اپنی ایک رشتہ دار عورت کے پاس گیا جو شیریں اور جہانگیر دونوں کی راز دار تھی۔ اور جس مکان پر افریقہ جانے سے پہلے اکثر شیریں سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیریں بائی کچھ عرصہ سے گوشہ نشین ہوگئی ہے اور کسی سے نہیں ملتی۔ اور اب اس کی ترکِ دنیا کا واقعہ اس قدر معمولی ہوگیا ہے کہ کوئی شخص اس کا ذکر بھی نہیں کرتا۔

اب جہانگیر نے شیریں کے مکان کے گرد گھومنا شروع کیا کہ شاید باہر آتی جاتی مل جائے یا کھڑکی میں سے اس کی صورت نظر آجائے۔ ایک ہفتہ گذر گیا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا سوائے اس علم کے کہ پرانے ملنے والوں کی آمد و رفت بالکل مسدود ہے۔ صرف ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک شخص گاڑی سے اُترا جو بظاہر کسی ڈاکٹر کی گاڑی معلوم ہوتی تھی۔ اور فوراً مکان کے اندر بلا لیا گیا۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ شاید بیمار ہو۔ دروازے پر جاکر دریافت کیا تو ملازم نے کہا بالکل تندرست ہے۔ جہانگیر نے مکان کا طواف اور نگرانی جاری رکھی آخر ایک دن شام کے وقت اس کی اُمید بر آئی۔ لیکن ایسی حقیقت کا انکشاف ہوا جس سے اس کا خون خشک ہوگیا۔

"میں نے دیکھا،، جہانگیر نے میری طرف نظر اُٹھا کر کہا: کہ ایک عورت صدر دروازے سے نکلی اور تیزی سے سڑک پر ہولی۔ اس کے قد و قامت اور انداز رفتار سے میرے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور میں جلدی سے اس کے پیچھے دوڑا کہ آج اس خلجان و اضطراب کا فیصلہ کر لوں۔ مجھے کامل یقین تھا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو میری بیوی بننے والی تھی۔ اور جو بازار کاروبار اور مسکن راحت و آرام میں کبھی میرے دل سے محو نہیں ہوئی۔ جب وہ سڑک کے لیمپ کے قریب پہنچ گئی تو میں نے آواز دی۔ "شیریں تم مجھ سے نہ بولوگی؟ نہ بتاؤ گی کہ میری تمہاری محبت کے درمیان کیا بات حائل ہوگئی ہے؟"

وہ ایک متحیرانہ صدائے اضطرار کے ساتھ مڑی۔ اپنے چہرے کے نقاب کا گوشہ پکڑ کر آن واحد کے لئے اُٹھا اور پھر چہرے پر ڈال لیا۔ میں ایک سکنڈ اس کے چہرے پر نظر ڈال سکا۔ لیکن آہ میں کیا بتاؤں کیا دیکھا۔ اس سے زیادہ خوفناک منظر نہ پہلے کبھی دیکھا تھا نہ آئندہ کبھی نظر آنے کی اُمید ہے۔ اس کے حلیہ میں

میری محبوبہ کی خفیف سی مشابہت موجود تھی۔ ورنہ وہ چہرہ انسان کا نہیں بلکہ درندہ کا تھا۔ ایک دحشت ناک ہیبت ناک شیرنی کا چہرہ تھا جو نقاب کے اندر چھپا ہوا تھا۔ تاہم یہ دردناک حقیقت ہے کہ اس کے اصلی چہرے کی مشابہت موجود تھی اور جس آواز میں اس نے مجھ سے خطاب کیا وہ اسی کی آواز تھی۔

"جہانگیر" اس نے کہا: "مجھے نہایت رنج ہے۔ لیکن تم چلے جاؤ اور پھر کبھی میرے قریب نہ آنا۔ اگر تم نے نہ مانا تو میں اپنے تئیں ہلاک کردوں گی۔ جاؤ۔ بس چلے جاؤ"

میں کیا کرسکتا تھا۔ وہاں سے چلا آیا لیکن کس مشکل سے گھر تک پہنچا۔ اب بھی جب کبھی اس نقاب پوش چہرے کا خیال آجاتا ہے کانپ اُٹھتا ہوں۔

یہ کہہ کر جہانگیر پھر ہاتھوں پر سر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک سپاہی رپورٹ لیکر آگیا اور مجھے احساس ہوا کہ میرا وقت پبلک کی ملکیت ہے۔ اردلی کے جانے کے بعد اس نے پھر بیان کرنا شروع کیا۔ جہانگیر کی وہ تمام رات بیداری میں گذری اور یہی سوچتا رہا کہ یہ عورت وہی شیریں بائی تھی یا کوئی اور عورت اس کی قائم مقام بن گئی ہے آخر صبح ہوگئی۔ عاقل خاں کی کامیاب سراغرسانی کی بڑی تعریف سُنی تھی۔ اس کے پاس پہنچا۔

"حیرتناک انسان ہے وہ" اس نے کہا" مجھے دیکھتے ہی اس نے بتادیا کہ میں حال ہی میں افریقہ سے واپس آیا ہوں۔ اور یہ بات اس نے میرے چہرے کی رنگت سے جو تمازت آفتاب نے پیدا کردی ہے اور میری ہاتھوں کی حالت سے جو میرے کاروبار میں ہوجاتی ہے دریافت کرلی۔ لیکن میرا عقدہ حل نہ ہوا۔ میں نے اپنی تمام داستان اسی طرح بیان کی جیسے تمہارے سامنے دہرائی ہے۔ اور آج اس نے رپورٹ لکھ کر دی ہے۔"

"کیا؟" میں نے کسی قدر بے صبری سے دریافت کیا۔ اس لئے کہ اس کے قصہ سے میں نہایت متاثر ہوگیا تھا۔ میں یہ بات کہتے کہتے رُک گیا کہ ممکن ہے عاقل خاں نے تمہارے واپس آنے کی خبر اخبارات سے معلوم کرلی ہو۔

"قتل ہوا ہے مقتول!" جہانگیر نے غمزدہ آواز سے جواب دیا۔ "عاقل خاں کی تحقیقات نے اس امر میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ جو عورت شیریں کے مکان واقع ایرانی روڈ میں رہتی اور اس کا نام اختیار کئے ہوئے ہے غاصب و غدار ہے یہ بات سراغرساں نے اس عورت کی دستی تحریر سے ثابت کر دی ہے۔ یہ تحریر ان خطوط سے ملائی گئی جو شیریں بائی نے زمانۂ معاشقہ میں مجھے لکھے تھے دونوں میں خفیف سی مشابہت پائی جاتی ہے۔"

میرے عملی دماغ نے فوراً یہ سوال سجھایا۔ "اس کے بینک کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ وہ دولتمند عورت تھی اور خود ہی اپنے تمام معاملات انجام دیا کرتی تھی۔ دوسرے کاروباری کاغذات کو نظرانداز کر دیا جائے تب بھی چک ایسی چیز ہیں کہ ان پر اس کے دستخط کا اختلاف فوراً محسوس ہو جانا چاہیئے۔"

"یہی وہ بات ہے جہاں عاقل نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔" جہانگیر نے جواب دیا۔ "اس نے ثابت کیا ہے کہ ایک سال کا عرصہ ہوا شیریں بائی کے بینک اور مشیر قانونی یکایک بغیر کسی سبب ظاہر کے تبدیل کر دیئے گئے۔ وہ لوگ ایک مالدار مؤکلہ سے قطع تعلق ہو جانے پر نہایت متاسف و آزردہ خاطر ہوتے۔ لیکن چونکہ تبدیلی بالکل باقاعدہ ہوئی تھی اور شیریں نے بذات خود یہ کام انجام دیا تھا اس لئے کسی کو کوئی عذر نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن عاقل خاں کا سب سے بڑا کارنامہ اثباتِ قتل ہے۔ میں اس کی مکمل رپورٹ تمہارے پاس چھوڑ دوں گا۔ فرصت میں اس کو پڑھنا۔ بہرحال اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسی زمانہ میں جب بینک اور وکلا تبدیل کئے گئے۔ شیریں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے دیہاتی مکان واقع یزداں نگر کو چلی گئی۔ وہاں چھ مہینے رہی اور پھر اپنی ہی گاڑی میں ایرانی روڈ واپس آ گئی۔ لیکن قابل توجہ یہ بات ہے کہ سراغرساں نے دیہاتی مکان کے باغ میں ایک عورت کی لاش زمین سے کھود کر نکالی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے میری طرف اس امید میں دیکھا کہ میں اس امر کی تصدیق کر دوں گا کہ جو عورت ایرانی روڈ میں شیریں بائی کے نام سے قیام پذیر ہے اس نے شیریں کو قتل کر کے باغ میں دفن کر دیا ہے۔ لیکن میں صرف اتنا ہی تسلیم کر سکا کہ یہ معاملہ بے شبہہ نہایت عجیب اور پیچیدہ ہے۔

"لیکن یہ بتاؤ" میں نے کہا "کہ اس واقعہ کا کیا سبب ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہیں دیکھتے ہی تمہارا نام لیکر تخاطب کیا"

جہانگیر نے جواب دیا کہ "مکان کے اندر میرے متعدد فوٹو موجود ہیں اور کوئی شخص اتنا بڑا فریب نہیں دے سکتا جب تک ہر حیثیت سے مسلح نہ ہو"

میں سمجھتا ہوں کہ تم باہر سے بھی شیریں بائی سے خط و کتابت کرتے رہے ہو۔ اس کا آخری خط کب وصول ہوا تھا؟"

"اٹھارہ مہینے ہوئے۔ ٹھیکے کی غرض سے (مینزی واقع افریقہ) کے جنگلوں میں رہنا پڑا تو ڈاک اور ڈاک خانوں سے بالکل قطع تعلق ہو گیا تھا"

اب عجیب عقدۂ مشکل میرے سامنے تھا۔ اختلافِ تحریر کا معمہ کسی طرح حل نہ ہوتا تھا۔ نہ یہ ثابت ہوتا تھا کہ تحریر کا تغیر دفعۃً ہوا یا بتدریج۔ نہ اس کے آغاز کا زمانہ معین کیا جا سکتا تھا۔ اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی معلوم ہوا کہ مجھ کو فوراً چیف کمشنر کے پاس حاضر ہونے کی ضرورت ہے۔ میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"تم نے لوہے کے چنے چبانے کے لئے دیئے ہیں۔ بہرحال میں تمہارے سراغ رساں کی رپورٹ پڑھنے کے بعد کارروائی شروع کر دوں گا اور ایک نہایت قابل افسر پولیس کی امداد بھی حاصل کر دوں گا۔ چونکہ عاقل خاں پرائیویٹ اور غیر سرکاری آدمی ہے۔ اس لئے اس کے دعووں اور بیانوں کی ہم کو تحقیق و تصدیق کرنے کی ضرورت ہو گی"

"یہی اس نے کہا تھا" جہانگیر نے جواب میں کہا۔ کہ "بجائے اس کے کہ اس عورت کو فوراً گرفتار کرو تم اپنی تحقیقات شروع کر دو گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کو اطلاع ہو جائے گی اور وہ فرار ہو جائے گی"

میں نے اس کو اطمینان دلایا اور رخصت ہو کر چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد پھر اپنے دفتر میں واپس آیا اور سراغ رساں کی رپورٹ پڑھنی شروع کی۔ بہت طویل اور بدخط تھی لیکن حالات نہایت صفائی کے ساتھ بیان کئے گئے

تھے۔ ختم کرنے کے بعد سمجھ میں آگیا کہ گرفتاری کے لئے جہانگیر کے اضطراب و عجلت کا کیا سبب تھا۔

عاقل خاں نے نہایت باقاعدہ تحقیقات کی تھی شیریں بائی کے پاس دیہات کے قیام میں ایک ہی ملازم کوچین تھا۔ عاقل نے سب سے پہلے اسی سے گفتگو کی۔ وہی کوچ مین اپنی مخدومہ کو روشنک منزل (گاؤں کے مکان) میں گاڑی لے گیا تھا۔ اور وہی زمانہ قیام کے اختتام کے بعد واپس لایا تھا۔ اس کا پتہ رپورٹ میں درج تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ اب وہ کسی اور شخص کے پاس ملازم ہے۔ اس کوچ مین کا نام بہمن تھا۔ اس شخص نے بہت صاف بیان دیا۔ اس نے تسلیم کیا کہ شیریں بائی کی شکل میں تغیر اس نے بھی محسوس کیا تھا۔ وہ بہت احتیاط سے ہر وقت نقاب ڈالے رہتی تھی لیکن ایک مرتبہ باغ میں بغیر نقاب کے ٹہل رہی تھی تو اس نے یہ وحشتناک و نفرت انگیز حلیہ دیکھا تھا۔ اس قلب ماہیت کے یکایک یا بتدریج ہونے کے متعلق سوال کرنے پر اس نے دفعتہً واقع ہونے کا خیال ظاہر کیا۔ وہ کوئی زمانۂ تغیر معین نہ کرسکا۔ لیکن یہ بیان کیا کہ گاؤں جاتے وقت اس نے دیکھا تھا کہ چہرہ اصلی حالت پر تھا۔ گاؤں میں پہنچکر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نے نقاب کا استعمال شروع کردیا۔

احباب و متعارفین کی آمد و رفت کے متعلق اس نے بہت زور کے ساتھ نفی میں جواب دیا۔ اور از خود یہ بھی بیان کیا کہ اس مکان میں اس کے اور مالکہ مکان کے علاوہ ایک بوڑھی عورت اور اس کی لڑکی بھی ملازم تھیں جو کھانا پکانے اور گھر کا کام کرنے پر متعین تھیں۔ اس نے سُنا تھا کہ یہ عورتیں عارضی طور پر رکھی گئی ہیں اور زمانۂ ملازمت ختم ہونے کے بعد پونہ جانے والی ہیں۔

بہمن سے گفتگو کرکے سراغرساں روشنک منزل پہنچا۔ مکان خالی تھا۔ بہت کچھ تفتیش و تحقیق کے بعد باغ میں ایک قبر کے نشانات ملے اور اس میں ایک عورت کی لاش نہایت کرم خوردہ و بوسیدہ حالت میں پائی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس ماہر و نامور سراغرساں کے دلائل نہایت قوی تھے لیکن میں پولیس کے نقطۂ نگاہ سے مطمئن نہ ہوا۔ یہ بات نہایت غیر متوقع اور بعید از قیاس تھی کہ تنہا ایک عورت بغیر کسی مرد کی شرکت کے اتنے بڑے جُرم کا ارتکاب کرسکے۔ پونہ جانے والی عورتیں بھی قابل توجہ اور لائق تفتیش تھیں۔ لیکن میری رائے میں رپورٹ

کا اس مرد کے ذکر سے بالکل خاموش ہونا جس کو جہانگیر نے شیریں کے دروازے پر ڈاکٹر کی گاڑی سے اُترتے دیکھا تھا۔ رپورٹ کو بالکل نامکمل و غیر مختتم ثابت کرتا تھا۔

اِس اصول پر کہ "ایک سے دو بھلے" میں نے ایک لائق افسر انسپکٹر صبور کو مشورے کے لئے بلایا۔

"صبور ذرا بیٹھ جاؤ اور یہ رپورٹ پڑھو" میں نے کہا "دیکھو عاقل خاں صاحب نے کیا سراغرسانی کی ہے"۔
اس نے مجھے ایسی نگاہ سے دیکھا کہ میں سمجھ نہ سکا کہ اس کا منشا کیا ہے۔ اور پڑھنے بیٹھ گیا۔

"اِس پیغمبر سراغرسانی کے ادب و احترام کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس نے کام کو ختم نہیں کیا" انسپکٹر نے رپورٹ کا آخری ورق اُلٹ کر کہا "اگر عاقل خاں کے قضایا صحیح ہیں تو اُن کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ عورت محض آلۂ ارتکاب جرم بنائی گئی ہے"۔

"بالکل یہی میری رائے ہے" میں نے جواب دیا اور جہانگیر کا مکان کی نگرانی کرنا اور گاڑی میں سے ایک ملاقاتی کو اُترتے دیکھنا بیان کیا۔

انسپکٹر صبور فوراً کھڑا ہو گیا اور بولا۔

اگر ایک بیمارِ محبت رئیس ایک آدمی کو مکان کے اندر جاتے دیکھ سکتا ہے تو کیا پولیس کے وسائل و ذرائع سے یہ بات بعید ہے کہ اس شخص کا کوئی نام رکھ دیا جائے؟ کیا میں اسی اصول پر عمل کروں؟"

میں نے اجازت دی اور وہ فوراً روانہ ہو گیا اور اس وقت واپس آیا جب میں اس کی واپسی سے مایوس ہو چکا تھا اور دفتر بند کر کے اُٹھ رہا تھا۔ وہ نام دریافت کر لایا تھا۔ وہ شخص ڈاکٹر کاؤس ساکن فریدوں اسٹریٹ تھا۔ نام سُن کر میں نے بتایا کہ وہ حلق کی بیماریوں میں خصوصیت کے ساتھ ماہر و مشہور ہے۔

"بیشتر اس کے کہ یہ معاملہ انجام کو پہنچے کسی نہ کسی کا گلا کٹ جائے گا" صبور نے سنجیدگی کے ساتھ میری اطلاع کے جواب میں کہا "اگر آج شب کو کوئی کام نہ ہو تو میرے ساتھ چلئے اور اس کرتج مین بہن سے ملئے۔ میرا خیال ہے کہ اس کو جو کچھ معلوم ہے وہ سب اس نے سراغرساں کو نہیں بتایا۔ اس لئے کہ میں نے دریافت کیا ہے کہ

ڈاکٹر متعدد بار روشنک منزل گیا ہے "

ہم دونوں فوراً اسٹیشن پر پہنچے اور گاڑی میں سوار ہوگئے۔

اثنائے سفر میں میرے رفیق سفر نے بیان کیا کہ ڈاکٹر کا نام کس طرح معلوم ہوا۔ صبور نے پولیس آفس سے روانہ ہوکر ایرانی روڈ پر شیریں کے مکان کی نگرانی شروع کردی اتفاق سے ڈاکٹر اپنی گاڑی میں آیا اور مکان کے اندر چلا گیا۔ صبور فوراً گاڑی بان کے پاس پہنچا اور اپنی شناسائی بیان کی کہ روشنک منزل کے گرد و نواح میں تم سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہ اس چال میں آگیا۔ اگرچہ شناسائی کا اقرار نہیں کیا لیکن یہ کہہ دیا کہ اکثر اپنے آقا کو لے کر وہاں گیا ہے۔

" نہایت تعجب ہے کہ سڑک کے ذریعہ سے اتنا طویل سفر گوارا کیا جاتا ہے جبکہ ریل کے ذریعہ سے ایک گھنٹہ کا بھی فاصلہ نہیں "۔ صبور نے کہا " معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر میں اور شیریں بائی کے مکان کی موجودہ رہنے والی میں غیر معمولی ربط و ضبط ہے "

میرا بھی یہی خیال تھا لیکن کسی قدر اختلاف کے ساتھ۔ صبور کی تحقیقات سن کر مجھے یاد آیا کہ میرا ایک پرانا ہم مکتب ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر کا دس سے زیادہ ماہر ناسور ہے۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ اگر شیریں کے پرانے کوچبین سے ضروری معلومات حاصل ہوگئیں تو میں اپنے دوست ڈاکٹر سے مل کر چند سوالات کروں گا۔

ہم کوچ مین کے پتہ پر پہنچے تو دیکھا ایک شخص اصطبل میں دکٹوریہ گاڑی کو دھو رہا ہے۔ اس نے ہم کو دور ہی سے دیکھ لیا۔ اور جس وقت ہم قریب پہنچے وہ اپنا کام چھوڑ کر ہماری طرف رُخ کرکے کھڑا ہوگیا۔

" ہم ایک شخص بہن سے ملنا چاہتے ہیں " میں نے کہا " تم اس کا پتہ بتا سکتے ہو؟ "

اس نے شرارت آمیز نظر سے ہم کو دیکھا۔ بظاہر یہ شخص زندہ دل اور ہنس مکھ معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ایک مخفی چالاکی اور پوشیدہ مکاری جھلکتی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس نے میرے ایک خیال کو قوت دی جو میں نے اب تک اپنے رفیق کار سے بیان نہیں کیا تھا۔

"میں بہن ہوں اور آپ سرکاری سراغرساں ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "عاقل خاں کے بعد آپ لوگوں کے آنے کی اُمید ہی تھی۔ وہ بھی عجیب انسان ہے۔ اس نے وہ مضمون بھی باہر ہی سے پڑھ لیا جو میرے دل کے اندر تھا اور جس کو میں ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا۔"

میں نے انسپکٹر کو بولنے کا اشارہ کیا۔

"ہم وہ باتیں دریافت کرنے نہیں آئے جو تم نے عاقل خاں صاحب سے بیان کر دی ہیں۔ بلکہ وہ پوچھنا چاہتے ہیں جو اُن سے بیان نہیں کیں۔" صبور نے کہا۔ "تم نے یہ واقعہ کیوں پوشیدہ رکھا کہ ڈاکٹر کاؤس تمہاری سابق مخدومہ کے پاس روشنک منزل میں اکثر آتا تھا؟"

میں کوچبان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صبور کی اس واقفیت کو سُن کر اس کے چہرے پر خوف آمیز اشتیاق و تجسس کی علامات ظاہر ہوئیں۔ تاہم اس کا جواب نہایت برجستہ و بے تامل تھا:

"اس لئے کہ میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا۔"

"یہ بات ہے تو تم بُری طرح پھنس گئے۔" میں جلدی سے بولا۔ "اس لئے کہ روشنک منزل میں قتل ہوا ہے اور کسی مرد کا اس میں شریک ہونا لازم ہے۔ اگر تم ڈاکٹر کاؤس کے وہاں ہونے سے انکار کرتے ہو تو پھر تمہارے سوا کوئی مرد شیریں بائی کے زمانۂ قیام میں وہاں نہ تھا۔"

کوچبان نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے پھولے ہوئے رخسار کسی نامعلوم جذبہ سے کانپنے لگے۔ ممکن تھا کہ وہ جذبہ خوف ہو اور ممکن تھا خوف نہ ہو۔ ایک لمحہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ جذبہ شومیٔ قسمت پر غم و غصہ تھا۔

"مجھے پہلے ہی صاف صاف کہہ دینا چاہیئے تھا۔" اس نے اندوہناک لہجہ میں منہ بنا کر کہا۔ "بہمن ارشا حرف بہ حرف سچ کہنے والا آدمی ہے۔ لیکن اپنے آقاؤں کے بدلے پھانسی پر لٹکنے کے لئے تیار نہیں۔ میں نے اس لئے زبان بند رکھی تھی کہ میری مالکہ نے اگر اس کو مالکہ کہا جا سکتا ہے مجھے زبان بندی کے لئے سو روپیہ دیئے تھے۔ ڈاکٹر شروع سے آخر تک آتا رہا ہے۔ چھ مہینے کے عرصہ میں چھ مرتبہ آیا ہوگا۔"

صبور کچھ اور سوالات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اشارے سے روکا۔ اور ہم دونوں فوراً وہاں سے رخصت ہو گئے۔ احاطۂ اصطبل کے پھاٹک پر پہنچکر میں نے مڑ کر دیکھا تو کوجہ یین فاتحانہ شرارت سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا میں نے یہ بات اپنے ساتھی سے بیان کی اور کوچبان کی اس ذہنی کیفیت کی ایک وجہ بھی بیان کی جس کو سنکر انسپکٹر بہت متحیر ہوا۔ اس کے بعد میں نے اس کو اس کی دلچسپی کا ایک کام سپرد کیا۔ اور ہم دونوں جدا ہو گئے۔ میں اپنے مکان پر آیا اور جلدی سے کچھ کھا پی کر اپنے ہم مکتب دوست ڈاکٹر کے پاس گیا اس سے نہایت قیمتی اور مفید معلومات حاصل ہوئیں۔

دوسرے دن صبح ہی صبح میں ایرانی روڈ والے مکان پر پہنچا۔ شیریں بائی کو دریافت کیا تو ملازم نے وہی معمولی جواب دیا کہ وہ نہیں مل سکتیں اور کچھ بدتمیزی سے پیش آنے لگا۔ میں نے سختی سے کہا۔

"شیریں بائی سے کہہ دو کہ میں سرکاری کام سے آیا ہوں اور اسسٹنٹ کمشنر پولیس ہوں"

آدمی کا انداز فوراً بدل گیا۔ اور مجھے کمرے میں بٹھا کر اطلاع کرنے چلا گیا۔ واپس آکر مجھے لائبریری میں لے گیا اور اخبار سامنے رکھ دیا پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اسکی خوش قامتی تناسب اعضا اور باوقار انداز خرام نے مجھے وہ وقت یاد دلا دیا جب تین سال ہوئے چیمپین شپ ٹورنامنٹ میں شیریں بائی کے ساتھ ٹینس کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ ایک بھاری نقاب اس کے چہرے پر پڑا ہوا تھا۔

"شیریں بائی؟" میں نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں"۔ اس نے جواب میں کہا "آپ کسی تفتیش کے سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"نہایت اہم و نازک معاملہ ہے۔ روشنک منزل میں جہاں کچھ عرصہ ہوا آپ مقیم تھیں ایک عورت کی لاش مدفون پائی گئی ہے کیا آپ اس پر روشنی ڈال سکتی ہیں؟"

یہ سُن کر وہ ایک لمحہ کے لئے مبہوت سی بن گئی اور سہارے کے لئے کرسی کو پکڑ لیا۔

"مصیبت پر مصیبت"! میں نے اس کو آہستہ سے کہتے سُنا۔ اس کے بعد اُس نے زور سے کہا۔

"نہیں جناب۔ واقعی میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ اگر آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں نے کسی کو قتل کیا ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔ اگرچہ میں پھانسی پانے پر بھی خوش ہی ہوں گی۔"

"یہ معاملہ اس طرح ٹال دینے کا نہیں ہے" میں نے قصداً درشت لہجہ اختیار کیا: "کیا آپ اسکی وجہ بتا سکتی ہیں کہ آپ نے ڈاکٹر کاؤس کی آمد و رفت کو مخفی رکھنے کے لئے اپنے کوچ بین کو سَو روپیے کیوں دیئے؟"

"آپ معموں میں باتیں کر رہے ہیں" اس نے جواب دیا۔ "میں نے بہمن کو اس کی معمولی تنخواہ کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔"

"آپ پر یہ شُبہہ کیا جاتا ہے کہ آپ شیریں بائی نہیں ہیں بلکہ کوئی اور عورت ہیں جس نے شیریں بائی کو اپنے راستے سے ہٹا کر اس کی جگہ اور اس کی دولت پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور آپ نے یہ کام ڈاکٹر کاؤس کی اعانت و شرکت سے کیا ہے۔"

سب سے زیادہ وحشتناک منظر جو اس تمام معاملہ میں میرے سامنے آیا۔ باستثناء اس کے جو اسکے فوراً بعد پیش آنے والا تھا ایک قہقہہ تھا جو میرے الفاظ کے جواب میں سُنائی دیا۔

"ڈاکٹر کاؤس کی اعانت و شرکت سے!" اس نے دہشت انگیز ہنسی کے بعد میرے الفاظ کو دُہرایا۔ "لو دیکھو —— دیکھو ڈاکٹر نے میرے ساتھ کیا کیا ہے! اب تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا؟"

یہ کہہ اُس نے نقاب اُلٹ دیا اور وہی ناقابل بیان حلیہ میرے سامنے آگیا جو جہانگیر کو نظر آیا تھا۔ اور جس پر شیر کے خط و خال کا خفیف سا دھوکا ہوتا تھا۔ میں دفعتہً پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن پھر فوراً اس کی مظلومیت سے متاثر ہو کر سچی دلسوزی کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور کہا۔

"ہاں مجھے یقین ہو گیا کہ آپ نے شیریں بائی کو قتل نہیں کیا۔ اور اب میں کہتا ہوں کہ آپ ہرگز مایوس نہ ہو جیئے۔"

"کاش میں ایسی اُمید کر سکتی!" اس نے نقاب ڈالے ہوئے اندوہگیں آواز سے کہا۔

اگر آپ مجھ پر کامل اعتماد کریں تو نا اُمید ہونے کی میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں" میں نے جواب دیا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت میں اور صبور روشنک منزل کے باغ میں کھڑے تھے۔ ہم صبح کی گاڑی سے گاؤں میں کچھ تحقیقات کرنے آئے تھے اور اب عاقل خاں سراغرساں کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آکر اس قبر کی نشان دہی کرے جس کا اس کی رپورٹ میں ذکر ہے۔ اگرچہ منتشر مٹی قبر کا پتہ دے رہی ہے لیکن ہم چاہتے تھے کہ اس کو کھولنے کے وقت سراغرساں بھی موجود ہو۔ فوراً سڑک پر گاڑی کے پہیوں کی آواز آئی اور ایک گاڑی باغ کے دروازے پر آکر ٹھہری۔ ایک دراز قامت لاغر اندام آدمی قیمتی کوٹ اور ریشمی صافہ پہنے ہوئے اُترا اور اس کے پیچھے ایک فربہ جسم سیاہ رنگ شخص نظر آیا۔ طویل القامت شخص اس انداز سے ہماری طرف آیا۔ گویا ہر ہر قدم پر اس کو اپنی شخصیت کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے۔

"تم نے عورت کو گرفتار کر لیا؟" اس نے قریب آتے ہی سوال کیا۔ اس کی آنکھیں بڑی اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور شیشہ کی گولیوں کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔

"ہم ابھی اس نقطے پر نہیں پہنچے" میں نے جواب دیا "پولیس کو اس کا ثبوت نہیں ملا کہ مدفون لاش شیریں بائی کی ہے اور اگر نہیں ہے تو اس عورت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی جو شیریں بائی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔"

"پولیس کی ایک ہی کہی!" عاقل خاں نے غصہ سے کہا "تمہاری کارروائی سے قبل وہ فرار ہو جائے گی۔ لیکن خیر آئیے۔ میں معاملہ کو صاف کئے دیتا ہوں۔"

وہ قبر کی طرف بڑھا۔ لیکن میں نے نہایت تہذیب سے روکا۔

"ڈاکٹر کاؤس جی کا انتظار کر لیجئے" میں نے کہا "اگر میرے پیام کی قدر و وقعت اس کی نظر میں ہے تو وہ اسی ٹرین سے آنے والا تھا جس سے آپ آئے ہیں۔ لیجئے میرا خیال ہے کہ وہ آ گیا۔"

"ڈاکٹر کاؤس جی؛ اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے اور وہ کون ہے؟" سراغرساں نے متحیر ہو کر کہا اور پھاٹک کی طرف نظر اُٹھائی جہاں ابھی ایک گاڑی رُکی تھی اور اس سے ایک شخص اُتر رہا تھا۔

"شیریں بائی کا منیر طبی" میں نے بیان کیا۔ "مجھے خیال آیا کہ شاید نعش مدفون کو شناخت کرنے میں وہ مدد دے سکے۔ خانصاحب میں آپ کو اس دانش مندی پر مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے قبر کو بدستور خاک پوش رہنے دیا اور ہماری تفتیش تک کامل سکوت اختیار کیا قبل از وقت اعلان سے بڑے نتائج پیدا ہو سکتے تھے۔"

نامور سراغ رساں نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ اور اس کے موٹے ساتھی نے میرے مربیانہ لہجہ پر گہرا سانس لیا۔ لیکن کچھ کہنے کا وقت نہ تھا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر کاؤس قریب آگیا تھا۔ اس نے اخلاق کے ساتھ ٹوپی اٹھائی اور ہم سب پر نظر ڈالی۔ آخر اس کی نظر انتخاب نے عاقل کو ہم سب میں زیادہ با اقتدار و ذمہ دار سمجھا۔

"آپ مقبول الرحمن صاحب ہوں گے جنھوں نے مجھے حاضری کے لئے تحریر فرمایا تھا؟" اس نے کہا "مجھے نہایت رنج ہے کہ میری مریضہ شیریں بائی کو اس معاملہ میں شریک کیا گیا ہے۔ اس کی حالت صحت اس قابل نہیں کہ وہ بطور گواہ کے عدالت میں حاضر ہو سکے۔"

عاقل خاں کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف اشارہ کر کے بولا "یہ ہیں مقبول الرحمن صاحب افسر پولیس" غالباً قانونی احتیاط ان کو اس امر کے اظہار سے مانع رہی ہو کہ شیریں بائی کو شہادت دینے کے لئے قبر سے اٹھنا پڑیگا۔"

"آپ مجھے متحیر کئے دیتے ہیں" ڈاکٹر نے واقعی حیران ہو کر کہا۔

"آئیے اب یہ دل لگی ختم کریں اور قبر کو کھولیں" سراغ رساں نے جواب دیا۔

ہم سب جھاڑیوں کی طرف بڑھے جہاں قبر تھی صبور نے پھاوڑہ مہیا کر لیا تھا۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں آدھ گھنٹہ بعد ہم مکان کے باورچی خانہ میں جمع ہوئے جس کی کنجی ہم نے حاصل کر لی تھی۔ سراغرساں اپنی کامیابی پر نہایت مسرور تھا اور ڈاکٹر کچھ پریشان معلوم ہوتا تھا۔

"اب آپ کو اطمینان ہو گیا کہ آپ کی مریضہ قتل کر دی گئی اور یہ اس کا جسد خاکی ہے جو ہم نے ابھی اصطبل میں رکھا ہے؟" سراغ رساں نے پوچھا۔

"میں ان میں سے کسی بات سے مطمئن نہیں ہوا" ڈاکٹر نے حقارت سے کہا "شیریں بائی اپنے ایرانی رو د ڈ

والے مکان میں کل تک زندہ تھی میں نے خود اُس کو دیکھا تھا۔"

سراغرساں کی اُبلتی ہوئی آنکھیں قہر آلود ہو گئیں اور مجھ پر جم گئی۔ پھر ایک لمحہ کے بعد اس نے ڈاکٹر کی طرف اِس طرح ہاتھ ہلایا جیسے کوئی شخص چوہے پر شکاری کتّے کو لہکاتا ہے۔ اور زور سے کہا۔

"آپ نہیں سمجھتے؟ عجب قانونی دماغ پایا ہے۔ مقبول صاحب مجھے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بالکل نہیں۔ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا کہیں گے" میں نے جواب دیا "آپ یہ قیاس کر رہے ہیں کہ چونکہ ڈاکٹر آپ کے نظریہ کی تردید کرتے ہیں اس لئے وہ ایرانی روڈ والی عورت کے معاون و شریک جرم ہیں عاقل صاحب آپ کے قیاسات اور نتائج سب غلط ہیں۔ اس لئے کہ میں ڈاکٹر کے بیان کی تائید کر سکتا ہوں اور اس پر بہت کچھ اضافہ بھی۔"

عاقل خاں اور اس کا دوست وفادار بیگ عطائی عالمِ سکوت میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ میں ناقابلِ علاج دیوانہ ہوں۔ لیکن میں نے اُن کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ اس لئے کہ ڈاکٹر نے میری تمام توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ میرے آخری الفاظ سُن کر ایک اضطرابی کیفیت اس کے چہرے پر پیدا ہوئی اور اس نے خائف ہو کر صبور کی طرف دیکھا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ تاہم اس نے ضبط سے کام لیا اور میرے چہرے سے خیالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر یکایک قہقہہ مار کر کہا۔

"میں خوش قسمت ہوں کہ عاقل خانصاحب کے الزامات کے مقابلے میں میرا ایسا قوی حامی و طرفدار موجود ہے"

لیکن اس کی آواز سے کرب و اضطراب مترشح تھا اور میں نے سمجھ لیا کہ کارروائی کا یہی وقت ہے۔ طبابت پیشہ حضرات جب ہر طرف سے گھر جاتے ہیں تو ذرا سا موقع ملنے پر مہلک گولی نگل لیتے ہیں۔

"جی ہاں" میں نے کہا۔ "قیدِ بامشقت پھانسی سے بہتر ہے صبور ڈاکٹر کا دُس جی کے ہتھکڑی ڈال دو۔ ہاں۔ ہاں۔ ڈاکٹر۔ مدافعت آپ کی شان سے بعید ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ اب آپ کی بڑی زحمت بچ جائیگی صبور ان کو بمبئی لے جاؤ۔ اور شیریں بائی پر حملہ مجرمانہ کرنے کے جرم میں ان کا چالان کر دو۔ تم خوب ہی جانتے ہو۔"

جب انسپکٹر اپنے پُرغضب لیکن مجبور قیدی کو لے جا چکا تو سراغرساں مسرور بلّی کی طرح غرّایا۔ اور میری طرف ہاتھ بڑھایا میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"عجیب تماشا ہے!" وہ بولا۔ "تم پولیس والے بھی عجب لوگ ہو۔ میں اسرار کا انکشاف کر سکتا ہوں لیکن اس قانون کے سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا جس کی بنا پر صرف حملہ کے الزام میں کسی شخص کو قاتلوں کی طرح گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال میں خوش ہوں کہ میری ناچیز خدمات بے نتیجہ نہ رہیں ہم بہت غلطیاں نہیں کرتے۔ ہے نا عطائی؟"

موٹے آدمی نے اس واقعہ کی تصدیق کی۔ میں نے دونوں کی خدمت میں اپنا سگرٹ کیس پیش کیا۔ اور باورچی خانہ کی میز پر بیٹھ گیا۔ اب میں بالکل مطمئن تھا کہ شیطان کو مقفل کر دیا گیا ہے۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کا خواب باطل ہوا جاتا ہے۔ افسوس اس لئے کہ جناب عاقل خانصاحب آپ ہمارے لئے ایک حد تک مفید ثابت ہوتے ہیں" میں نے کہنا شروع کیا۔ "اگر جہانگیر جی معاملہ کو آپ کے سپرد نہ کرتا تو ہم کبھی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکتے۔ یہ تصور کرنا بھی دشوار ہے کہ اگر وہ پہلے ہمارے پاس آتا تو کیا نتیجہ نکلتا۔ ڈاکٹر اسکاؤس پر حملہ کا الزام اس لئے لگایا گیا ہے کہ جُرم کی یہی قانونی حد ہے جو ہم متعین کر سکتے ہیں مقتول عورت بہمن کوتج مین کی بیوی ہے اور وہ اس قتل کے جُرم میں کل شب کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس نے پورا اقبال کر لیا ہے"

"بالکل غلط۔ بالکل غلط" عاقل خاں نے دبی زبان سے کہا۔

"بالکل صحیح" میں نے کہا۔ "تاہم یہ بدمعاش جو اس وقت گرفتار کیا گیا ہے۔ اُس جُرم کا بھی بالواسطہ ذمہ دار ہے۔ اور اپنے جُرم کا بھی۔ جہانگیر کے افریقہ جانے کے بعد یہ ڈاکٹر شیریں بائی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ راضی نہ ہوئی۔ لیکن اس کی طبّی قابلیت کی معترف تھی اس لئے کسی حلق کی بیماری کے متعلق اس سے مشورہ کیا۔ ڈاکٹر نے خفیف آپریشن تجویز کیا۔ جس کی حقیقت میں مطلق ضرورت نہ تھی۔ وہ آمادہ ہو گئی۔ ڈاکٹر نے نہایت سخت آپریشن کر دیا یعنی تھائرائڈ گلینڈ (حلق میں ایک قسم کا غدود) نکال دیا۔"

"آپ اس کو حملہ سے تعبیر نہیں کر سکتے" سراغرساں ترش رو ہو کر بول اٹھا۔

"صبر کیجئے" میں نے کہا "یہ کام شیطانی ارادے سے کیا گیا تھا۔ اس غدود کے نکلنے سے ایک مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کو کسی ڈیا کہتے ہیں جس سے انسانی چہرہ خوفناک درندے کے چہرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک مشہور ڈاکٹر نے اس کو دریافت کیا تھا۔ اور یہ مرض اس قدر کمیاب ہے کہ اس کے موجد ڈاکٹر کے وسیع تجربہ میں صرف دو مریض اس میں مبتلا پائے گئے ہیں لیکن موجودہ حالت کی طرح مصنوعی طور پر اس مرض کے پیدا کرنے کی کوئی نظیر نہیں ملی۔ جس وقت شیریں بائی کو احساس ہوا کہ اس کا حسن زائل اور حالت متغیر ہو رہی ہے تو اس نے ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق علاج کی غرض سے گاؤں کی سکونت اختیار کر لی۔ ڈاکٹر نے یقین دلایا کہ اس مرض کا علاج میرے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اور اس علاج کے معاوضہ میں اپنے ساتھ شادی کرنے کا اقرار لینا چاہا۔ اس نے نفرت کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس لئے کہ نہ ڈاکٹر کی طرف ملتفت تھی نہ اپنے عاشق کو بھولی تھی۔ لیکن یہ شیطان سیرت انسان برابر مشروط علاج پر اصرار کرتا رہا۔ اور وہ محض اسی اُمید پر اس سے ملتی رہی کہ ممکن ہے اس کو رحم آجائے۔ اور بغیر کسی شرط کے علاج کر دے۔ اس نے اپنے خوفناک مرض کو مخفی رکھنے کی غرض سے اپنے بنیک اور مشیر قانونی بدل دیئے۔ اس مرض کی ایک علامت یہ ہے کہ انگلیاں موٹی ہو جاتی ہیں اور تحریر میں تغیر ہو جاتا ہے۔"

"لیکن لاش۔ قبر سے نکلی ہوئی لاش؟" سراغرساں نے سوال کیا۔

"ڈاکٹر کے ایک جرم نے دوسرے جرم کے لئے راہ کھولدی" میں نے جواب میں کہا "بہن کو تج میں نے ایک دن اپنی مخدومہ کا چہرہ دیکھ لیا۔ یہ شخص انتہائی درجہ کا مکار اور چالاک ہے۔ اس کے تغیر صورت سے اس نے اپنا کام نکالنا چاہا۔ اپنی بیوی سے بیزار تھا۔ ایک روز اس بدنصیب کو یہاں لا کر رات میں قتل کر ڈالا اور زمین میں دبا دیا اور وہی نظریہ قائم کر کے چپ ہو گیا جو آپ کے ذہن میں آیا۔ جب آپ اس سے ملے ہیں تو وہ آپ کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھوڑنے پر تیار تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کو یقین دلایا کہ کسی عورت نے شیریں بائی کو قتل کر کے اس کی قائم مقامی اختیار کر لی ہے۔"

"اس شخص پر آپ کو کیونکر شبہہ ہوا؟" سراغرساں نے پوچھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اب تک میرے بیان پر کامل یقین نہیں آیا۔

"اس لئے کہ اس نے ڈاکٹر کی آمد و رفت کا آپ سے ذکر نہیں کیا۔ اور اس لئے کہ بظاہر پولیس پر بھی یہ واقعہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بظاہر اس لئے کہا کہ جب اس کو مجبور کیا گیا تو آخر صاف صاف بتا دیا۔ یہ بھی اس کی چالاکی تھی کہ سب باتیں ایک ہی دفعہ بتا دینی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ رشوت ستانی کا اقرار کر لینے سے اس کا بیان زیادہ معتبر سمجھا جائے گا۔"

اس عجیب و غریب صحبت کا آخری کلام وفادار بیگ عطائی کے حصہ کا تھا۔

"اوہو۔ تم دیکھتے ہو عاقل" انہوں نے فرمایا۔ "اگر ہم تمہارے لئے وہی آسانیاں بہم پہنچا دیتا جو پولیس کو پہنچائیں تو تم بھی یہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ بلکہ اس سے زیادہ۔"

اب اتنا جتلانا باقی ہے کہ وہ ہیبت ناک مصیبت جو ڈاکٹر کی شیطانی قابلیت نے نوجوان حسین عورت پر نازل کر دی تھی۔ باقاعدہ علاج سے رفع کر دی گئی۔ یعنی بھیڑ کے غدود سے قرص تیار کر کے اس کے حلق میں لگا دیئے گئے۔

شیریں اور جہانگیر کی حیات معاشقہ عود کر آئی۔ اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ گذشتہ ایام کرسمس میں نے ان کے قصر میں بسر کئے۔ اب اس حسین میزبان اور اس بدبخت ہستی میں (جو ایک شیرنی معلوم ہوتی تھی اپنے بچوں سے بچھڑی ہوئی) مشابہت کا تصور کرنے کی کوشش بھی بے سود ہے۔

(مطبوعہ عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۰ء)

نو ذی الحجہ

ذی الحجہ ہے۔ حج کا خاص دن۔ ۹ بجے صبح کا وقت ہے۔ میدان عرفات میں لاکھوں حاجی جمع ہیں کہتے ہیں قیامت اسی میدان میں قائم ہو گی۔ خدا جانے اس دن کیا ترتیب ہو آج تو عجیب بے ترتیبی ہے۔ حد نظر تک خیمے ہی خیمے نظر آ رہے ہیں یا اونٹ اور شغدف۔ معلم حجاج کے قیام کے انتظام میں مصروف ہیں حاجی اپنی ضروریات میں مشغول ہیں کہ زوال سے پہلے کھانے پینے سے فارغ ہو لیں اس کے بعد شام تک دعا و نماز، توبہ و استغفار کا وقت ہے۔

ایک خیمہ باہر سے بھی ممتاز وضع کا ہے اور اندر بھی غیر معمولی آراستہ، دری چاندنی۔ قالین بچھے ہوئے ہیں۔ اس میں چند نوجوان مقیم ہیں۔ اکثر عرب و مصری ہیں لیکن ایک ہندی ہے۔ بعض ایک طرف بیٹھے قہوہ پی رہے ہیں۔ مصری قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے اور ہندی مصلے پر بیٹھا دعا میں مصروف ہے اور نہایت آہستہ آہستہ گویا دل ہی دل میں یہ دعا مانگ رہا ہے۔

"یا الہ العالمین! تیری نعمتوں کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ جو میں نے مانگا تو نے دیا بلکہ اس سے زیادہ دیا۔ اس سے بڑھ کر نعمت کیا ہو گی کہ اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آستانے پر پہنچایا۔ اپنے در پر بلایا۔ پروردگار مجھے شرم آتی ہے کہ آج کے دن بھی تجھ سے دنیا مانگوں اور تیری جناب میں نفسانیت کو پیش کروں لیکن رب العالمین تو نے انسان بنایا ہے اور دنیا ساتھ لگا دی ہے علام الغیوب تو جانتا ہے کہ دنیا کی ایک چیز مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے۔ یا کریم و رحیم تو نے دے دے کر دلیر کر دیا ہے اس لئے یاس و قنوط کا میرے دل میں

گذر بھی نہیں ہوتا۔ جانتا ہوں کہ تیری مرضی اور میری بھلائی ہوگی تو ضرور دیگا۔ بس یا میری مُراد یا اپنی رضا پر صبر۔ جو چاہے دیدے "

ہندی یہ دُعا مانگ کر مصلّے سے اُٹھا تو اس طرح کہ طمانیت و مسّرت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ اُس کے ساتھی جو کبھی کبھی اُس کے دُعا مانگنے میں اُس کی طرف دیکھ لیتے تھے اب سب کے سب متوجہ ہو گئے۔

عرب۔ (ہندی کو خیمہ کے دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر) دُعا مانگتے مانگتے کدھر چلے؟

مصری۔ معلوم ہوتا ہے جو کچھ مانگ رہے تھے اس کا وعدہ ہو گیا، اور اب اُس کو لینے جاتے ہیں۔

ہندی۔ ابھی آتا ہوں، ذرا دیکھوں تو باہر کیا منظر ہے؟

عرب۔ کہیں دور نہ چلے جانا کہ خیمہ بھول جاؤ۔ یہاں کا کھویا ہوا منا ہیں ملے تو ملے ورنہ پھر سکے ہیں ملتا ہے۔

مصری۔ ہمارا خیمہ تو دور سے پہچانا جاتا ہے۔

ہندی۔ دور نہ جاؤں گا۔

یہ کہہ کر ہندی نوجوان باہر نکلا۔ میدان عرفات میں ابھی قیامت برپا ہی تھی یعنی حاجیوں کے قافلے آرہے تھے۔ اونٹ۔ موٹریں۔ گھوڑے۔ گدھے لدے چلے آتے تھے۔ ایک ہنگام گرم تھا۔ ہندی سیر کرتا خیموں کے درمیان سے گذرتا چلا جارہا تھا۔ کبھی کبھی پیچھے مُڑکر دیکھ لیتا تھا کہ اس کا خیمہ کہاں اور کون سا ہے۔ ہجوم و ہنگامہ سے بہت دور نکل گیا۔ دیکھا تو پیچھے خیمہ نظر نہیں آتا اور آگے عرفات کا بازار سامنے ہے گھبرایا کہ کہاں آگیا۔ مڑنا چاہتا تھا کہ دیکھا سامنے سے ایک برقع پوش عورت آرہی ہے۔ اِسی لمحہ میں عورت کے ٹھوکر لگی اور ایک بوتل برقع کے اندر سے نکل کر گر پڑی۔ عورت فوراً گرتے گرتے سنبھل گئی اور بوتل اُٹھالی۔ اس جھٹکے سے برقعہ کا پردہ چہرے سے ہٹ گیا اور ہندی کی نظر اس پر پڑی۔ عورت کو ابھی خبر نہ تھی کہ اس کے سامنے کوئی مرد ہے۔ سنبھل کر اُٹھی تو مرد کو دیکھا اور کچھ ایسی حیرت ہوئی کہ بوتل پھر ہاتھ سے چھوٹ پڑی اور وہ اک آن کے لئے بھول گئی کہ چہرہ کھلا ہوا ہے

اِدھر ہندی کا یہ عالم ہوا کہ ایک سیکنڈ کے لئے سر سے پاؤں تک لرزہ طاری ہوگیا۔ پھر یکایک آسمان کی طرف دیکھا اور ایک لمبا سانس کھینچا۔ اتنے میں عورت نے چہرے پر نقاب ڈال لی تھی لیکن متحیر کھڑی تھی یہ تمام واقعات چند سکنڈ کے تھے۔

"خالدہ!" بے اختیار مرد کے مُنہ سے نکل گیا۔

"ارشد! تم ہو؟" عورت نے کہا۔

"تم کہاں؟"

"تم کہاں؟"

"میرا یہاں ہونا کیا تعجب ہے؟ لیکن تم یہاں کہاں اور اس وقت تنہا کیوں"؟

"آبا کے ساتھ حج کے لئے آئی ہوں وہ اس وقت خیمہ میں ہیں اور بخار میں بیہوش پڑے ہیں۔ نزلہ کئی روز سے تھا۔ کل منا میں بخار ہوگیا۔ آج صبح کا سفر اور اونٹ کے جھٹکے یہاں آتے ہی بخار تیز ہوگیا اور غفلت ہوگئی۔ اتفاق یہ کہ ہمارے ساتھ جو پرانا نوکر ممدو آیا ہے اُس کو مکہ شریف ہی میں بخار آنے لگا تھا۔ وہ آنے کے قابل بھی نہ تھا لیکن آبا نے کہا اُس کو لاتے ہیں تو اس کا حج نہیں رہنا چاہیے۔ وہ بھی جب ہوش میں ہوتا تھا تو یہی کہتا تھا میاں مجھے چھوڑ نہ جایئے گا۔ کل صبح منا کو روانہ ہونے کے وقت اس کو ہوش تھا۔ آبا نے تو کہا تھا اُسے پلنگ پر لٹا کرلے چلیں لیکن ممدو نے کہا اس کی تکلیف نہ کیجئے اونٹ پر ڈال دیجئے پہنچ جاؤں گا۔ کل اُس کا بُرا حال رہا علاج برابر ہوتا رہا بڑی مُشکل سے یہاں تک لائے ہیں وہ بھی بخار میں لوتھ پڑا ہے۔

ارشد۔ تو چلو راستے میں باتیں کرتے چلیں گے۔ خیمہ کا راستہ معلوم ہے؟

خالدہ۔ میں نے پہچان کرلی ہے سیدھے چلے چلو۔

ارشد۔ ہاں تو یہاں بازار میں کیوں آئی تھیں۔

خالدہ۔ ہمارا معلم بڑا بے پروا ہے۔

ارشد۔ کون ہے؟

خالدہ نے نام لیا۔

ارشد۔ نام کا تو تقاضا ہے کہ احسان کرنے والا ہو۔

خالدہ۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ ویسے تو اس نے خیمہ اور آسائش و آرائش کا سب سامان کردیا۔ صبح حکیم کو بھی لایا۔ دونوں کو دوائیں لاکر دیں لیکن پھر غائب ہوگیا۔ دوسرے حاجیوں کی خدمت میں ہوگا۔ دعوت کا سامان کر رکھا ہے کھانا پکوا رہا ہے۔

ارشد۔ ان لوگوں کی توحید ہوتی ہے۔

خالدہ۔ آپا اور ممدو دونوں کو بڑی شدت کی پیاس ہے۔ برف معلم سے منگالی ہے لیکن عرق ختم ہوگیا تھا۔ دونوں بار بار پانی مانگتے ہیں۔ آپا نے آنکھ کھولی اور پانی مانگا میں نے جو عرق تھا پلادیا اور کہا ابھی اور منگاتی ہوں۔ خیمہ سے نکلی تو معلم اور اس کا کوئی آدمی نہ ملا۔ کسی سے پوچھا بازار کتنی دُور ہے۔ معلوم ہوا قریب ہے اور سیدھا راستہ ہے سوچا کہ اتنے میں معلم کو تلاش کروں خود ہی نہ لے آؤں۔ چلی تو کافی دور نکلا۔ چلو جلدی چلو آپا گھبرا رہے ہوں گے خدا کرے اس عرصہ میں معلم آگیا ہو۔

ارشد۔ خالدہ تمھیں اکیلے آتے ڈر نہ لگا۔

خالدہ۔ ڈر کی کیا بات تھی گم ہونے کا بیشک اندیشہ ہوسکتا تھا لیکن مجھے اس وقت اس اندیشے کا بھی موقع نہ تھا۔

ارشد۔ تم تو بچپن میں بھی کسی بلا سے نہ ڈرتی تھیں۔ اچھا خالدہ، ایک بات پوچھتا ہوں، چچا آبا اب بھی مجھ سے ناراض ہیں؟

خالدہ یکایک ایک دوسرے عالم میں پہنچ گئی۔ خالدہ کو ارشد سے اس طرح خلاف اُمید ملنے سے حیرت

تھی۔لیکن اس سے زیادہ اپنے باپ کی بیماری کی تشویش تھی گویا بھول گئی تھی کہ ارشد کون ہے۔ارشد کے اس فقرہ نے خالدہ کی خیالات کی دنیا بدل دی۔

خالدہ۔ مجھے معلوم نہیں، ہاں میں تمہارے حالات پوچھنا تو بھول ہی گئی تمہارے آئی۔سی۔ایس میں پاس ہونے کو سُنا تھا مُبارک ہو۔کوئی کہتا تھا نتیجہ نکلے تو بہت دن ہو گئے واپس آجانا چاہیئے۔جانے ولایت میں رہ کر کیا کر رہے ہیں؟

ارشد۔ میں تو ڈاکٹری کے لیئے تھیس تیار کر رہا تھا۔لیکن تم نے کیا رائے قائم کی؟

خالدہ۔ یہ کہ کوئی میم ویم لانے کی فکر میں ہو گے۔

ارشد۔ (گھبرا کر) خالدہ کیا کہا، ادھر تو دیکھو۔

خالدہ۔ خبر بھی ہے یہ عرفات کا میدان ہے۔حج کے لئے آئے ہو۔

ارشد۔ پھر کیا حج میں جھوٹ بولنا ثواب ہے۔خالدہ تم کو یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا (پھر کچھ سوچ کر یکایک) خالدہ خبر بھی ہے۔تم نے بے خیالی میں سچّی بات، اپنے دل کی بات کہہ دی۔شکر ہے، یا اللہ تیرا شکر، ہزار ہزار شکر۔

خالدہ۔ یا اللہ خیر کیجیو۔یہ کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے

ٹالنے کے لئے یہ فقرہ کہہ تو دیا لیکن دل میں شرمائی کہ میم لانے کی فکر کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں اور اُن تک ارشد پہنچ گیا۔

ارشد۔ خالدہ یہ تو بتاؤ چچا آبا اب تک مجھ سے ناراض ہیں؟ کبھی میرا ذکر کرتے تھے میرے خط ولایت سے ماموں صاحب وغیرہ کے پاس آتے تھے۔چچا آبا کبھی میرا حال پوچھا کرتے تھے۔میں نے تو اُن کے مزاج کے خوف سے کبھی نہ ان کو خط لکھا نہ تم کو۔میری کامیابی کو سُنا ہوگا، کیا بولے؟

خالدہ۔ میرے سامنے وہ کبھی تمہارا ذکر نہیں کرتے۔

ارشد۔ اور تم؟

خالدہ۔ معلوم ہوتا ہے تم اب تک ولایت ہی کی ہوا میں ہو۔ وہ بُو ابھی دماغ سے نہیں نکلی ہیں ان کے سامنے کیا کسی کے بھی تمہارا نام لے سکتی تھی؟ تم ولایت جانے سے پہلے میرے منہ پر مُہر لگا گئے تھے۔

ارشد۔ خالدہ تمھیں بتاؤں میں کیا کرتا۔ تمہارے آبا میرے آبا سے ناراض تھے آپس میں مقدمہ بازی تھی۔ تم کو تو سب معلوم ہوگا۔ وہ بھائی بھائی تھے نمٹ لئے قصور ایک کا ہو یا دونوں کا مجھے اس سے نہ جب بحث تھی نہ اب ہے۔ ع

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

میرے لئے ایک باپ، ایک باپ سے بڑے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے چھوٹے کو اپنے پاس بلا لیا چچا آبا نے آبا کے انتقال کا جس قدر رنج کیا۔ اِس سے مجھے اپنے لئے بڑی اُمیدیں ہوئیں۔ اسی لئے میں نے ولایت جانے سے پہلے ماموں صاحب کے ذریعہ چچا آبا کے پاس پیام بھجوایا کہ وہ منظور کرلیں تو میں نکاح کرتا جاؤں تاکہ میرا دل ٹھکانے رہے۔ پردیس اور تعلیم میں وحشت و خلجان نہ ہو لیکن تمہارے آبا ایسے گم سُم ہوئے کہ ہوں نہ ہاں۔ کبھی ٹال دیا کبھی اُڑا گئے، کبھی سُنی اَن سُنی کر دی۔ آخر کہنے سُننے والے ڈر گئے کہ اصرار پر کہیں برس نہ پڑیں لیکن میں اب تک اس کو ان کی ندامت سمجھ رہا ہوں۔

خالدہ۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آبا کا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہے۔

ارشد۔ ایسا نہ کہو، انشاء اللہ تمہارا اندازہ غلط ہوگا۔ تم اطمینان رکھو۔

خالدہ۔ مجھے اطمینان یا بے اطمینانی سے تعلق؟

ارشد۔ پھر تم نے شرارت کی بات کی۔ تم نڈر تو ہمیشہ سے تھیں اب بیباک بھی ہوگئیں۔

خالدہ۔ تمھیں یاد ہوگا کہ دس سال ہوئے میں نے کسی گستاخی کے فقرے پر ایک کھلاڑی کے گھونسا رسید کیا تھا۔ وہ آئی۔سی۔ایس ہوکر بھی گستاخی کرے تو پھر مجھے وہی سزا دینے میں تامل نہ ہوگا۔

ارشد۔ کل دسویں تاریخ منا میں بجائے گھونسے کے تلوار لگاؤ تو قربانی بھی ادا ہو جائے ۔

خالدہ۔ (ٹھٹک کر) لو اب بتاؤ، یہ صاف گستاخی، بے شرمی اور توہین نہیں تو کیا ہے ؟ تم شروع سے جان جان کر چھیڑ کی باتیں کر رہے ہو اور ایسے فقرے کستے اور سوال پیدا کرتے ہو کہ مجھے جواب دینا پڑتا ہے اور تمھیں میری حاضر جوابی کا حال معلوم ہی ہے ۔ میں بند ہونا نہیں جانتی ۔

ارشد۔ خالدہ سچ پوچھو تو اس گھونسے ہی نے میرے دل کی دنیا بدل دی ہے شاعر تو کہتا ہے ؎

"بسا کیں دولت از گفتار خیزد"

لیکن میں کہتا ہوں ؎

"کہ ایں دولت گہے از "مار" خیزد"

خالدہ۔ ماشاءاللہ ولایت سے شاعر بن کر بھی آتے ہو۔ آئی سی۔ ایس میں شعر گوئی کا پرچہ تھا یا ڈاکٹری کے لئے تھیسس (علمی مقالہ) نظم میں لکھا تھا ؟

ارشد۔ خالدہ تم جس گھر میں ہو وہ دنیا میں جنت ہے ۔

خالدہ۔ دماغ تو صحیح ہے ؟ سوال از آسماں جواب از ریسماں ۔

ارشد۔ اب تک تو خدا کے فضل سے صحیح ہے لیکن امید نہیں کہ تم صحیح رہنے دو ۔

خالدہ۔ لو پھر مجھ ہی پر الزام ہے میں نے اب تک کسی نار وا بات میں اپنی طرف سے پہل نہیں کی ۔ ہاں جواب دینے سے نہیں چوکی ۔ یہ میری طبیعت کا خاصہ ہے ۔ بُرا ہے ۔ میں جانتی ہوں لیکن ہمیشہ نہیں، ہر جگہ نہیں ۔ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ مجھے تم سے تنہائی میں باتیں اور اتنی باتیں نہیں کرنی چاہیئے تھیں ۔

ارشد۔ (بات کاٹ کر) ہم تنہا نہیں ہیں ۔ میدان بھرا پڑا ہے ۔ سینکڑوں آدمی آ جا رہے ہیں ۔ دن کا وقت ہے ۔ ہم بھی کھڑے یا بیٹھے نہیں برابر چلے جا رہے ہیں ۔

خالدہ۔ یہی سبب ہے کہ میں نے باتیں کرنے میں تامل نہ کیا۔ ایسے پردیس کے سفر میں اور اس حالت میں کہ میں اکیلی آبا کے ساتھ ہوں ضرورت کے وقت غیر مردوں سے بھی بات کرنی جائز ہے اور مجھے بھی کرنی پڑی ہے۔ گھر میں ہوتی تو نہ ضرورت ہوتی نہ میں بولنا چاہتی۔ مجھے پردے کی رسم اور قیود دل سے پسند ہیں۔ سفر ہو یا حضر صرف ضرورت کے وقت اور صرف بولنا جائز سمجھتی ہوں۔ تمہارا ساتھ بچپن سے رہا۔ کھیلنا کودنا، کھانا پینا۔ لکھنا پڑھنا۔ برسوں ساتھ رہا لیکن جب سے تم سے پردہ ہوا میں نے ہمیشہ رسم و رواج کی پابندی کی اور بغیر اشد ضرورت کے کبھی بات چیت بھی نہ کی۔ اللہ بخشے امّی کی عیادت کو ایک روز تم آئے اتفاق سے اس وقت گھر میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ امّی کو بولنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ میں نے اس وقت تم سے ضروری بات چیت کر لی۔ تم کتنی ہی دیر بیٹھے رہے۔ قسم قسم کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے ہوں ہاں سے زیادہ کچھ نہ کہا۔ اس لئے کہ ضرورت نہ تھی۔ پھر جب میں ہائی اسکول کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی مجھے انگریزی میں مدد کی ضرورت تھی۔ بھیّا پڑھاتا تھا لیکن وہ خود میرا ہم سبق تھا تم نے مجھے پڑھانا چاہا لیکن میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اور بھیّا کو تمہارے پاس بھیجدیا کہ تم سے پوچھ آیا کرے اور مجھے بتادیا کرے۔

ارشد۔ (تنگ آکر) میں پوچھتا ہوں آخر یہ لکچر کیوں دیا جا رہا ہے؟

خالدہ۔ اس لئے کہ میں نے اس سفر مقدس اور حج کی برکت اور خلوص نیت کے اعتبار پر تم سے قدیم بے تکلفی کی تجدید کی ہے بلکہ اصل میں تمہارے یکایک ایسی جگہ ملنے کی ایسی حیرت تھی.....

ارشد۔ (جلدی سے) اور خوشی بھی!

خالدہ۔ ہاں خوشی بھی اس میں کیا عیب ہے۔ لیکن اب کے بیچ میں نہ بولنا۔ ہاں! تو اس وقت مجھے ایسی حیرت ہوئی کہ کچھ سوچ سمجھ نہ سکی۔ اور وہی قدیم فطرت عود کر آئی۔

ارشد۔ اور محبت قدیم بھی؟
خالدہ۔اب کے تم نے اس طرح کا کوئی لفظ زبان سے نکالا اور میں نے بھرے میدان میں دھکا دیا۔
ارشد۔ یہ بھی حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کا قصہ ہوا لیکن حضرت خضر نے دو تین بار کا وعدہ تو نہ کیا تھا۔
خالدہ۔تو پھر وہی سہی جو انھوں نے کہا تھا ھٰذا فراقُ بینی و بینک
ارشد۔ اچھا اپنی بات تو پوری کرو۔
خالدہ۔میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ اب ہمارا تمہارا ساتھ ہو گیا ہے تو ممکن ہے ہندوستان تک ساتھ رہے
ارشد۔ممکن کیا یقینی۔
خالدہ۔اس حساب سے تقریباً ایک مہینہ ساتھ رہے گا۔
ارشد۔نہیں عمر بھر۔
خالدہ نے اپنی دھمکی کو پورا کرنے کے لئے پیترا بدلا لیکن ارشد کودکر الگ کھڑا ہو گیا اور پھر خالدہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔
ارشد۔ ہاں تو اس ایک مہینہ میں؟
خالدہ۔اب برابر نہ آنا۔ پیچھے رہو آئندہ سے بے تکلفی ختم۔ صرف حسب ضرورت ملاقاتیں اور گفتگو ہوا کرے گی۔
ارشد۔ جو حکم ہو غلام کو سرتابی کی مجال نہیں لیکن ......
خالدہ۔بس خاموش۔ وہ خیمہ آگیا۔

خیمہ کے اندر قدم رکھتے ہی باپ کو غافل دیکھ کر خالدہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ کانپنے لگی۔ ارشد آہستہ سے آگے

بڑھا اور خالدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "خالدہ ہمت باندھو چچا آبا غافل ہیں۔ بخار تیز ہوگا۔ انشاء اللہ شام تک اتر جائے گا۔ کچھ فکر نہ کرو، باتیں نہ روتی ہو۔ پکارو۔ عرق پلاؤ۔ تھرمامیٹر لگاؤ۔ میں سامنے جانا نہیں چاہتا مجھے یکایک دیکھ کر ممکن ہے دماغ پر اثر ہو جائے۔"

یہ کہہ کر ارشد آہستہ سے پلنگ کے پاس آیا اور چچا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ پیشانی جل رہی ہے۔ مریض نے سر کو حرکت دی یہ پیچھے ہٹ گیا۔ خالدہ نے پٹی پر جھک کر پکارا۔ ایک کراہ کی آواز نکلی۔ خالدہ نے جلدی سے عرق پیالیاں کرکے منہ کو لگایا۔ دو ایک گھونٹ پی لئے۔ تھرمامیٹر لگایا۔ اتنے میں محمد کے پاس جاکر اس کو پکارا۔ اس نے پانی مانگا۔ عرق پلادیا گیا۔ وہ بھی پھر غافل ہوگیا۔ دونوں کا ٹمپریچر ۱۰۴ سے زیادہ تھا۔

ارشد۔ کچھ تردد کی بات نہیں خالدہ۔ اطمینان رکھو۔ تم سر پر برف میں کپڑا تر کرکے رکھو۔ میں تمہارے یا اپنے معلم کو بھیجکر ڈاکٹر کو بلاتا ہوں اور دو آدمی بھی لاتا ہوں کہ دونوں کی تیارداری کریں۔

خالدہ۔ ڈاکٹری علاج آبا کو پسند نہیں کسی حکیم کو بلاؤ۔

ارشد۔ اچھا حکیم بھی یہاں ہوں گے آسکتے ہیں لیکن بیرونی علاج میں تو ڈاکٹر کے مشورے کا مضائقہ نہیں پینے کے لئے یونانی دوا دیدی جائیگی۔ ہاں خوب یاد آیا میں مکہ شریف میں مولوی اسمٰعیل الذبیح بدایونی کا مہمان ہوں۔ انہی کی موٹر میں یہاں آیا ہوں۔ ان کے بھائی حکیم محمد خلیل صاحب بڑے حاذق طبیب ہیں۔ وہ حج کے لئے آنے کو تیار تھے لیکن وہاں بعض ایسے مریض ان کے زیر علاج تھے کہ ان کو چھوڑ نہ سکتے تھے اس لئے اپنی بیوی کو اور عورتوں کے ساتھ بھیجدیا ہے اور وہ ہماری خیمہ کے برابر دوسرے خیمہ میں ہیں میں ڈاکٹر کو بھیجکر حکیم صاحب کی بیوی کو یہاں لاتا ہوں ان سے تمہاری تنہائی رفع ہوگی۔

خالدہ۔ ان بیچاری کو کیوں تکلیف دیتے ہو وہ کیا کریں گی، پھر وہ غیر مردوں میں کیونکر رہیں گی؟

ارشد۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ تمہارے لئے تو ایک گوشے میں پردہ کا انتظام ہے ہی ہیں وہ بیٹھی رہیں گی

وہ بڑی بوڑھی ہیں تمہاری رفاقت کریں گی تمہارے دل کو بھی ان سے تقویت ہوگی اور میں کہ
شریف کو موٹر میں جاتا ہوں اور حکیم صاحب کو لاتا ہوں۔

خالدہ۔ وہ تو حج کے لئے بھی نہ آسکے تھے۔

ارشد۔ اب خدمت خلق کے لئے آجائیں گے اس کو تم مجھ پر چھوڑ دو۔

خالدہ۔ لیکن تم کیا ایسی اندیشہ ناک حالت سمجھتے ہو۔ سچ بتاؤ ارشد میرا دل ٹھکانے نہیں ہے۔

ارشد۔ نہیں خدانخواستہ کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سب اُمید ہے
اور مجھے بالکل اطمینان ہے لیکن تم کہتی ہو کہ چچا آبا حکیم کا علاج پسند کرتے ہیں اور مجھے ان حکیم صاحب
کا بڑا اعتقاد ہے۔ وہ صرف حکیم ہی نہیں بلکہ بڑے بزرگ آدمی ہیں اور شام تک کسی طبیب کو مریضوں
کے پاس رہنے کی ضرورت ہے۔ عرفات کے معالج ٹھہر نہ سکیں گے۔ صرف دیکھ کر دوا دیکر چلے جائینگے

خالدہ۔ لیکن تمہارا اتنی دور جانا اور آنا اور یہ حج کا خاص دن۔ یہاں رہنا ضروری ہے۔

ارشد۔ ضرورت پوری ہولی۔ اب دیر کرنے کا موقع نہیں رہے ہیں جو چاہتا ہوں کرنے دو۔ تم بالکل
نہ گھبراؤ۔ حضرت صاحب قبلہ کی بات یاد رکھو۔ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اور کوئی میزبان اپنے
مہمان کو تکلیف نہیں دیتا۔ اپنے پیر و مرشد کا تصور رکھو اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ۔ میں ابھی آیا۔

ارشد باہر نکلا تو خالدہ کا معلم مل گیا۔ ارشد نے قرینے سے پہچان لیا اور تصدیق کرکے کچھ شکایت اور کچھ
خوشامد کے لہجہ میں ساری صورت حالات بیان کی معلم بہت متاثر ہوا اور فوراً ڈاکٹر کو بلوانے کے لئے تیار ہوگیا۔

"آپ کا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟" معلم نے پوچھا۔

ارشد۔ یہ میرے حقیقی چچا ہیں۔

معلم۔ آپ ان لوگوں سے الگ کیوں ٹھہرے ہیں۔ آپ کا معلم کون ہے۔ خیمہ کہاں ہے؟

ارشد۔ یہ سب باتیں پھر ہو جائیں گی۔ میں بھی یہیں رہوں گا۔ معاف فرمایئے اس وقت جلدی میں ہوں

آپ دیر نہ کیجئے۔ ڈاکٹر کی مدد کی ضرورت ہے شام کو واپسی مشکل ہوجائے گی اس کے آپ ذمہ دار ہیں۔

یہ کہہ کر جلدی جلدی اپنے خیمہ کی طرف چلا۔ راستے میں حکیم صاحب کی بیوی کا خیمہ تھا ان سے حال بیان کیا وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنے ساتھ ایک اور عورت کو لیتی آئیں۔ ارشد نے اِن دونوں کو خالدہ کے پاس پہنچا دیا اور پوچھا اب کیسی طبیعت ہے اس نے کہا کوئی فرق نہیں۔ ارشد نے کہا ڈاکٹر ابھی آتا ہے اور میں جاتا ہوں اس وقت ساڑھے دس بجے ہیں۔ انشاء اللہ ایک بجے سے پہلے واپس آجاؤں گا۔

اب ارشد اپنے خیمہ میں پہنچا۔ اس کے ساتھی دیکھتے ہی اُچھل پڑے اور ایک ساتھ بول اُٹھے" ارشد! کہاں رہ گئے تھے ہم کو تو یقین ہوگیا تھا کہ راستہ بھول گئے ہم تلاش کے لئے جانے ہی والے تھے۔

پھر مصری بولا" دیکھو ارشد کے جاتے وقت میں نے کیا کہا تھا۔ یہ اپنا مقصود حاصل کرنے گئے اور کر لائے ان کے چہرے سے کامیابی ظاہر ہورہی ہے۔

عرب۔ لیکن اس کے ساتھ پریشانی اور کسل بھی ہے۔ لو ارشد قہوہ تیار ہے آؤ بیٹھو۔

ارشد عربی زبان خوب جانتا تھا۔ عربی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ سول سروس کے امتحان میں بھی عربی لی۔ ولایت میں عربی کے پروفیسروں کے علاوہ عربوں اور مصری لوگوں سے ملتا اور گفتگو کرتا رہتا تھا۔ اسی لئے یہاں ان لوگوں کا ساتھ پسند کیا تھا۔ اس نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا" دوستو! اس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں عجیب غیر متوقع حالات رونما ہوتے ہیں اور میں پریشان ہوں۔ آپ لوگ متردد نہ ہوں کوئی خطرناک معاملہ نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہندوستان سے میرے حقیقی چچا حج کے لئے آئے ہیں اور وہ عرفات میں آتے ہی سخت بخار میں مبتلا ہوگئے ہیں اور غافل و بیہوش ہیں مجھے بالکل اتفاق سے اس کا علم ہوگیا۔ میں انھیں کے کام میں تھا اور اس وقت چچا کے علاج کے لئے حکیم محمد خلیل صاحب بدایونی کو لینے کے لئے مکہ جاتا ہوں"

عرب۔ یہاں عرفات کے شفاخانۂ حجاج میں حکیم اور ڈاکٹر بہت ہیں۔

ارشد۔ درست ہے۔ وہ لوگ علاج کررہے ہیں لیکن یہاں کے معالج ہر وقت مریض کے پاس نہیں

رہ سکتے ان کے لئے اور بہتیرے مریض ہوں گے اس کے علاوہ مجھے حکیم صاحب کا خاص اعتقاد ہے۔ پھر اور کام بھی ہیں۔

مصری۔ تو میں تمہارے ساتھ مکہ چلتا ہوں۔ تنہا کیوں جاؤ۔

عرب۔ تم میں سے کسی کے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں تنہا جاتا ہوں مکہ کا رہنے والا ہوں حکیم صاحب کو بھی جانتا ہوں اگرچہ ملاقات نہیں ہے اور بھی جو کام ہو گا تم سب سے بہتر کرلاؤں گا۔

ارشد۔ آپ سب صاحبوں کا شکریہ۔ لیکن کسی کو تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں۔ حکیم صاحب میرے میزبان اور خاص کرمفرما ہیں۔ مجھے ہی جانا چاہئے۔

مصری۔ تو ہم سب تمہارے چچا کی تیمارداری کریں گے۔

ارشد۔ اس تکلیف کی بھی ضرورت نہیں وہاں تیماردار موجود ہیں۔

عرب۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے چچا بیمار، تم پریشان، تم تو مکے تک جا رہے ہو اور ہم دوسرے خیمہ تک نہ جا سکیں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔

ارشد۔ جزاکم اللہ احسن الجزا۔ میں تو آپ لوگوں کی غیر ضروری زحمت کے سبب سے کہتا تھا۔

مصری۔ یہ کیا زحمت ہے ہم نے تو حج کے یہی معنی سمجھے ہیں۔

عرب۔ ارشد لو چائے تیار ہے۔ تم بے حد خستہ و مضمحل ہو تمہارے لئے اس وقت چائے اکسیر ہے۔

ارشد۔ میں بھی پی لوں گا۔ لیکن تم سینی میں چائے لگا دو۔ میں وہاں لے جاؤں گا تیمارداروں کو مجھ سے زیادہ ضرورت ہو گی۔

عرب۔ بیشک بیشک۔ وہ چلو سینی لئے چلتے ہیں ہم بھی تمہاری واپسی تک وہیں تمہارے چچا کی خدمت میں رہیں گے۔

سب اٹھ کر ارشد کے ساتھ چلے آئے۔ پیچھے ارشد آہستہ سے خیمہ کے اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر علم اور دو

ایک اور آدمی موجود تھے۔ ارشد کے اشارے پر اس کے دوست بھی آ گئے۔ ارشد نے ڈاکٹر سے حال پوچھا۔ اس نے کہا معمولی بخار ہے البتہ تیز بہت ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس دوا میں کپڑا تر کرکے سر پر رکھا جائے اور یہ دوا ایک ایک گھنٹہ کے بعد پلائی جائے۔

ارشد۔ چچا صاحب ڈاکٹری دوا بالکل نہیں پیا کرتے۔

ڈاکٹر۔ کچھ حرج نہیں، میں یونانی دوا منگاتا ہوں۔

ارشد۔ میرے دوست تیمارداری کریں گے ان کو سب ہدایات دیدیجئے۔

یہ کہہ کر ارشد چائے کی سینی لے کر زنانہ پردہ کے پاس گیا اور باہر ہی سے حکیم صاحب کی بیوی سے کہا۔ "چچی یہ چائے لے لیجئے آپ بھی پیجئے اور خالدہ کو بھی پلائیے الحمدللہ کوئی تردد کی بات نہیں ہے۔ شام تک انشاءاللہ بخار اُتر جائے گا۔ میں مکہ شریف جاتا ہوں اور حکیم صاحب کو لاتا ہوں۔

۳

عصر کا وقت ہے۔ خالدہ کے خیمے میں حکیم محمد خلیل صاحب بدایونی اور ارشد کے چاروں دوست خالدہ کے والد کے پاس بیٹھے ہیں۔ ان کا بخار بالکل اُتر چکا ہے، اس قدر پسینہ آیا کہ احرام کی چادریں تر ہو گئیں۔ دوسری چادریں بدلیں۔ اتنی حرکت سے تھک گئے۔ حکیم صاحب نے دوا پلائی۔ نیند آ گئی تھی ابھی آنکھ کھلی ہے۔

حکیم صاحب۔ سید صاحب اب طبیعت کیسی ہے؟

سید صاحب۔ الحمدللہ اچھا ہوں، ضعف بہت معلوم ہوتا ہے۔

حکیم صاحب۔ ابھی خاموش لیٹے رہئے۔ دوا اور پی لیجئے۔

سید صاحب۔ حکیم صاحب ہم عرفات میں ہیں۔

حکیم صاحب۔ جی ہاں!

سید صاحب۔ کیا وقت ہے؟

حکیم صاحب۔ عصر کا وقت ہے۔

سید صاحب۔ میں نے کون کون سی نمازیں نہیں پڑھیں کب سے بیہوش تھا اس عرصہ میں کیا گزری؟

حکیم صاحب۔ خدا کے لئے ابھی زیادہ باتیں نہ کیجئے ذرا اور طاقت آجائے

سید صاحب۔ ممدو کا کیا حال ہے۔ کہاں ہے؟

حکیم صاحب۔ یہیں ہے۔ بالکل اچھا ہے۔ وہ بھی بخار میں غافل تھا اس کا بخار آپ سے پہلے اتر گیا۔ آپ کے پائنتی بیٹھا قہوہ پی رہا ہے۔

سید صاحب۔ الحمد للہ! اور بٹیا کہاں ہے خالدہ؟

حکیم صاحب۔ یہیں خیمہ میں پردہ کے اندر ہیں۔

سید صاحب۔ حکیم صاحب تکلیف فرما کر اس کو یہیں بلا لیجئے آپ سے کیا پردہ ہے آپ اس کے چچا سے بڑے ہیں۔

یہ فقرہ کہہ کر کچھ خیال آگیا اور سید صاحب کی پیشانی پر ایک لمحہ کے لئے بل پڑ گئے۔ حکیم صاحب اٹھے۔ ارشد کے دوست پلنگ کے دوسری طرف بیٹھے تھے سید صاحب نے ان کو نہ دیکھا تھا حکیم صاحب نے اشارے سے ان لوگوں کو خیمہ سے باہر بلایا اور کہا۔ سید صاحب اپنی بیٹی کو اپنے پاس بلاتے ہیں۔ اگرچہ اس سفر و مقام میں زیادہ پردے کی ضرورت نہیں لیکن ان کے مزاج کا حال معلوم نہیں اور ہندوستان کی تہذیب یہی ہے اس لئے آپ ذرا باہر تشریف رکھیں۔ ان لوگوں نے کہا، اس تشریح کی ضرورت نہ تھی۔ ہم خود سمجھتے ہیں اس کے بعد حکیم صاحب نے پردہ کے پاس جا کر کہا: "بیٹی خالدہ! تمہارے والد بلاتے ہیں" اتنا کہہ کر پھر سید صاحب کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

سید صاحب۔ آپ کسی سے باتیں کر رہے تھے۔

حکیم صاحب۔ یہیں کے کچھ لوگ تھے۔ کئی گھنٹہ سے آپ کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ یہیں بیٹھے

تھے پلنگ کی دوسری جانب تھے اس لئے آپ نے اُن کو نہ دیکھا تھا۔

سید صاحب۔ معلوم ہوتا ہے میں خطرناک حد تک بیمار رہا۔ پھر وہ لوگ کہاں ہیں۔ بلائیے۔ میں اُن کا شکریہ ادا کروں۔

حکیم صاحب۔ آتے ہیں۔ ذرا باہر گئے ہیں۔ برائے خدا آپ ابھی خاموش رہیے۔ مجھے آپ کے ضعف سے اندیشہ ہوتا ہے۔

اتنے میں خالدہ آگئی اور باپ کے پاس بیٹھ کر "ابا" کہا اور رونے لگی۔

سید صاحب۔ بیٹی خالدہ میں تو بالکل اچھا ہوں روتی کیوں ہو۔ بیٹی میں پہلے ظہر و عصر کی نماز پڑھوں گا جماعت کے ساتھ وقت پر پڑھتا ظہر کے وقت ظہر و عصر کو ملا کر پڑھنی چاہئے تھی ظہر تو غفلت میں قضا ہو ہی گئی۔

حکیم صاحب نے ہر چند اصرار کیا کہ اُٹھ کر بیٹھنے میں تکلیف ہوگی تیمم کر کے لیٹے لیٹے پڑھ لیجئے لیکن سید صاحب نہ مانے اور بیٹھ کر نمازیں پڑھیں لیکن اس قدر تھک گئے کہ لیٹتے ہی سو گئے۔ حکیم صاحب نے جلدی سے دوا پلادی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھ کھولی اور بولے۔

سید صاحب۔ آج کون سا دن ہے؟

حکیم صاحب۔ جمعرات ہے۔

سیّد صاحب۔ ہم ہندوستان سے یہ اُمید کرتے آرہے تھے کہ نویں ذی الحجہ کو جمعہ کا دن پڑے گا اور "حج اکبر" نصیب ہوگا لیکن یہاں چاند میں اختلاف ہوگیا اور حکومت نے حج اکبر کا فیصلہ نہ کیا۔

حکیم صاحب۔ جی، مطلع میں ایسا فرق ہو ہی جاتا ہے ۱۳۴۵ھ میں یہاں حج اکبر ہوا اور دسویں کو سنیچر تھا لیکن ہندوستان میں اتوار کو عید ہوئی۔

سیّد صاحب۔ حکیم صاحب آپ کی تکلیف فرمائی کا شکریہ کیونکر ادا ہو سکتا ہے کہ سب مریضوں کو

چھوڑ کر گھنٹوں سے میرے پاس تشریف رکھتے ہیں۔ آپ تو حکومت کی طرف سے شفاخانہ کے ساتھ آتے ہوں گے؟

حکیم صاحب۔ جی نہیں، خاص آپ کے لئے مکّہ سے آیا ہوں۔

سید صاحب۔ مکّہ سے میرے لئے؟ آپ کا اسم مبارک؟ میں نے پہچانا نہیں۔

حکیم صاحب۔ میں بدایوں کا رہنے والا ہوں۔ محمد خلیل کہتے ہیں۔ پہلے میں نے بھی آپ کو کبھی نہ دیکھا تھا؟ اسمٰعیل ذبیح میرے چھوٹے بھائی مکّہ میں برقی روشنی کے انجینیر و مہتمم ہیں۔ آپ نے ممکن ہے اُن کا نام سُنا ہو۔

سید صاحب۔ بیشک اسمٰعیل ذبیح صاحب بدایونی کا نام سُنا یاد ہے لیکن کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اچھا تو آپ کو میری علالت کی کیا خبر۔ مکّہ معظمہ میں بھی کبھی نیاز حاصل نہیں ہوا۔

حکیم صاحب۔ سیّد صاحب، آپ پھر دیر سے باتیں کر رہے ہیں تھک جائیں گے اور ابھی گھنٹہ بھر میں مزدلفہ کا سفر درپیش ہے۔

سیّد صاحب۔ حکیم صاحب مجھے بڑی حیرت اور اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔ اچھا آپ چاہتے ہیں کہ میں نہ بولوں تو آپ خود ہی ہمارے عرفات میں آنے سے اب تک کے حالات بیان کر دیجیے (خالدہ کی طرف مخاطب ہو کر) بیٹی خالدہ تم سب حالات بیان کرو حکیم صاحب تو بعد میں آئے ہوں گے۔

حکیم صاحب۔ نہیں میں ہی عرض کرتا ہوں لیکن کل صبح تک یہ گفتگو ملتوی رکھئے تو کیا حرج ہے میں آپ پوری صحت و قوت تک ساتھ رہوں گا۔ خلاصہ سُن لیجئے کہ آپ عرفات میں آتے ہی بخار میں غافل ہو گئے۔ یہاں کے معالجوں اور تیمارداروں نے خدمت کی۔ پھر میں حاضر ہو گیا اب آپ اچھے ہیں اور کوئی خطرہ باقی نہیں رہا نہ بفضلہ پہلے تھا۔

سیّد صاحب۔ آپ کو کس نے خبر کی ؟ کس نے بلایا ؟ بیٹی خالدہ تم نے ؟ تم ان کو کیا جانو۔ مُدّد آپ ہی پڑا ہو گا۔ معلم یہاں کے معالجوں کے ہوتے مکہ شریف سے کسی کو کیوں بُلاتا۔ پھر ؟

حکیم صاحب نے دیکھا کہ اب بات ٹل نہیں سکتی۔ بیان کرنا ہی پڑے گا۔ تو سوچا کہ ایسے عنوان سے بیان کیا جائے کہ غیر معمولی بات کا اثر کم سے کم ہو بولے۔

حکیم صاحب۔ سیّد صاحب آپ کے بھتیجے ارشد ولایت سے واپس ہندوستان جانے لگے تو حج کا زمانہ قریب تھا۔ یہ سعادت حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے پھر مکہ مکرمہ آئے۔ آج صبح ان کو یہاں کسی ذریعہ سے علم ہوا کہ آپ بھی آئے ہیں اور سخت بیمار ہیں آپ جانتے ہوں گے کہ آپ کا معلم ذرا بے پروا سا ہے۔ ارشد نے کوشش کر کے تاکید کے ساتھ آپ کے معلم کی معرفت یہاں کے ڈاکٹر کو بلایا۔ میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ ارشد مکہ میں ہمارے مہمان ہیں ان کے والد مرحوم سے اسمٰعیل ذبیح کے خاص تعلقات تھے۔ اسمٰعیل نے ارشد کو اپنی کار میں عرفات بھیجا ہے اور حسنِ اتفاق یہ کہ میری اہلیہ بھی حج کے لئے آئی ہوئی ہیں۔ ارشد نے خالدہ کی تنہائی و پریشانی کو دیکھ کر میری اہلیہ کو خالدہ کے پاس پہنچا دیا وہ اس وقت اس پردہ کے پیچھے موجود ہیں۔ پھر اپنے عرب دوستوں کو جو ان کے رفیقِ حج اور شریکِ خیمہ تھے آپ کی خدمت و تیمارداری کے لئے لائے۔ اس کے بعد کار پر مکہ گئے اور مجھے لائے اور آپ کے اور مُدّد کے لئے دو آرام دہ اسٹریچر اور آٹھ حمال لائے کہ مزدلفہ کے سفر میں آسانی ہو۔ ہم تو کار میں آ گئے تھے۔ حمال ابھی تھوڑی دیر ہوئے پہنچے ہیں۔

سیّد صاحب نے اس تقریر کے درمیان میں اپنے چہرہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا حکیم صاحب خاموش ہوئے تو انھوں نے ہاتھ ہٹایا۔ حکیم صاحب نے دیکھا کہ آنکھیں پُرنم ہیں سمجھ گئے تیر نشانے پر جا لگا۔

سیّد صاحب۔ ارشد کہاں ہے ؟

حکیم صاحب ۔ خیمہ کے باہر بیٹھے ہیں۔
سیّد صاحب ۔ بُلائیے!
حکیم صاحب اُٹھ کر خیمہ کے دروازے پر گئے اور ارشد کو اشارہ کیا وہ قریب آیا تو کہا آؤ بلاتے ہیں ارشد یہ سُنتے ہی لڑکھڑا گیا۔ اس کو تصور بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی میرا ذکر آجائے گا اور سامنے جانا پڑے گا۔ سنبھلا اور دبے پاؤں اندر آکر چچا کے پاس پٹی پر جُھک گیا۔ اور کہا: "چچا آبا معاف فرمائیے"، اور بے اختیار ہوکر رونے لگا۔
سیّد صاحب نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا: "بیٹا تمہارا کچھ قصور نہ تھا غلطی میری ہی تھی اور اسی کا اب تک حجاب تھا۔ میں تم سے خوش ہوں"
حکیم صاحب نے دیکھا کہ باپ بیٹی بھتیجا تینوں رو رہے ہیں حکیم صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے جب ذرا دیر میں جذبات کا جوش فرو ہوا تو حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا۔
حکیم صاحب ۔ سیّد صاحب حجِ اکبر مُبارک ہو۔
سیّد صاحب نے استعجاب سے حکیم صاحب کی طرف نظر اُٹھائی۔
حکیم صاحب ۔ دل بدست آور کہ "حجِ اکبر" است!

(مطبوعہ عالمگیر عید قرباں نمبر ۱۹۳۶ء)

یہ فسانہ مطبوعہ و مسودہ دونوں میرے پاس نہ رہے تھے۔ کتاب کے یہاں تک چھپنے کے بعد میرے شاگرد مسٹر عبدالعلیم شیرکوٹی بی۔ اے (فائنل) نے کہیں سے ڈھونڈھ کر دیا۔ اس لئے سالِ تحریر کی ترتیب کے لحاظ سے بے جگہ ہو گیا۔

"انّا پیاسی بلّی دیکھوں گی" ایک چھوٹی سی لڑکی نے رو کر کہا۔ اور کرسی پر چڑھ کر کھڑکی کی سلاخیں پکڑ لیں۔

مسٹر ریڈ فورڈ شون نے لڑکی کو خاموش کرنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا اور جب سے ہم کمرے میں داخل ہوتے تھے یہ چھٹی بار تھی کہ نرس (انّا) نے روتی ہوئی بچّی کو گود میں اُٹھایا اور بہلا کر چُپ کرانے لگی۔ لیکن خاموشی ایک منٹ سے زیادہ قائم نہ رہی۔ انّا اس عظیم الشان انسان کی حکیمانہ تقریر میں محو ہو گئی اور لڑکی اُس کی گود سے اُتر کر پھر چلّانے لگی۔

"انا پیاسی بلّی دیکھوں گی"

مسٹر شون کا سلسلۂ کلام یکا یک منقطع ہو گیا اور اس نے غصّہ میں چلّا کر کہا "اگر یہ لڑکی اسی طرح شور مچاتی رہی تو کام نہیں ہو سکتا"

"ایلا بیٹی، چپ ہو جاؤ" انّا نے سخت لہجہ میں لڑکی سے کہا "دیکھو یہ لوگ تمہارے بھائی مارس کا پتہ لگانے آئے ہیں۔ اگر تم اس طرح ضد کرتی رہو گی تو یہ باتیں نہیں کر سکتے۔ اس کمبخت بلّی کی رٹ لگا کر ان صاحبوں کو پریشان نہ کرو"

"میں تو پیاسی بلّی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ مارس بھی دیکھنا چاہتا ہے" لڑکی نے مچلتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے کہ ہم دوسرے کمرے میں چل کر گفتگو کریں" شون نے مایوس ہوکر دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا "پیاسی بلیوں کی خلل اندازی کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہے جبکہ اس معاملہ سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا"

اِس فقرے سے یکایک انا کے چہرے پر ایک ذرا اطمینان و تسکین کے آثار ایک لمحہ کے لئے نمایاں ہوئے اور غائب ہوگئے۔ لیکن میں نے یہ کیفیت دیکھ لی اور شون کے پیچھے جاتے جاتے ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گیا۔

"پیاسی بلّی سے لڑکی کا کیا مطلب ہے؟" میں نے نرس سے پوچھا۔

"اُونھ۔ کچھ نہیں۔ کوئی کام کی بات نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا۔" ایلا اور مارس اس کھڑکی میں بیٹھ کر ایک بلّی کو دیکھا کرتے تھے جو سامنے کے مکان کی کھڑکی پر بیٹھی طشتری میں دودھ پیا کرتی تھی۔ کچھ دنوں سے بلّی وہاں نظر نہیں آتی۔ مس ایلا اس کے لئے ضد کرتی ہے"

لندن کے مُتموّل طبقہ میں اِس واقعہ سے نہایت انتشار و تردد پھیل گیا تھا کہ لارڈ اور لیڈی ٹریسی لین کا ہفت سالہ لڑکا اور ولی عہد گم ہوگیا ہے۔ لارڈ کی بےشمار دولت اور ان حالات نے جن کے ماتحت لارڈ نے نو سال ہوتے شادی کی تھی اس واقعہ کو نہایت پُراسرار و باعث تشویش بنا دیا۔

شادی کے وقت لارڈ ٹریسی لین کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ اور عقد نکاح سے چند ماہ قبل تک مشہور و مسلّم تھا کہ لارڈ صاحب کنوارے ہی رہیں گے۔ لارڈ کا وارث و ولی عہد اس کا بھتیجا آنریبل رالف ویلینڈ تھا جو اپنے اسراف اور بے اعتدالیوں کی بدولت بہت کچھ بدنام تھا۔ رالف ویلینڈ نے ایک ادنیٰ درجہ کی مغنیہ سے شادی کر لی۔ اس بات سے لارڈ ٹریسی لین اس درجہ برافروختہ و برہم ہوئے کہ اُنھوں نے بھی میدان تاہّل میں گامزن ہونے کا ارادہ کر لیا اور اس اُمید پر کمسن سالی میں دلہن بیاہ لائے کہ جائز و اصلی وارث پیدا ہو۔

اور ننگ خاندان بھتیجا خطاب و دولت سے محروم ہو جائے۔ لارڈ صاحب کی اُمید بر آئی اور شادی کے دوسرے سال لڑکا اور اس سے اگلے سال ایک لڑکی تولد ہوئی۔

اس شادی کے بعد سے خاندان ٹرلیسی لین کے معاملات رو براہ ہو گئے حتیٰ کہ کئی سال بعد ایک صبح کو لیڈی ٹرلیسی لین پولیس اسٹیشن تشریف لائیں اور انسپکٹر سے ملنا چاہا۔ میں اس وقت حاضر تھا۔ شرفِ خدمت حاصل کیا۔ لیڈی صاحبہ نہایت اضطراب میں تھیں۔ معلوم ہوا کہ ان کا لڑکا آنریبل مارس ویلینڈ تین روز سے گم ہے اور وہ اس کی تفتیش کے لئے پولیس کی امداد چاہتی ہیں۔

جب میں نے بیان کیا کہ پولیس کو دیر میں اطلاع ملنے سے معاملہ کے سُلجھانے میں بڑی دشواریاں پیش آجاتی ہیں۔ تو لیڈی نے غصہ کے لہجہ میں کہا "میں جانتی ہوں۔ لیکن تاخیر کا سبب لارڈ ٹرلیسی لین کا خاندانی اعزاز واقتدار کا فضول خیال تھا۔ اور اب بھی میں بغیر ان کے علم کے آئی ہوں۔ اُنھوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ لڑکے کی گم شدگی کا ذمہ دار ان کا بھتیجا اور سابق ولی عہد رالف ویلینڈ ہے اس لئے وہ ہر طرح کوشش کر رہے ہیں کہ لڑکا بغیر شور و غوغا کے مل جائے۔ آپ نے مسٹر ریڈ فورڈ شون کا نام سُنا ہے؟"

"پرائیویٹ سراغرساں؟ جی ہاں میں نے سُنا ہے کہ اس کا کام خوب چل رہا ہے" میں نے جواب دیا

"خیر۔ لارڈ ٹرلیسی لین اس کے پاس گئے۔ اور لڑکے کی جستجو اس کو سپرد کردی"، لیڈی نے بیان کیا۔

"مسٹر شون بھی اس رائے میں میرے شوہر سے متفق ہے کہ اس کام میں رالف ویلینڈ کا ہاتھ ضرور ہے۔ لیکن وہ اب تک اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ادنیٰ سی شہادت بھی بہم نہ پہنچا سکا۔ میں اس طرح کی کارروائی کا زیادہ انتظار نہیں کرسکتی۔ اس لئے میں نے باضابطہ رپورٹ کرنے کا تہیہ کر لیا"

میں نے لیڈی صاحبہ سے کہا کہ آپ نے نہایت دانشمندی سے کام لیا۔ پرائیویٹ سراغرساں کتنا ہی ماہر ہو گم شدگی کے معاملات میں پولیس کو جو آسانیاں میسر ہیں وہ اس کو نہیں ہوسکتیں۔ اس کے بعد میں نے ان سے درخواست کی کہ گھر جا کر لارڈ ٹرلیسی لین کو اس رپورٹ کی اطلاع کردیں اور وعدہ کیا کہ میں بھی پیچھے

پیچھے مکان پر حاضر ہوتا ہوں۔ جب میں پہنچا تو لارڈ اور لیڈی کی بخش آمیز گفتگو قریب ختم تھی۔ بوڑھا امیر بیوی کے رپورٹ کرنے پر خفا ہو رہا تھا اور اندیشہ ظاہر کر رہا تھا کہ خاندانی ننگ و نام پر داغ لگ جائے گا۔ میں نے شوہر کے غصہ کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کیا کہ جب مسٹر ریڈ فورڈ شون تین دن میں اپنے شبہہ کو ثابت نہ کر سکا تو ممکن ہے اس کا سبب کچھ اور ہی ہو۔ میں ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ شون آ پہنچا۔ اور مجھ سے کہا گیا کہ شون کے ساتھ نرس کے پاس جا کر اس کا بیان سنوں۔

بچوں کی نرس میلون کا بیان جس میں لڑکی کے چیخنے چلانے سے رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ نہایت ناکافی تھا۔ گذشتہ دوشنبہ کی سہ پہر کو وہ دونوں بچوں کو کمرے میں چھوڑ کر نیچے ان کی چائے لینے کے لئے گئی تھی۔ واپس آئی تو لڑکا غائب تھا۔ ہر چند تلاش کیا گیا کہیں پتہ نہ چلا۔ شون کی رائے جس کے بیان کرنے میں ایلا کے سبب سے دشواری پیش آ رہی تھی یہ تھی کہ رالف ویلینڈ نے نیچے سڑک پر کھڑے ہو کر بچے کو اشارے سے بلایا۔ لڑکا اس کے پاس چلا گیا۔ پھر بند گاڑی میں بٹھا کر اڑا لے جانا ایک آن کا کام تھا۔

یہ شبہہ بیشک بلا وجہ نہ ہو سکتا تھا لیکن میرے نزدیک اس میں سب سے بڑی خامی یہی تھی کہ یہ سب سے پہلا اور کھلا ہوا شبہہ تھا۔ مسٹر ویلینڈ کو لڑکے کے اغوا کے وقت معلوم ہونا چاہئے کہ پہلا شبہہ اسی پر ہوگا۔ پھر بھی اس نے یہ کام کیا تو بڑا ہی چالاک اور عیار آدمی ہوگا۔ اور ایسی تدابیر اختیار کی ہوں گی کہ شون جیسی شہرت کے آدمی کو دھوکہ دے سکے۔

مجھے پہلے ہی سے احساس تھا کہ شون کو میری مداخلت ناپسند ہوگی اور فطری طور پر اس کی یہ خواہش ہوگی کہ ایسے نفع خیز معاملے کو بغیر پولیس کی مداخلت کے حل کرے۔ جب میں نرس کے پاس سے ہٹ کر زینہ سے اترتے ہوئے شون سے ملا تو اس کی رائے کے متعلق اپنا شبہہ دبے دبے الفاظ میں بیان کیا۔

"لیکن مسٹر رالف ویلینڈ نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔" اس نے غرور آمیز لہجہ میں کہا۔ "اگر لیڈی ٹریسی لین تھوڑی دیر اور صبر کرتیں تو میں ان کو بالکل یقین دلا دیتا۔"

اتنے میں ہم دونوں لائبریری میں پہنچ گئے جہاں لارڈ اور لیڈی ہمارے منتظر تھے شون نے وہی طرزِ کلام جاری رکھا۔

"میں انسپکٹر ہمینڈ سے کہہ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ کل تک میں مسٹر رالف ویلینڈ کے خلاف مکمل ثبوت بہم پہنچا دوں گا" اس نے کہا۔" اب چونکہ پولیس اس معاملہ میں آکودی ہے۔ تو وہ اگر چاہے تو اپنی جداگانہ تحقیقات قائم رکھ سکتی ہے"

"اُمید ہے کہ آپ اپنی تحقیقات سے ہمینڈ کو مطلع کر کے اُن کو فائدہ پہنچائیں گے" لارڈ ٹریسی لین نے اشتیاق آمیز لہجہ میں کہا۔

لیکن مسٹر ریڈ فورڈ شون نے سر ہلا کر کہا: " میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر پولیس اپنی مدد آپ نہ کر سکے تو اس کی مدد کرنا بے سود ہے۔ بہر حال میں اِن الفاظ کو دُہرانے میں مضائقہ نہیں سمجھتا جو آپ دونوں سے کہہ چکا ہوں کہ میں نے مسٹر رالف ویلینڈ کے مکان واقعہ مالڈن کی جو سخت نگرانی کر رکھی ہے اس سے ایسے حالات دریافت ہوئے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ ان حالات کو آج رات تک قوی ثبوت کی صورت میں پیش کر سکوں گا"

لارڈ ٹریسی لین غصہ سے اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔" دیکھو آگسٹا تم نے کس قدر عجلت سے کام لیا" اس نے کہا" اگر مارس رالف کے پاس نکلا تو پولیس میرے بھتیجے کو گرفتار کر کے میرے خاندان کو بدنام کرے گی۔ اور کیا کر سکتی ہے"

" لیکن ممکن ہے کہ میرا بچہ قتل کر دیا گیا ہو" لیڈی نے رقّت آمیز آواز سے کہا۔" اس صورت میں تم صرف خاندانی عزت کی خاطر رالف کو بچاؤ گے؟"

" ابھی ایسے قرائن نہیں ہیں کہ بچے کے ساتھ کوئی ظالمانہ سلوک کیا گیا ہو" شون نے جلدی سے کہا " اگرچہ اندیشہ ہے کہ اگر مسٹر ویلینڈ کو زیادہ دبایا گیا تو خدا جانے کیا کر بیٹھے"

یہ آخری تیر لیڈی ٹریسی لین پر اور پولیس پر چھوڑ کر مسٹر ریڈ فورڈ شون رخصت ہو گیا۔ میں بھی اُٹھنے

والا تھا کہ لارڈ ڈریسی لین نے اشارے سے روک لیا۔

"تم نے شون کی رائے سُنی" بوڑھے لارڈ نے مجھ سے کہا "ممکن ہے اِس معاملہ میں تمہاری مداخلت سے میرے لڑکے کی جان پر بن جائے۔ اب انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک شون اپنا کام ختم نہ کرے تم کوئی کارروائی نہ کرو"

اب ماں باپ دونوں میرے مخالف تھے۔ اس لئے کہ لیڈی بھی شون کے بیان سے اپنے بیٹے کی جان کو خطرے میں سمجھ کر شوہر کی ہم رائے ہوگئی اور روتے ہوتے مجھ سے کہا کہ میں کم سے کم اس روز کے لئے اپنی کارروائی ملتوی کردوں۔

شون کے آخری فقروں سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ میاں بیوی میں صلح ہوگئی۔ بوڑھے لارڈ نے بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور دونوں یک زبان ہوکر مجھ سے اس طرح اصرار کرنے لگے کہ گویا ان کا مخاطب ایسا ظالم و سنگدل پولیس مین ہے جو صرف رالف ویلینڈ کو پھانسنے کے لئے سیکڑوں بچوں کی قربانی کے لئے تیار ہے حالانکہ ان کا یہ خیال میرے جذبات سے جو اِن کی مصیبت سے متاثر ہوکر پیدا ہورہے تھے کس قدر مختلف تھا۔

"دیکھئے مائی لارڈ" میں نے کہا۔ "ہم پولیس کے آدمی باہر کے لوگوں کی رائے کا اتباع نہیں کیا کرتے اور سوائے شون کی رائے کے اور کوئی ثبوت اس بات کا موجود نہیں کہ آپ کے بھتیجے نے آپ کے لڑکے کو چرایا ہے۔ میں اس بات کو فرض کرکے معاملہ کو ہاتھ میں نہ لوں گا۔ اور مسٹر رالف ویلینڈ کے نزدیک تک نہ جاؤں گا۔ جب تک میرا سُراغ نہ لے جائے اور اس حالت میں بھی آپ کے صاحبزادے کی سلامتی و حفاظت کا خیال رکھوں گا۔ بالفعل جو سراغ مجھے معلوم ہوا ہے وہ ہزمجسٹی (بادشاہ) تک پہنچنے کا بھی ایسا ہی احتمال رکھتا ہے جیسا آپ کے بھتیجے تک پہنچنے کا"

"آپ کو کوئی سراغ ہاتھ آگیا ہے؟" دونوں نے بیقرار ہوکر کہا۔

"سراغ کا گمان ضرور ہے" میں نے جواب دیا۔ "اور آپ کی اجازت سے میں اس کے مطابق عمل

کرنا چاہتا ہوں۔"

لارڈ ٹریسی لین اب میری کارروائی کا ایسا ہی مشتاق نظر آیا جیسا اس سے قبل بددل و متاسف تھا۔ میرے ساتھ نہایت اخلاق کے ساتھ دروازے تک آیا گویا اپنی سابقہ کج خلقی کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پولیس کے مخصوص لہجہ میں سوال کیا کہ نرس میلوِن کب سے ملازم ہے۔

"تقریباً دو مہینے سے" اس نے جواب دیا "لیکن یقیناً آپ کا یہ خیال نہ ہوگا کہ وہ "

"میرا کچھ بھی خیال نہیں ہے۔ اور جب تک مجھے علم نہیں ہو جاتا میں اظہار نہیں کیا کرتا" میں نے اس سے جدا ہو کر زینہ سے جلدی جلدی اترتے ہوئے کہا۔

وہاں سے نکل کر ایک قریب کے پبلک ہاؤس میں داخل ہوا اور ڈائرکٹری لے کر لارڈ ٹریسی لین کے مکان کے مقابل مکان کو کتاب میں تلاش کیا۔ ڈائرکٹری میں اس مکان کے سامنے کسی ساکن کا نام نہ تھا اس لئے میں نے قیاس کر لیا کہ یہ اس قسم کا مکان ہے جو عارضی کرایہ داروں کو دیا جاتا ہے۔ یہ بات میرے اس خیال کے مطابق تھی جو میں نے لارڈ کے بچوں کے کمرے میں قائم کیا تھا۔ نصف گھنٹہ سے کم میں مختلف مکانات کے ایجنٹوں سے گفتگو کر کے معلوم ہو گیا کہ ایجنٹ نے وہ مکان کسی شخص کپتان اسٹریٹن کو کرایہ پر دیا ہے کپتان نے دو مہینے کے لئے کرایہ پر لیا تھا۔ جس میں سے ایک ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا تھا۔

ایجنٹ سے گفتگو کر کے میں پولیس اسٹیشن گیا اور ایک نوجوان کانسٹبل کو سادہ کپڑے پہنا کر اس مکان اور ساکن مکان کے حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ کانسٹبل فوراً واپس آیا اور بیان کیا کہ مکان ہر طرف سے بند ہے۔ کوئی شخص جواب نہیں دیتا معلوم ہوتا ہے غیر آباد ہے۔ یہ رپورٹ سُن کر میں نے بھی اپنی وردی کو سادہ لباس میں تبدیل کیا اور کانسٹبل کو لے کر اس مکان پر پہنچا۔ دروازے سے اندر داخل ہوا تو سب کمرے بند تھے۔ باورچی خانہ کی کھڑکی کو زبردستی کھول کر اندر داخل ہوا۔ ایک نگاہ میں معلوم ہو گیا کہ رہنے والوں نے نہایت عجلت کی حالت میں مکان کو خالی کیا ہے اور ایجنٹ کو باقاعدہ مکان کا قبضہ دے کر نہیں گئے۔

میلے برتن اور خراب فرش کرایہ داروں کی بدسلیقگی کے گواہ تھے۔ اب ہم دونوں اوپر کی منزل پر پہنچے وہاں کے کمروں کی حالت بھی ایسی ہی ردی تھی۔ فرنیچر منتشر پڑا تھا اور میز پر بچا ہوا کھانا رکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو آدمیوں کے لئے کھانا چنا گیا تھا۔ لیکن جس چیز نے میرے اور میرے ساتھی کی زبان سے نعرۂ حیرت بلند کرایا وہ ایک بڑی سیاہ بلی تھی جو کانس پر خالی طشتری کے پاس بیٹھی نہایت چمکدار آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی اس کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس کے گلے میں پٹہ پڑا ہے جس میں ایک لمبا ڈورا بندھا ہو! ہے ڈورے کا سرا کسی چیز سے بندھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ فرش پر پڑا ہوا ہے۔

"پوس۔ پوس! پوس!" میرے اسسٹنٹ نے کہا۔ لیکن جواب میں "میاؤں" کی آواز نہ آئی۔ وہ اس کے پاس گیا اور ہاتھ پھیرا اور یکایک چلّا اُٹھا۔

یہ اصلی نہیں ہے۔ مصنوعی بلی ہے"

میں نے یہ بات پٹے اور ڈوری کو دیکھ کر پہلے ہی سمجھ لی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ میں نے "پیاسی بلی" کے سراغ سے کارروائی کی ابتدا کرنے میں غلطی نہیں کی۔ یہ سراغ مسٹر الفت دلینڈ تک پہنچے یا نہ پہنچے مجھے اس بات سے بڑی مسرت تھی اور نہایت اطمینان کہ بہرحال یہ سراغ مسٹر ٹیڈ فورڈشون سے بالکل الگ ہے۔ میں آیندہ کارروائی پر غور کر رہا تھا کہ یکایک نرس میلون پر نظر پڑی جو لارڈ ٹریسی لین کے مکان سے نکل رہی تھی۔ اس مکان پر جس کی ہم تلاشی لے رہے تھے نظر ڈالتی ہوئی سڑک پر ہولی۔

"اس عورت کا تعاقب کرو"، میں نے نرس کی طرف اشارہ کرکے اپنے ساتھی سے کہا۔" اور جب اس کی منزلِ مقصود معلوم ہو جائے تو دفتر میں آکر رپورٹ کرو۔"

نوجوان کانسٹبل فوراً روانہ ہو گیا۔ اور میں نے مکان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اب تمام کارروائی میری سمجھ میں آگئی۔ کسی شخص نے یہ مکان خاص اس مقصد سے کرایہ پر لیا تھا کہ لارڈ ٹریسی لین کے بیٹے اور ولیعہد کو چُرا لے جائے۔ اور نرس میلون اس کام میں شریک ہے۔ مصنوعی بلی بچے کی دلچسپی اور شوق کو تحریک دینے

اور اُس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے استعمال کی گئی تھی۔ موقع دیکھ کر بچہ کو بلی کے بہانے سے بلایا شام تک مکان میں بند رکھا اور رات کی تاریکی میں کسی دوسرے مقام پر پہنچا دیا۔

ایلا کا بار بار "پیاسی بلی" کا ذکر کرنا اور نرس کا اس کو روکنا میرے شبہہ کا باعث ہوا تھا۔ اور اب اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ نرس ہم کو مکان میں جاتا دیکھ کر اپنے شریکِ جرم کو اطلاع دینے گئی ہو۔ بہرحال میرے ان قیاسات میں شون کے دعوے کی تردید کرنے والی کوئی بات نہ تھی۔ ممکن تھا کپتان ماسٹرمین اور لارڈ کا بھتیجا ایک ہی شخص ثابت ہوں۔ پھر بھی مجھے اطمینان تھا کہ میں نے جائز و باقاعدہ سراغ کی پیروی کی ہے جبکہ شون نے صرف اس وجہ سے مسٹر ویلینڈ پر شبہہ کیا ہے کہ بچہ کی حیات و موت سے اس کی غرض متعلق ہے عجیب اتفاق ہوگا اگر دونوں تحقیقات ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ "پیاسی بلی" کا مالک کوئی اور ہی شخص نکلے گا۔

ایک اور قابلِ توجہ بات جو میں نے اس مکان میں دریافت کی یہ تھی کہ ساکنانِ مکان اگر کثیف عادت کے نہیں تو بدسلیقہ ضرور تھے۔ کھانے پینے اور خصوصًا پینے کی علامتیں اور شہادتیں نظر آرہی تھیں لیکن سب سے بے پروائی اور بدسلیقگی ظاہر تھی اس لئے میں نے قیاس کیا یہ لوگ اعلیٰ طبقہ کے نہیں ہوسکتے۔ لیکن اس خیال کی فوراً تردید ہوگئی جب یہ بات یاد آئی کہ رالف نے ایک ادنیٰ درجہ کی رقاصہ و مغنیہ سے شادی کی ہے ممکن ہے کثیف فرش اور ناصاف بستر کی ذمہ دار یہی عورت ہو جس کی ضد پر لارڈ نے بڑھاپے میں شادی کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔

میں پولیس اسٹیشن واپس آیا۔ اور تھوڑی دیر بعد ریڈرفورڈ شون کے نظریہ کو باطل ثابت کرنے کی اُمیدیں یک لخت ٹوٹ گئیں۔ جو کانسٹبل نرس میلون کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا اس کا تار موصول ہوا کہ

"عورت لائم ٹری ولا۔ ایکشیا گروو واقع نیو مالڈن میں داخل ہوئی دو منٹ ٹھہری اور اب واپس لندن جارہی ہے"

نیو مالڈن وہی محلہ تھا جہاں شون نے رالف کا مکان بتایا تھا۔ اور جس کی وہ خود نگرانی کر رہا تھا۔ اس تار کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ شون نے صحیح قیاس کیا اور نرس میلون اپنے شریکوں کو خبر دینے گئی ہے۔ چند منٹ میں میں واٹرلو اسٹیشن پر تھا اور آدھ گھنٹہ بعد اکیشیا گروو واقع نیو مالڈن میں داخل ہو رہا تھا۔

"لائم ٹری ولا" والا مکان اپنے نام کی تختی سے اپنے وجود کا اعلان کر رہا تھا۔ اور سڑک سے فاصلے پر میوہ دار درختوں کے درمیان میں واقع تھا۔ میں اس طرف سے جا رہا تھا کہ سامنے پھاٹک سے نکلتے ہوئے دو مزدور نظر آئے جو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ قریب آئے تو میں نے پہچان لیا کہ ان میں سے ایک شون ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ میں نے پہچان لیا تو اشارے سے مجھے بلایا۔

"انسپکٹر ہمینڈ آخر تم نے میرے نظریہ پر عمل کیا" اس نے غرور آمیز لہجہ میں کہا۔ "خیر اب میں نظریہ پر واقعات کا اضافہ کر سکتا ہوں۔ لڑکا رالف ویلینڈ کے قبضہ میں موجود ہے۔ ہم راستہ بھولے ہوئے مزدوروں کے حلیہ میں وہاں پہنچے اور ویلینڈ اور اس کی بیوی کی گفتگو سنی"۔

"آپ نے سارا مزہ کرکرا کر دیا"۔ شون کا ساتھی بولا۔ بعد کو ثابت ہوا کہ یہ شخص سراغرساں کے قصیدہ خوانوں میں ہے اور اس کے واقعات سراغرسانی مرتب کیا کرتا ہے۔

"لڑکا مکان کے اندر موجود ہے؟" میں نے پوچھا۔ اور دل ہی دل میں اس انقلاب واقعات سے بہت رنجیدہ ہوا۔ مجھے امید تھی کہ میرا بلی والا سراغ لارڈ کے محروم وارث تک نہ پہنچے گا۔ اب رٹید فورڈ بکتا پھرے گا کہ جو بات پولیس نے سخت محنت اور باقاعدہ تفتیش کے ذریعہ سے دریافت کی وہ میں نے محض رسائی ذہن کی بدولت معلوم کر لی تھی۔

"ہاں میں نے اس کی گفتگو سے یہ اخذ کیا کہ لڑکا بالائی منزل میں بند ہے" شون نے جواب دیا۔ "لیکن اس کام میں کوئی اور شخص بھی شریک ہے جو اسی نواح میں کسی مکان میں رہتا ہے۔ ویلینڈ اور اس کی بیوی آج رات کو دس بجے اس کے پاس جائیں گے۔ یہ کوئی باقاعدہ سازش معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم سب مجرموں کو

کو گرفتار کرنا چاہو تو رات تک گرفتاری ملتوی رکھو"

"کیوں ؟" میں نے بیساختہ کہا" تم اپنے لارڈ کی مرضی کے خلاف مسٹر ویلینڈ کی گرفتاری کے بہت مشتاق معلوم ہوتے ہو؟"

"ہاں۔ اس سے بوڑھے ٹریسیلین کو عقل آجائے گی کہ بیوی کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ اس معاملے میں تمہاری مداخلت بیوی کی آزادی کا نتیجہ ہے اور بڈھے کو اس آزادی کا ممنون ہونا چاہیے۔ مجھے بھی اس اعلان سے مسرت ہوگی کہ میں نے پولیس کی رہبری و قیادت کی" شون نے طنزیہ لہجہ میں جواب دیا۔

اب کوئی چارہ کار نہ تھا بجز اس کے کہ شون کی اطلاع کے مطابق گرفتاری عمل میں لائی جائے اور بچہ کو چھین کر اس کے ماں باپ کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن عدالت میں ثبوت پیش کرنے کے واسطے میرے لئے لازم تھا کہ اپنے طور پر بھی تحقیقات کروں۔ اس لئے میں نے شون کی تجویز کو منظور کر لیا اور مسٹر الف ویلینڈ کے مجرمانہ ارادوں کا انسداد رات تک کے لئے ملتوی کر دیا۔

شون سے جدا ہونے سے قبل میں نے اس سے دریافت کیا کہ اس دوسرے آدمی کا کیا نام ہے جس سے ویلینڈ اور اس کی بیوی رات کو ملیں گے۔

"اس کا نام معلوم نہ ہو سکا" شون نے جواب دیا" لیکن وہ ان کا ہی کوئی شریک معلوم ہوتا ہے جس سے یہ دونوں کچھ روپیہ پیشگی وصول کرنا چاہتے ہیں تاکہ بچہ کو لے کر باہر چلے جائیں"

جب میں دو کانسٹبلوں کو لے کر رات کے دس بجے لائم ٹری ولا کے قریب پہنچا تو ایک لمبا دبلا پتلا اور ایک موٹا بھدا آدمی درختوں کی تاریکی میں سے نکلتے نظر آئے۔ اس قدر تاریکی تھی کہ جب قریب آگئے تو میں نے پہچانا کہ ایک شون اور دوسرا اس کا سکریٹری ہے۔

"میں اپنی فتح کا نظارہ دیکھنے آیا ہوں" ماہر سراغرساں نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے پہلے ہی یقین تھا

کہ لڑکا، الف ویلینڈ کے قبضہ میں ہے اس لئے بالکل بجا ہے کہ میں اپنے نظریہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیکھوں خصوصاً جبکہ تم میری راستے سے متفق نہ تھے۔"

مجھے اس موقع پر شون کی ملاقات کی اُمید نہ تھی لیکن عمر بھر کسی شخص سے مل کر اتنی مسرت نہ ہوئی ہوگی جتنی اس وقت شون کے ملنے سے ہوئی۔ میں نے شون کے اس نامناسب و ناگوار فقرے کی پروا نہ کی۔ اور ایک کانسٹیبل کو حکم دیا کہ جس وقت مکان والے باہر آئیں فوراً اندر جائے اور لڑکے کو لے آئے اور دوسرا کانسٹیبل میرے ساتھ مجرموں کے تعاقب میں چلے جن کو ان کے شریک جرم کے ساتھ گرفتار کرنا ہے۔

تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک مرد اور ایک عورت پھاٹک سے نکلے۔ ہم سب ان کی نظروں سے بچے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ دونوں کچھ دور چلنے کے بعد ایک چوڑی سڑک پر آ گئے۔ اور پھر سڑک سے اتر کر ایک چھوٹے سے مکان کی طرف چلے جو درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ سامنے کا دروازہ سڑک کے رُخ پر تھا۔ مکان کے پہلو میں دو نیچی کھڑکیاں تھیں۔ کھڑکیوں کے کواڑ کھلے ہوئے تھے اور اندر سے روشنی نکل کر قریب کے درختوں پر پڑ رہی تھی۔

"ان کو اندر جانے دو۔ ہم کھڑکیوں میں سے دیکھیں گے" میں نے آہستہ سے کہا۔ اور ان دونوں کے اندر جانے کے بعد ہم سب کھڑکیوں کے قریب کی جھاڑیوں میں چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک خادمہ نے ان دونوں کو کمرے کے اندر داخل کیا۔ ایک خوبصورت پچاس سالہ مرد اور اس سے دس سال چھوٹی عورت کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور نئے ملاقاتیوں کو حیرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ دونوں فریق اگر سازش میں شریک ہیں تو تعجب ہے کہ باہم آشنا نہیں معلوم ہوتے" میں نے شون کے کان میں کہا جس سے وہ کھسیانا سا ہو گیا۔

"گڈ ایوننگ سر" نو وارد مرد نے کہا جو صورت سے عیاش طبع و بدرو یہ معلوم ہوتا تھا۔ "خوش قسمتی سے ایک ایسی چیز میرے اور میری بیوی کے ہاتھ آ گئی ہے کہ آپ اس سے بڑا نفع اُٹھا سکتے ہیں اگر ہماری محنت

کا معاوضہ دیدیں۔ بس دو ہزار پونڈ اس کو باہر لے جانے کے لئے کافی ہوں گے۔"

نو وارد عورت نے تائید کی "ہم آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دیں گے۔ اور اس کی کبھی خبر بھی نہ ملے گی بات یہ ہے کہ یہ بدبخت ملک اب ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہا اور ہم فوراً امریکہ کو روانہ ہونا چاہتے ہیں۔"

"میں واقعی تم عجیب و غریب ہستیوں کا منشا مطلق نہیں سمجھا۔" صاحب خانہ نے کہا اور گھنٹی پہ ہاتھ رکھا۔

"اتنی جلدی نہ کیجئے۔" نو وارد مرد بولا۔ "بوڑھے ٹریسی لین کا لڑکا ہمارے پاس موجود ہے۔ اور ہم نے اس کے حاصل کرنے میں بڑی تکلیف اٹھائی ہے۔ اس پہ ایک نرس کو مسلط کیا۔ مکان کرایہ پہ لیا۔ یہ سب کچھ آپ ہی کے فائدے کے لئے تھا کہ لڑکا غائب ہو جائے اور آپ وارث بن جائیں۔ آپ کے قریب ایک ہی محلہ میں رہنے سے معلوم ہوا کہ آپ ضرورتمند ہیں۔ ہم آپ کے کچھ کام آئیں اس لئے ہم نے آپ کے لئے یہ تدبیر پیدا کی ہے۔"

صاحب خانہ آہستہ سے اپنی کرسی سے اٹھا اور جست کر کے اس شخص کا کالر پکڑ لیا۔ "او کمینے بدمعاش!" اس نے کہا۔ "یہ بھید ہے میرے چھوٹے بھائی کے گم ہونے کا! تو نے سمجھا تھا کہ میں تیری ذلیل چال میں آ جاؤں گا بیٹا! تم نے غلط سمجھا۔ دیکھو اب پولیس کو بلاتا ہوں۔"

میں کھڑکی میں سے کود کر اندر پہنچا اور کہا "مسٹر ویلینڈ میں حاضر ہوں۔ آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو جم اس عورت کو حراست میں لے لو۔" میں نے عورت کی طرف اشارہ کر کے اپنے کانسٹبل سے کہا۔

"مگر ـــ گر ـــ گر۔" شون نے جو ہمارے پیچھے پیچھے اندر آ گیا تھا۔ رک رک کر کہا۔ "یہ تو ویلینڈ ہے۔" اور اس بدمعاش کی طرف اشارہ کیا جس کو صاحب خانہ کے ہاتھ سے میں نے اپنی حراست میں لے لیا تھا۔

"نہیں مسٹر ریڈفورڈ شون۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ صاحب جنھوں نے اس شخص کو میری حراست میں دیا ہے مسٹر الف ویلینڈ ہیں۔ دس برس ہوتے مجھے ان کی ماتحتی میں کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے

اِس لئے میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کو دھوکا ہوا۔ مجھے لڑکے کی تلاش میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ خود میرا سراغ بھی مجھے وہیں پہنچا تا۔"

"ہمینڈ تم سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ میں تم کو بھولا نہیں ہوں۔" مسٹر ویلینڈ نے مجھ سے مصافحہ کرتے میں کہا۔ "لیکن میں عجب حیرت میں ہوں۔ اس کے معنی کیا ہیں؟"

"اِس کے معنی یہ ہیں کہ مسٹر ریڈ فورڈ شون نے اس قدر کثرت سے نتائج اخذ کر لئے کہ سب کے سب غلط ہو گئے۔" میں نے جواب دیا۔ "جب لارڈ ٹریسی لین نے ان کو اپنے صاحبزادے کی تلاش سپرد کی تو انھوں نے اس معاملہ سے آپ کے تعلق کی وجہ سے آپ پر نظر جمائی۔ یہ پہلی غلطی تھی۔ پھر لارڈ صاحب نے ان کو بتایا کہ آپ اکیشیا وِلا لائم گروو میں رہتے ہیں۔ یہ جستجو کرتے ہوئے اس نواح میں آئے تو پہلے مکان کے دروازے پر "لائم ٹری ولا۔ اکیشیا گروو" لکھا ہوا ملا۔ انھوں نے الفاظ کے تغیر پر خیال نہ کیا اور اسی کو آپ کا مکان سمجھ لیا۔ یہ دوسری غلطی ہوئی میں خود نہایت متحیر ہوا تھا۔ آخر آج سہ پہر کو تحقیق کرنے سے آپ کے مکان کا نام "اکیشیا ولا" معلوم ہوا۔ اور اس مصنوعی کپتان ماسٹر مین کو میں نے پہچانا کہ یہ ایک مشہور عیار ہے۔ جس کی تلاش میں ہم مدت سے ہیں۔"

"واللہ!" مسٹر ویلینڈ نے کہا: "یہ تشابہ ناموں کے محلہ اور مکان میں رہنے کا نتیجہ ہے۔ لیڈیا! مسٹر ریڈ فورڈ شون کچھ علیل معلوم ہوتے ہیں شراب کا گلاس پیش کرو۔"

(مطبوعہ عالمگیر لاہور سالنامہ ۱۹۲۹ء)

ایک سیب کی قیمت

شاہجہاں کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاں کے متعلق ایک تاریخی وقعہ

(۱)
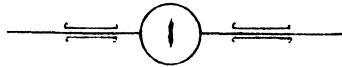
(ضلع جھنگ (پنجاب) کا ایک گاؤں۔ کسان کی جھونپڑی۔ کسان کی بیوی مضمحل بیٹھی ہے۔ کسان باہر سے آتا ہے)

کسان۔ آج جی کیسا ہے؟ سست کیوں ہے؟

بیوی۔ جی اچھا نہیں۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔

کسان۔ کچھ ٹکر شکر نہیں کھایا؟

بیوی۔ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔

کسان۔ کچھ تو کھالے۔ کیا کھائے گی؟

بیوی۔ سیب کھانے کو جی چاہتا ہے۔

کسان۔ اری کیسی باتیں کرتی ہے۔ ہم نے تو سیب دیکھا بھی نہیں۔

بیوی۔ کچھ ہو۔ کہیں سے سیب لا دے جان نکلی جاتی ہے۔

کسان۔ اچھا ہراساں نہ ہو تیرے لئے سیب ڈھونڈھتا ہوں۔

(کسان باہر چلا جاتا ہے اور گاؤں کے نمبردار کے پاس جا کر اس سے بیوی کا حال اور فرمائش

بیان کرتا ہے۔نمبردار کے پاس کچھ اور آدمی بھی بیٹھے ہیں۔)

نمبردار۔ گاؤں میں سیب کہاں ملے گا شہر میں مل سکتا ہے۔تو خود شہر چلا جا۔سیب لیکر شام تک آجانا۔یا تو کہے تو کسی آدمی کو شہر بھیجدوں؟

ایک شخص۔ نمبردار جی گاؤں سے باہر میدان میں ایک بڑا سوداگر ٹھہرا ہوا ہے شاید اس کے پاس سیب مل جائے۔

(کسان سے) اچھا تو پہلے سوداگر کے پاس ہو آ۔دیکھ تو سیب ملتا ہے یا نہیں؟

(کسان جاتا ہے)

(سوداگر اپنے خیمہ میں بیٹھا ہے۔کسان داخل ہوتا ہے)

کسان۔ سوداگر جی۔ایک سیب تمھارے پاس ہو تو دیدو۔

سوداگر۔ سیب کا کیا کرے گا؟

کسان۔ بیوی مانگتی ہے اور دو چار دن میں بچہ ہونے والا ہے۔کہتی ہے سیب کھاؤں گی اور کچھ نہیں کھاتی۔

سوداگر۔ تیری بیوی سیب کھانا چاہتی ہے۔جھونپڑی میں محلوں کے خواب دیکھتی ہے۔(یہ فقرہ زبان سے نکلتے ہی سوداگر سوچ میں پڑ جاتا ہے۔غریب کسان کی بیوی وضع حمل کے قریب سیب مانگتی ہے اس نے تو سیب خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔بزرگوں سے سُنا ہے کہ ایسے زمانہ میں عورت کی خواہش خاص معنی رکھتی ہے اور یہ اُس بچہ کی حالت کے مطابق ہوتی ہے ضرور اس کا بچہ بڑا آدمی بنے گا۔ممکن ہے سلطنت میں کسی اونچے درجہ پر پہنچ جائے۔)

سوداگر۔ اچھا ایک شرط پر سیب مل سکتا ہے۔ تو ایک کاغذ پر دستخط کر دے۔

کسان۔ جو چاہو لکھوالو مگر ایک سیب جلدی سے دیدو بڑی مہربانی ہوگی۔

(سوداگر جلدی سے قلم دوات کاغذ نکالتا ہے اور کسان سے نام و نشان دریافت کرکے یہ مضمون لکھتا ہے کہ "من مقر ـــــــ ولد ـــــــ ساکن ـــــــ کا لڑکا جب بڑا ہوکر بادشاہی دربار میں معزز عہدے پر پہونچے اور با اختیار ہو تو فلاں ابن فلاں سوداگر کو تجارتی محصول معاف کر دے اور تمام سلطنت میں آزادانہ تجارت کا مجاز بنا دے")

سوداگر۔ (سیب منگاتا ہے اور کسان سے کہتا ہے) لو اس کاغذ پر اپنا نام لکھ دو یا انگوٹھے کا نشان لگادو اور جتنے سیب چاہو لے جاؤ۔

(کسان نہ کاغذ کو پڑھتا ہے نہ مضمون پوچھتا ہے۔ جلدی سے دستخط کرکے ایک سیب لیکر روانہ ہوجاتا ہے)

۳

(اسی گاؤں کی مسجد میں ایک شاہ صاحب بیٹھے ہیں۔ چند مُرید بھی حاضرِ خدمت ہیں شاہ صاحب کے نورانی چہرے پر کچھ فکر و تردد کے آثار ہیں۔ دو زانو سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ایک شخص باہر سے آتا ہے اور شاہ صاحب سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مرید اس کو اشارے سے روکتے ہیں کہ اس وقت عرض کرنے کا موقع نہیں ہے۔ وہ شخص مودب بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں شاہ صاحب مراقبہ سے سر اُٹھاتے ہیں چہرہ پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہیں مسرور و مطمئن معلوم ہوتے ہیں۔ نووارد آگے بڑھ کر عرض کرتا ہے)

نووارد۔ شاہ صاحب نمبردار نے بھیجا ہے۔ سلام کہا ہے اور یہ دریافت کیا ہے کہ اجازت ہو تو میں خدمت میں حاضر ہوں۔ کچھ عرض کرنا ہے۔

شاہ صاحب۔ نمبردار سے میرا سلام کہو۔ اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے تھوڑی دیر کے لئے

باہر جانا ہے اس کے بعد آسکتے ہیں (وہ شخص چلا جاتا ہے)

ایک مرید۔ حضور اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں۔

شاہ صاحب۔ کیا؟

مرید۔ حضور ابھی رنجیدہ کیوں تھے اور پھر خوش کیوں ہو گئے؟

شاہ صاحب۔ اس وقت اللہ کی ایک نیک بندی کے بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ اس سبب سے فکر تھی۔ الحمد للہ کہ خیریت سے لڑکا ہو گیا۔

(یہ فقرہ ختم ہی ہوتا ہے کہ وہی سیب والا کسان گھبرایا ہوا مسجد میں داخل ہوتا ہے)

کسان۔ شاہ صاحب ابھی میرے گھر میں لڑکا ہوا ہے اُس کے کان میں اذان دید یجئے۔ یا میں اس کو یہاں لے آؤں۔

شاہ صاحب۔ نہیں ہم چلتے ہیں۔

(شاہ صاحب کسان کے گھر جا کر بچے کے داہنے کان میں اذان بائیں میں اقامت پڑھتے ہیں۔ پھر اُس پر دم کرتے ہیں)

کسان۔ شاہ صاحب اس کا نام رکھ دیجئے۔

شاہ صاحب۔ نام آج نہیں رکھا جاتا۔ ساتویں دن عقیقہ کرنا۔ یہ بچہ بڑا نیک بخت ہے مُبارک گھڑی میں ہوا ہے۔ اس کا نام سعد اللہ رکھنا۔

سعد اللہ بچپن ہی میں باپ کے کھیتوں پر اور مویشی چرانے کے لئے جنگل کو جانے لگتا ہے اور جب بڑا ہوتا ہے تو اکیلا مویشیوں کو لے جاتا ہے اور کسانوں کے لڑکے بھی جنگل میں ہوتے ہیں۔ سعد اللہ مویشی کو

چرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور آپ چادر بچھا کر بیٹھ جاتا ہے۔ لڑکے آپس میں جو لڑتے جھگڑتے ہیں ان کا فیصلہ کرتا ہے اور ایسا انصاف کرتا ہے کہ دونوں فریق راضی ہو جاتے ہیں۔ اس وقت کسی بزرگ کے مزار کے قریب سعداللہ مویشی چراتے چراتے سو گیا ہے۔ خواب دیکھتا ہے کہ کوئی بزرگ سرہانے کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دہلی جا اور کسی مدرسے میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کر آنکھ کھلتی ہے تو ماں کو پاس کھڑا ہوا دیکھتا ہے۔ آنکھیں مل کر حیرت سے ماں کو دیکھتا ہے۔

سعداللہ۔ ماں تو یہاں کب سے کھڑی ہے۔ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔

ماں۔ (پیار کرکے) بیٹا کیا خواب دیکھا ہے؟

سعداللہ۔ میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ سبز کپڑے پہنے میرے پاس کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو دہلی جا اور کسی مدرسے میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کر اماں میں ضرور جاؤں گا۔ بھیجدے گی؟

ماں۔ بیٹا خواب کا کیا بھروسہ جانے کیا کیا نظر آیا کرتا ہے۔

سعداللہ۔ نہیں ماں۔ میں اتنی دیر میں تین بار سویا تین بار جاگا ہر دفعہ وہی خواب نظر آیا۔

ماں۔ اچھا بیٹا پہلے گھر تو چل۔ پھر دیکھا جائے گا۔

(دہلی کے شاہی قلعے میں شاہجہاں بادشاہ کا دربار سجا ہوا ہے۔ بادشاہ سلامت تختِ طاؤس پر جلوہ افروز ہیں۔ وزراء، امراء، اعیانِ سلطنت و ارکان دولت حاضر ہیں۔ وزیر آگے بڑھ کر آداب بجا لاتا ہے)

وزیر۔ جہاں پناہ۔ دولتِ ایران کا سفیر حاضر ہوا ہے، حکم ہو تو پیش کیا جائے؟

شاہجہاں بادشاہ۔ کوئی خط لایا ہے؟

(وزیر مرصع تھالی میں خریطہ شاہی پیش کرتا ہے۔ بادشاہ سلامت خط کو ہاتھ میں لے کر وزیر کو

دیتے ہیں کہ اسے پڑھو۔ وزیر پڑھ کر سناتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ ایران اعتراض کرتا ہے کہ "آپ صرف شاہ ہند ہیں پھر شاہجہاں کا لقب اختیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے" بادشاہ اس مضمون کو سُن کر ذرا متفکر سے ہوجاتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ کچھ جواب سمجھ میں نہیں آتا۔ اہلِ دربار سے مخاطب ہوتے ہیں۔)

شاہجہاں بادشاہ۔ آپ نے شاہ ایران کا خط سُنا۔ آپ میں علماء و فضلاء و شعراء موجود ہیں اس کی کوئی عمدہ توجیہ اور موزوں سبب بیان کریں۔ (اہلِ دربار دم بخود رہ جاتے ہیں کسی سے کوئی جواب نہیں بنتا)

شاہجہاں بادشاہ۔ (وزیر سے خطاب کرتے ہیں) اچھا اس سوال کا ملک میں اعلان کرا دو اور یہ بھی کہ جو شخص اس کا معقول جواب دے گا اس کو دربار میں ممتاز عہدہ پر فائز کیا جائے گا۔

وزیر۔ بسر و چشم (یہ کہہ کر باہر چلا جاتا ہے)

(۶)

(دہلی کے ایک مدرسے میں درس ہو رہا ہے۔ اُستاد اور طلبہ تعلیم و تعلّم میں مشغول ہیں۔ طالب علموں میں سعد اللہ بھی موجود ہے۔ اس کو یہاں آئے کئی سال ہو گئے ہیں۔ اب وہ جوان ہے۔ بہت کچھ پڑھ لکھ لیا ہے۔ یکایک معلم صاحب کو کچھ خیال آتا ہے اور طلبہ سے مخاطب ہوتے ہیں۔)

مدرّس۔ لڑکو تم نے کل شاہی اعلان سُنا تھا؟ بادشاہ سلامت کا حکم ہے کہ جو شخص شاہ ہند کو شاہ جہاں کہنے کی معقول وجہ بتائے گا اُس کو دربار شاہی میں اعلیٰ عہدہ دیا جائے گا۔ تم سب اس کا جواب سوچو اور کاغذ پر الگ الگ لکھ کر مجھ کو دو۔ دربار میں پیش کر دوں گا۔ دیکھیں کس کی عقل لڑتی ہے اور کس کی تقدیر یاوری کرتی ہے۔

(اکثر طالب علم سوچ کر اپنا اپنا جواب لکھتے ہیں۔ سعد اللہ بھی کچھ لکھتا ہے۔ سب پرچے معلم صاحب کو

دیدیئے جاتے ہیں وہ سب کے جواب پڑھتے ہیں اکثر نے طویل جواب فصیح وبلیغ عبارتوں میں لکھے ہیں۔سعداللہ کا جواب نہایت مختصر ہے۔صرف چند الفاظ میں پورا جواب ختم ہے۔ مولوی صاحب کو یہ جواب سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ایسا کہ خود ان کی عقل بھی اس نکتہ تک پہونچنے سے قاصر رہتی ہے۔لیکن حسد کے مارے سعداللہ کے جواب کو سب جوابوں کے نیچے رکھ لیتے ہیں۔)

مدرس۔ اچھا اب مدرسہ کی چھٹی ہے۔ ہم دربار میں جاتے ہیں۔ (لڑکے رخصت ہو جاتے ہیں)

(۷)

پھر دربار شاہی آراستہ ہے۔حضرت شاہجہاں مخاطب ہوتے ہیں۔

بادشاہ۔حاضرین دربار نے کل کے مسئلہ پر غور کر لیا ہوگا۔شاہجہاں لقب کی کیا وجہ بتائی جا سکتی ہے؟

(اہلِ دربار پر عالم حیرت وسکوت طاری ہو جاتا ہے)

وزیر۔جہاں پناہ۔ مدرسہ شاہجہانی کے معلم صاحب حاضر ہوئے ہیں اپنے مدرسہ کے طالبعلموں سے جوابات لکھوا کر لائے ہیں۔پیش خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو حاضر کیا جائے یا جواب ان سے لیکر نذر حضور کئے جائیں۔

بادشاہ۔مدرس صاحب کو بلاؤ۔

(اُستاد مدرسہ زمین بوس ہو کر آداب بجا لاتے ہیں اور کاغذ کے پرچے پیش کرتے ہیں معلم کے ہاتھ سے پرچے لیتے وقت بادشاہ کے ہاتھ سے سب سے نیچے کا پرچہ گر پڑتا ہے جس پر سعداللہ کا جواب لکھا ہوا ہے بادشاہ اس کو گرتا دیکھ کر اٹھا لیتے ہیں اور سب سے پہلے اسی کو پڑھتے ہیں۔ اس پر لکھا ہوا ہے:-

"ہند اور جہاں دونوں کے عدد برابر یعنی (۵۹) ہیں لہذا شاہ ہند کو شاہ جہاں کہنا درست ہے"

بادشاہ سلامت کو یہ جواب ایسا پسند آتا ہے کہ اور کسی جواب کے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اہل دربار کو سناتے ہیں اور وزیر کو حکم دیتے ہیں کہ شاہ ایران کو یہی جواب دیا جائے اور یہ جواب تجویز کرنے والے طالب علم کو دربار میں پیش کیا جائے۔

(دربار برخاست ہو جاتا ہے)

غریب کسان کا لڑکا سعد اللہ دربار شاہی میں معزز عہدہ پاتا ہے اپنے فرائض اس قدر خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے کہ ترقی کرتے کرتے نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم بن جاتا ہے۔ وزیر صاحب اپنے محل میں تشریف رکھتے ہیں۔ دربار وزیری گرم ہے اتنے میں خدام ایک بوڑھے آدمی کو پیش کرتے ہیں۔

نواب سعد اللہ خاں۔ بڑے میاں کیا چاہتے ہو؟

(بوڑھا شخص ایک میلا بوسیدہ سا کاغذ وزیر کے ہاتھ میں دیدیتا ہے۔ وزیر اس کو احتیاط سے کھول کر پڑھتے ہیں۔ پڑھتے ہی وزیر کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے۔ مسکرا کر بوڑھے کی طرف مخاطب ہوتے ہیں

نواب سعد اللہ خاں۔ میں نے اپنی ماں سے بچپن میں سنا تھا کہ اس نے میری ولادت کے قریب سیب مانگا تھا اور میرے باپ نے کسی تاجر سے سیب لا کر دیا تھا۔

بوڑھا آدمی۔ (وزیر کی ذہانت پر صد آفریں کر کے) جی حضور۔ میں وہی تاجر ہوں۔ مگر حضور نے اس وقت کمال ذکاوت کا ثبوت دیا۔ اس رقعہ میں سیب کا ذکر نہیں ہے۔

نواب سعد اللہ خاں۔ مجھے تمہاری دانشمندی اور دور اندیشی پر حیرت ہے کہ تم نے میری ولادت سے قبل میری آئندہ زندگی کے متعلق قیاس قائم کیا اور وہ بالکل درست نکلا۔ اگرچہ ایک سیب کی یہ قیمت بہت گراں ہے لیکن تمہاری فہم و فراست پر یہ زبان سے نکلتا ہے ع

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

باپ کے وعدہ کا پورا کرنا مجھ پر فرض ہے۔ اس ترقی عز و جاہ میں تمہاری دعائیں بھی معاون رہی ہونگی ان کا شکر یہ بھی واجب ہے۔ اس لئے میں نہایت خوشی سے تمام قلمرو شاہجہانی میں تم کو بغیر محصول درآمد و برآمد کے تجارت کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔

(تمام عمال صوبہ جات کے نام ضروری احکام لکھوا دیتے ہیں)

(مطبوعہ عالمگیر سالانہ نمبر ۱۹۳۷ء)

بُوا فِرعونی

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون اور اُس کے لشکر کو ڈبو دیا۔ کاش "فرعونیت" کو بھی ڈبو دیتے۔ لیکن فرعون کے ڈبوتے وقت فرعونیت اس کے سر سے نکل بھاگی اور ساری دنیا میں پھیل گئی۔ قاعدہ تو چاہتا ہے حصہ بقدرِ جثہ۔ لیکن بعض حصے بُجثے پر نہیں ظرف پر ملتے ہیں جیسا کہ غالب نے کہا ہے ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

بوا فرعونی تھیں تو بہت چھوٹے قد و قامت کی لیکن آدھی فرعونیت اُن اکیلی کے حصہ میں آگئی تھی۔ باقی آدھی، ساری خدائی میں بٹ گئی ہو گی۔ مثل مشہور ہے کُلُّ قَصِیرٍ فِتْنَۃٌ (یعنی سب پستہ قد فتنہ ہوتے ہیں) اس مثل کے بنانے والے نے حضرت آدم علیہ السلام سے قیامت تک کے سب انسانوں کو تو دیکھا نہ تھا۔ دس بیس سو پچاس کو دیکھ کر عام حکم لگا دیا ہے۔ لیکن ایسی پکی بات کہی ہے کہ مثل سے کہیں اس کے خلاف نکلے تو نکلے۔ آپ بھی جب اور قصیر القامت آدمیوں کے فتنے دیکھتے دیکھتے بوا فرعونی پر پہونچیں گے تو معلوم ہو گا کہ اب آگے تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک صاحب کہتے تھے یہ مثل یوں بھی ہے۔ قَصِیرٌ کُلُّہٗ فِتْنَۃٌ (یعنی پست قد آدمی سب کا سب فتنہ ہوتا ہے) یہ خلعت تو بوا فرعونی پر ایسا سجتا تھا کہ دیکھا ہی کیجئے۔ حقیقت میں بوا فرعونی کی چال ڈھال طور طریق۔ بات برتاؤ۔ ہر چیز فتنہ ہی فتنہ تھی۔ بوا فرعونی خوش مزاج بھی تھیں، جب ان کی کوئی سہیلی یہ کہاوت چسپت کرتی تھی تو جواب میں یہ ذوق کا مصرعہ پڑھ دیا کرتی تھیں۔

"پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو"

بوا فرعونی کا نام تو کچھ اور ہی تھا۔ لیکن اسی نام سے عام طور پر مشہور ہو گئی تھیں۔ شروع شروع میں تو کسی مسخرے یا دل جلے نے "بُوا فرعونی" کہہ دیا ہوگا۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ صرف عادت مزاج ہی میں فرعونی نہ تھیں بلکہ ان کا سلسلہ نسب بھی مصر کے کسی فرعون سے ملتا ہے۔ اور یہ بات بھی خود بوا فرعونی ہی نے لوگوں کو بتائی۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ کا فرعون تو ڈوب گیا تھا اور اس کے کوئی اولاد بھی نہ تھی۔ لیکن اس کی نسل اور اس کی حکومت اس کے کنبے سے چلی اور چلتی رہی۔ پھر جب ملک اور حکومت ہاتھ سے نکل گئی تو نسل پھر بھی باقی رہی اور آخر وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔ انھیں کی اولاد میں بُوا فرعونی بھی تھیں۔ اور کبھی فرعونیت کے جوش میں اِس پر فخر بھی کیا کرتی تھیں کہ ہم وہ ہیں جنھوں نے خدا کے سامنے بھی سر نہیں جھکایا۔

بوا فرعونی اونچے گھرانے اور بڑے کنبے والی تھیں۔ شاہی وقتوں میں ان کا شہر صوبہ کہلاتا تھا، اِن کے بزرگوں میں کوئی صوبہ دار تھا، کوئی قاضی، کوئی مفتی۔ ان کے باپ نے لاکھوں کی جائداد چھوڑی تھی جس کی اکیلی بوا فرعونی مالک تھیں۔ پڑھی لکھی بھی تھیں، ظریف مزاج بھی اور فرعونی بھی۔ ان تینوں صفتوں کے اثر سے ایک دن اپنی دولت و جائداد کے ذکر پر کہنے لگیں۔ "مجھے یوں کہا کرو۔" وحدہا لاشریک لہا[۵]"۔ بوا فرعونی کا روپیہ ان کے نام سے الگ بنک میں جمع ہوتا تھا۔ خود بنک سے لین دین کرتی تھیں۔

بوا فرعونی کی شادی ان کے کنبے ہی میں ہوئی تھی۔ میاں پردیس میں نوکر تھے۔ یہ بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ اللہ نے اولاد حسبِ مراد دی تھی۔ کئی بیٹے بیٹیاں تھیں، اور سب اپنے اپنے گھر خوش۔ بوا فرعونی کے گھر کا خرچ ان کے میاں کی تنخواہ سے چلتا تھا، اور ماشاء اللہ خوب چلتا تھا۔ وہ اپنا پیسہ مشکل سے گھر میں خرچ ہونے دیتی تھیں۔ ضرورت بھی نہ تھی اور وہ احتیاط بھی کرتی تھیں۔ ان کا قول تھا کہ گھر چلتا ہے گھر والے کے نام سے۔ گھر والے کے دام سے، گھر والے کے کام سے۔ اس پر بھی بوا فرعونی کی ساری دولت ان کے گھر اور ان کی آل اولاد ہی پر صرف ہوتی تھی لیکن ایک عجیب طریقے سے۔ وہ خود کہا کرتی تھیں کہ ظاہر میں تو گھر میاں

---

[۵] بوا فرعونی نے اپنے لئے ضمیر مونث ھا لگائی ہے۔

کے روپے سے بنا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن اصل میں گھر کی خیریت اور سلامتی کے لئے میری دولت کام آتی ہے' کبھی ہوش میں ہوتیں تو کہتیں: "تن میاں کے مال سے۔ جان بندی کی چال سے"۔ کبھی فرماتیں: "میاں تدبیر سے لڑتے ہیں۔ بندی تقدیر سے لڑتی ہے"۔ یعنی بوا فرعونی اگرچہ دل کی قوی اور ہمت کی مضبوط تھیں، دماغ روشن اور ذہن رسا تھا، معاملہ فہم اور صائب رائے تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ عجیب بات یہ تھی کہ اعتقاد کی بہت کچی اور بڑی بودی تھیں۔ تعویذ۔ گنڈے۔ ٹونے ٹوٹکے، جادو منتر۔ عمل عملیات پر نہایت پختہ اعتقاد اور پکا ایمان تھا، اس لئے سینکڑوں ہزاروں روپے ان ہی کاموں میں صرف ہوتے تھے۔ پھر اس کام کے لئے سادھو سنیاسی، پیر، فقیر۔ سالک مجذوب۔ جھوٹے سچے، کسی کی قید نہ تھی، جہاں سُنا کہ شہر میں کوئی نیا کرتبی آیا ہے اور اُنھوں نے اپنی ماما کو اس کے پاس بھیجا۔ یا کسی منشی کا رندے کو روانہ کیا۔ لوگ کہتے تھے جھوٹ یا سچ کہ ایک ماما اور ایک ملازم نے اپنی اپنی حویلیاں بنالی تھیں۔ بوا فرعونی سے سینکڑوں روپے لے گئے اور خاک کی چٹکی لاکر دیدی۔ یا کاغذ کا ٹکڑا موڑ کر لا دیا۔ لیکن بوا فرعونی دور کے پیام و سلام پر ہی بس نہ کرتی تھیں خود بھی سادھوؤں، جوگیوں عاملوں کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں اور وہ جو عمل بتاتے تھے کرتی تھیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شہر کی کوئی ملنے والی بی بی بوا فرعونی کے گھر بے اطلاع آتیں اور معلوم ہوتا کہ وہ تو آج کوٹھری میں بند یا تہ خانے میں چھپی ہوئی کوئی وظیفہ پڑھ رہی ہیں یا عمل کر رہی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جَو کی تین ٹکیاں اور مٹی کے گھڑے اور لوٹے میں پانی لے کر جاڑے ہوتے تو کمرے میں، گرمیاں ہوئیں تو چھت پر چلی جاتیں۔ اور تین دن تک گھر والوں کو ان کی صورت نظر نہ آتی۔

یہ تو اللہ ہی جانے کہ وہ اِن تدبیروں سے خود بھی عامل ہوگئی تھیں یا نہیں۔ بہرحال ہم جیسے ظاہر بینوں کو بھی بعض لطیفے بہت دلچسپ نظر آتے ہیں۔ ایک دن بوا فرعونی کہیں سواری میں جاتی تھیں۔ خدا جانے شاہی مقبرہ و باغ کی سیر کا ارادہ تھا یا اس کے راستے میں جو سادھو رہتا تھا اس کے چرنوں کی سیوا مقصود تھی۔ بیٹی، سمدھن اور ماما ساتھ جانے والی تھیں۔ ان کے انتظار میں گھر کے صحن میں کھڑی تھیں تو آ کر

لپٹ گیا کہ میں بھی جاؤں گا۔ منع کیا۔ بہلایا۔ ٹالا نہ مانا۔ آخر جھڑک کر ہٹا دیا۔ بچہ غصے میں بھرا ہوا باہر دوڑ گیا۔ ہاتھ میں بڑی سی رسی لئے ہوئے تھا اس کو گاڑی کے گھوڑے پر پھینکنے لگا۔ کوچبان اور سائیس جتنا روکتے تھے وہ ان سے ہٹ ہٹ کر اور زور زور سے رسی گھوڑے کے مارتا تھا۔ اس حرکت سے شور ہو رہا تھا، اتنے میں یکایک بوا فرعونی مع ساتھی عورتوں کے دروازے میں آ گئیں ماما کے آواز دینے پر نوکر گاڑی گھوڑے کے پاس سے ہٹ گئے۔ بوا فرعونی نے لپک کر بچے کے ہاتھ سے رسی چھین لی اور گھما کر زور سے بچے کے رسید کی۔ اس کے بعد اوّل تو ارادہ کیا کہ رسی کو پھینک دیں۔ پھر یکایک کچھ سوچ کر لپیٹ کر ہاتھ میں لے لی اور سوار ہو گئیں۔ اتفاق کی بات شہر سے دور نکل کر دفعتہً گھوڑے کا بند ٹوٹ گیا کوچبان بڑا اسٹ پٹایا۔ لیکن بوا فرعونی نے براہ راست دو چار صلواتیں سنا کر رسی اس کی طرف پھینک دی کہ "لے میں یہ اسی کام کے لئے لائی تھی"۔ تینوں عورتیں اور کوچبان چاروں اس کرامت سے حیران رہ گئے۔

اب اس واقعہ کے متعلق بوا فرعونی کی عقلمندی دیکھئے کہ گھر واپس آنے کے بعد اس کرامت کا گھر میں چرچا ہونا ہی تھا۔ جس وقت اس کا ذکر ہونے لگا بوا فرعونی فخریہ انداز کے ساتھ وہاں سے اٹھ گئیں۔ یعنی ایسی ایسی کرامتیں ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں، ان کی سمدھن اپنے گھر اتر گئی تھیں۔ وہ پھر کسی وقت ملیں تو پوچھا "بوا سچ کہنا تم نے رسی کو کیا سمجھ کر ساتھ لیا تھا"، بوا فرعونی سمدھن سے کھلتی تھیں۔ جانتی تھیں کہ ان پر کرامت کا جادو نہ چلے گا۔ کہنے لگیں "ارے بوا لوگوں نے ناحق کرامت بنا لی ہے۔ وہ دنیاداری کی ایک بات تھی۔ بزرگوں کا مقولہ ہے سفر میں برتن اور بندھن ساتھ رکھو، لوٹا پیالہ کوئی چیز ساتھ ہو تو وقت پر دس کام نکلتے ہیں۔ ایسے ہی رسی ضرورت پر کام آتی ہے۔ رسی مضبوط اور لمبی تھی۔ میں نے سوچا پھینک دوں گی تو ضائع ہو جائے گی ساتھ ہی رکھ لوں محفوظ تو رہے گی۔"

بوا فرعونی کی ایک شان فرعونیت بڑی دلچسپ تھی، اور مشہور ہو گئی تھی۔ بیٹیوں کو نکاح کے بعد سب سے پہلے، سب سے زیادہ اور سب سے زوردار نصیحت یہ فرماتی تھیں کہ "شوہروں کو اپنا مطیع بنائیں، ان کے جان

مال، گھر جائداد سب پر قبضہ کرلیں۔" یوں تو اس فہائش کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ ہر عورت کی فطرت یہی ہے ننوا میں ننانوے لڑکیاں یہی چاہتی اور اسی کی کوشش کرتی ہیں۔ بلکہ سو میں سو اور ہزار میں ہزار۔ کہیں لاکھوں میں کوئی اللہ کی بندی ایسی ہوگی جو ساس نندوں کے ساتھ مل جل کر ہنسی خوشی گذار سکے۔ پھر یہ لڑکیاں تو بوا فرعونی ہی کی اولاد تھیں "مچھلی کے جائے کن تیرائیے"۔ لیکن بوا فرعونی اپنی لڑکیوں کو اس طرز و روش پر چلنے کی سخت تاکید کرتی تھیں۔ تدبیر بتاتی تھیں۔ مدد دیتی تھیں، مجبور کرتی تھیں اور یہ بات مشہور تھی کہ بیٹیوں کے ساتھ بوا فرعونی کی محبت کا معیار ایک یہی معاملہ تھا۔ پھر بھی سچ یہ ہے کہ "نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد"۔ بعضوں کو ایسے پوچ مرد ملے کہ زن مرید بن گئے۔ موم کی ناک ہو گئے۔ بعضوں کو ایسے مردانہ مرد ملے یا وہ خود ایسی اللہ کی نیک بندیاں تھیں کہ شوہر کی اطاعت کو ماں کی فرمانبرداری پر مقدم رکھا۔ یہ اس لئے کہا کہ جہاں تک سنا اس قسم کے جوڑے کو اپنے حال میں خوش اور مطمئن سنا لیکن بوا فرعونی ایسی بیٹی اور ایسے داماد سے ہمیشہ ناخوش رہیں، بوا فرعونی سیاست خانہ داری کی ایسی ماہر تھیں کہ پاس پڑوس کی عورتیں، سہیلیاں ہمجولیاں اپنے اپنے معاملات میں ان سے مشورہ لینے آتی تھیں۔ اور یہ ایسی ایسی ترکیبیں دماغ سے اتارتی تھیں کہ چاہے گھر کا گھر واہو جائے لیکن بیوی کی بات ور رہے۔ بوا فرعونی کی جوانی کا ذکر ہے کہ ان کے میاں کسی بات پر ان سے ناراض ہو گئے بولنا چھوڑ دیا۔ اور یہ قطع تعلق دو چار دن نہیں، دو چار ہفتے نہیں دو چار مہینے نہیں۔ دو چار برس تک جاری رہا۔ مگر شاباش ہے بوا فرعونی کو کہ یہ زمانہ اس طور سے گزار دیا کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی۔ حد یہ ہے کہ گھر کے آدمیوں اور اپنی اولاد تک کو بھی اس کا احساس اور شبہہ نہ ہونے دیا لیکن اس سارے عرصہ میں بوا فرعونی کے دل و دماغ میں ایک طوفان جاری اور ایک قیامت برپا رہی۔ دعا۔ درود۔ تعویذ، گنڈے۔ منت مراد، کون سی چیز تھی جو انھوں نے اٹھا رکھی۔ چلے کھینچے وظیفے پڑھے، عاملوں سادھوؤں کے پاس دوڑی پھریں، روپیہ ٹھیکریوں کی طرح لٹایا، پانی کی طرح بہایا آخر میاں سے اپنا سجدہ کرا کر چھوڑا۔ پھر تو وہی میاں صرف زن مرید نہیں "زن بندہ" بن گئے۔ اور ختم نبوت کی طرح بیوی کی ختم ولایت کا دم بھرنے لگے۔

اِس شورشِ باطن اور قیامت خاموش کے زمانہ میں بوا فرعونی نے جیسی جیسی جسمانی مصیبت اُٹھائی جو جو روحانی کوفت سہی وہ ایک مستقل داستان ہے لیکن اس میں ان پر ایک ایسا عجیب وغریب واقعہ گذر گیا کہ آج بھی سُنکر حیرت ہوتی ہے اور بوا فرعونی کی ہمت مردانہ پر دل سے آفرین نکلتی ہے۔ بہادر سے بہادر مرد بھی اس سے زیادہ سے کیا کر سکتا تھا جو بوا فرعونی نے کر دکھایا۔

بوا فرعونی نے سُنا کہ شہر سے دس میل ایک گاؤں ہے اُس میں کوئی حُب کا زبردست عامل ہے۔ فوراً اپنی رازدار ماما کو بھیجا وہ گئی، دیکھ آئی، مل آئی اور یہ جواب لائی کہ میاں صاحب بہت خفا ہوتے اور فرمایا "جاجا جس کا کام ہے وہی آئے اور اکیلا آئے" بوا فرعونی کے یہ سُن کر چھکّے چھوٹ گئے۔ پسینہ آگیا، جانا کوئی نئی بات نہ تھی۔ تنہا جانا بھی کوئی بڑا کام نہ تھا لیکن تنہا آنے کی شرط کیوں لگائی ہے۔ اِس سے جی ڈرتا تھا پوچھا۔ "اری کمبخت میاں صاحب کس وقت ملتے ہیں۔ دن کو یا رات کو، اکیلے ہوتے ہیں یا اور لوگ بھی پاس ہوتے ہیں" ماما نے کہا "اے بُوا دن دہاڑے عصر کے وقت ملتے ہیں۔ رات کو تو وہ کسی کو پاس تک نہیں آنے دیتے۔ مغرب کے بعد کوٹھری بند کر لیتے ہیں۔ صبح کو کھولتے ہیں، کہتے ہیں رات کو اُن کے پاس جن آتے ہیں اور کسی وقت تنہا بھی نہیں ہوتے، ویسے تو باہر آدمیوں کا میلا لگا رہتا ہے مگر ان کے پاس بھی ہر وقت دو چار دس بیس حاجت مند بیٹھے رہتے ہیں۔ میاں صاحب بہت باتیں نہیں کرتے۔ کسی کا قصہ داستان نہیں سنتے۔ بس ایک لفظ میں مقصد دریافت کر لیتے ہیں۔ اور کوئی تو یذ دیدیتے ہیں یا عمل بتا دیتے ہیں۔ کسی پر دم کر دیتے ہیں۔ کسی کو جھاڑ دیتے ہیں۔ اے بی میرے سامنے ایک عورت آئی اور کہا کہ بٹیا ایسا بیمار ہے کہ کھٹیا سے لگ گیا ہے، یہاں تک نہیں آسکتا چل کر دم کر دیجئے۔ میاں صاحب نے کچھ پڑھ کر چھت کی طرف منہ اُٹھا کر پھونک ماری اور کہا جا دم کر دیا اچھا ہو جائے گا۔ ایک اور عورت آئی اور کہنے لگی کہ میاں نے چھوڑ دیا ہے۔ پہلے تو دھمکی دیا کرتا تھا اب دوسرا نکاح کرنے کے لئے دوسرے گاؤں کو گیا ہے۔ میاں صاحب نے کچھ پڑھ کر زمین پر اُنگلی سے پڑی لکیر کھینچی اور پھر اس لکیر کے بیچ میں انگلی رکھ کر اپنی طرف کو لکیر کھینچدی (┬) اور کہا " جا

جہاں تک گیا ہے وہاں سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پیچھے کو لوٹ آئے گا، عورت نے جلدی سے پوچھا "میاں صاحب پھر کیا میرے پاس آئے گا:" کہنے لگے "چل باتیں نہ بنا اور کیا میرے پاس آئے گا" بوا فرعونی نے جو یہ واقعات سُنے تو ایسی بے تاب ہوئیں کہ پر لگ جائیں اور ابھی اُڑکر جا پہونچیں۔ اتفاق سے دوسرے روز سے کئی دن کی تعطیل تھی اور میاں وطن جانے والے تھے، اتفاق سے موقع نکل آیا۔ میاں ایک بجے دن کو بڑی لائن سے سوار ہوئے اور بوا فرعونی ماما کو ساتھ لے چھوٹی لائن سے تین بجے چلدیں۔ سات میل تک تو ریل جاتی تھی اسٹیشن پر اُتر گئیں وہاں سے گاؤں تین میل تھا اسٹیشن کے پاس سرائے تھی۔ اس میں ایک کوٹھڑی کرایہ پر لی۔ ماما کو وہاں چھوڑا اور آپ تن تنہا برقع میں لپٹی ہوئی تانگہ میں بیٹھ میاں صاحب کی خدمت میں روانہ ہوئیں۔ میاں صاحب کی جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر تانگہ سے اُتر گئیں۔ تانگہ والے کو ٹھہرنے کا حکم دیکر میاں صاحب کے پاس پہونچیں وہاں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ بہت سی عورتیں مرد بیٹھے تھے۔ آ جا رہے تھے۔ یہ بھی خاموش ایک کونے میں جا بیٹھیں، ماما سے سُن چکی تھیں کہ میاں صاحب لمبی چوڑی کہانی نہیں سُنتے۔ اور یہ غیروں کے سامنے سُنانی بھی نہ چاہتی تھیں۔ سمجھتی تھیں کہ میاں صاحب کو کشف سے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس لئے متوجہ کرنے کی غرض سے کاغذ کے پرچہ پر صرف چار لفظ لکھ لائی تھیں۔ جب ان کی باری آئی پرچہ پیش کر دیا۔ اس پر لکھا تھا:۔

"یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان[1]" یہ الفاظ دیکھتے ہی میاں صاحب کا چہرہ چمک اُٹھا، ان کو اب تک جاہلوں گنواروں سے سابقہ پڑا تھا۔ اس ذرا سے پرچے نے بوا فرعونی کی علمیت، ذہانت، شہرت دولت، ہمت سب روشن کردی۔ گویا برقع کے اندر صورت کے علاوہ جو چیزیں تھیں سب اس پرچہ پر منقوش تھیں۔ پرچہ پڑھتے ہی بیساختہ میاں صاحب نے فرمایا۔ "غم مخور"۔ بوا فرعونی کا دل فرطِ خوشی سے

---

[1] یعنی کھویا ہوا یوسف پھر کنعان میں آجائے۔ خواجہ حافظ شیرازی کے مشہور مطلع کا پہلا مصرعہ ہے ع
یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور

اچھلنے لگا۔ قریب تھا کہ میاں صاحب کے قدموں پر گر پڑیں کہ اُنھوں نے شاید یہ بات سمجھ کر جلدی سے کہا "اس کے مقطع کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو"۔ بوا فرعونی کا دل دھک سے ہو گیا۔ کیا میاں صاحب ان کے علم و عقل کا امتحان لے رہے تھے۔ لیکن وہ امتحان میں کامیاب تھیں۔ کون ہے جس نے فارسی پڑھی ہے اور حافظ شیرازی کی یہ غزل نہیں دیکھی۔ پھر بوا فرعونی اس سے کیا بے خبر ہوتیں اور کچھ نہیں تو فال دیکھنے کے لئے ہی دیوان حافظ قرآن مجید سے زیادہ ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ قرآن پاؤ یا دہو گا تو دیوان حافظ آدھا۔ فوراً غزل کا یہ مقطع یاد آ گیا۔

حافظا در کنج فقر و خلوت شبہائے تار تا بود وردت دعا و درس قرآں مخور

اور اس کا مضمون ذہن میں آتے ہی دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میاں صاحب کرامت کے ذریعہ سے پھونک مار کر اس مشکل کو حل کرنا نہیں چاہتے۔ یہ تصور آتے ہی مایوسی چھا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میاں صاحب شاید اس کیفیت کو بھی دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے بولے "سب کام ایک سے نہیں ہوتے" پھر کچھ عمل اور وظیفہ اس کا طریقہ اس کی زکوٰۃ سب بتائی۔ اور خاموش ہو گئے۔ بوا فرعونی ایسے غور و توجہ سے سن رہی تھیں کہ ایک ایک ہدایت ایک ایک لفظ دل پر نقش ہو رہا تھا۔ لیکن جو عمل بتایا تھا وہ بہت دشوار، نہایت دیر طلب اور سخت امتحان کا تھا۔ بوا فرعونی نے ارادہ کر لیا تھا کہ بے ضرورت اپنی آواز نہ سنائیں گی۔ اس وقت بے اختیار جی چاہا کہ قدموں پر گر کر عرض کریں کہ یا حضرت اس ناتوان دردمند کنیز سے یہ پہاڑ نہ اُٹھے گا۔ آپ اپنی کرامت سے بیڑہ پار لگا دیجئے۔ لیکن یہ بات بھی شاید میاں صاحب نے سمجھ لی۔ فرمایا: "بیگم صاحب جاؤ۔ تمہارے لئے یہی حکم ہے"۔ بیگم صاحب کا لفظ سنتے ہی بوا فرعونی کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ چکر آنے لگا۔ پسینہ چھوٹ گیا۔ لیکن سنبھلیں اور فوراً کھڑی ہو کر خاموش سلام کر کے اُلٹے پاؤں باہر نکل گئیں۔

تانگہ کھڑا ہی تھا۔ بیٹھ گئیں۔ تانگہ اسٹیشن کو روانہ ہوا اور بوا فرعونی اپنے خیالات اور منصوبوں

میں غرق ہوگئیں ابھی خیالی پلاؤ پکا ہی رہی تھیں کہ یکا یک جھٹکا لگا، سنبھلیں اور ایسا معلوم ہوا کہ سوتے سے چونکی ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو خیال آیا کہ یہ راستہ وہ نہیں ہے جس سے آئی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی دل بیٹھ گیا۔ مغرب کا وقت آگیا تھا اور اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ تانگہ اس قدر تیز جا رہا تھا کہ جیسے جان بچا کر بھاگ رہا ہے۔ سمجھ گئیں کہ تانگے والے کی نیت بد ہے۔ پہلے تو بہت گھبرائیں ہاتھ پاؤں پھول گئے کچھ کہنا چاہا زبان نے یاری نہ دی لیکن ایک لمحہ میں یہ کیفیت گذر گئی، اور دل کو مضبوط کر کے تانگے والے سے پوچھا، کدھر جا رہے ہو۔ اسٹیشن کا راستہ یہ نہیں ہے۔ اسٹیشن کتنی دور ہے لیکن اُس نے جواب دینے کی بجائے گھوڑے کے دو ہنٹر رسید کئے۔ گھوڑا اور اُڑ چلا۔ اب بوا فرعونی کے حواس پھر غائب ہو چلے۔ لیکن پھر ہمت باندھی اور تانگہ والے کا کندھا پکڑ کر زور سے ہلایا اور چلاّ کر کہا "تانگہ روک لے، ورنہ کو د پڑتی ہوں۔ میری تو جان جائے گی لیکن تو بھی نہ بچے گا، پکڑا جائے گا، مارا جائے گا۔" تانگہ والے نے جھٹکا دے کر کندھے سے ہاتھ ہٹا دیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا، اب بوا فرعونی نے پھر چاروں طرف نظر ڈال کر بچنے کے امکانات کا اندازہ کیا۔ لیکن ہر طرف سنسان میدان نظر آیا۔ آدم نہ آدم زاد۔ آبادی۔ نہ روشنی۔ بھلے کو چاندنی رات تھی۔ ورنہ اب تک اتنا اندھیرا ہو جاتا کہ راستہ بھی نظر نہ آتا۔ چاند پر نظر پڑتے ہی خیال آیا آج گیارھویں تاریخ ہے اس وقت گھر ہوتی تو گیارھویں شریف کی نیاز کرتی۔ فوراً دل میں نیت کی کہ " یا پیر دستگیر اِس مصیبت سے نجات دو، رات ہی میں گھر پہنچا دو تو صبح کو اتنی نیاز کر دوں جتنی سال کے بارہ مہینوں میں کرتی"

یہ دُعا ختم نہ ہوئی تھی کہ تانگہ اک دم بائیں ہاتھ کی طرف مڑا۔ اور معاً سامنے ایک دھندلی سی عمارت نظر آئی اور پانی کے بہنے کی آواز سنائی دی۔ سوچنے لگیں کہ دیکھئے اب کیا گل کھلتا ہے۔ اتنے میں یکا یک تانگہ رُک گیا۔ یہ ابھی جلدی سے کود کر کھڑی ہی ہوئی تھیں کہ تانگے والے نے آکر پہونچا پکڑ لیا اور فوراً منہ سے زور کی سیٹی بجائی۔ بوا فرعونی نے زور کر کے ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن لوہے کے شکنجہ کی

گرفت تھی چیخیں چلائیں بُرا بھلا کہا۔ اور پوچھا کہ آخر مطلب کیا ہے۔ یہاں کیوں لاتے ہو۔

تانگہ والا "پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں چیخنے چلانے سے فائدے کی جگہ نقصان ہوگا۔ اس لئے بالکل خاموش رہو۔ دوسری بات یہ کہ اس "جنگ محل" کے اندر چلو"

بوا فرعونی "پہلے میرا ہاتھ چھوڑ۔ بے حیا بدذات!"

تانگہ والا "دیکھو بیگم صاحب، زبان نہ چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لئے زیبا نہیں۔ لو میں ہاتھ چھوڑتا ہوں۔ لیکن اس پستول کو دیکھ لو تم نے چیخنے یا بھاگنے کا ارادہ کیا اور میں نے دو ٹوک فیصلہ کیا۔

بوا فرعونی۔ اے میرے اللہ! کیا تم میری جان لینا چاہتے ہو"

تانگہ والا "اس کی ضرورت ہوتی تو اتنی دیر کرنے سے کیا فائدہ تھا۔ اور پہلے سے خبردار کیوں کرتا"

اتنے میں ایک شخص عمارت کی طرف سے آتا نظر آیا۔ بوا فرعونی نے اس طرف نظر اُٹھائی تو معلوم ہوا وہ عمارت پانی کے کنارے پر بنی ہوئی ہے اور سڑک سے اس کے اندر جانے کے لئے تختوں کا راستہ بنا دیا ہے۔ تانگہ والے نے اسی شخص کو بلانے کے لئے سیٹی بجائی تھی۔ تانگہ والا اُسکی طرف مخاطب ہوا۔

تانگہ والا "رفیق قریب آؤ۔ دیکھو۔ یہ بیگم صاحب آئی ہیں، ان کو جنگ محل" کی سیر کراؤ، بیگم صاحب اس کے ساتھ جائیے میں ابھی گھوڑے کو باندھ کر آتا ہوں"

بوا فرعونی "کیا! ہرگز نہیں! میں اس کے ساتھ اس مکان میں ہرگز نہ جاؤں گی۔ اس سے مرجانا اچھا ہے۔ تم مار ڈالو۔

تانگہ والا۔ (پستول تان کر) "تم کو جانا پڑے گا! بحث و حجت سے کچھ فائدہ نہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہمیں تمہاری جان لینی نہیں ہے۔ مال لینا ہے"

بوا فرعونی۔ (اپنا بٹوہ بڑھا کر) ”تو مال لے لو۔ جو کچھ ہے سب لے لو“
تانگے والے کا ساتھی۔ (بٹوہ ہاتھ سے لیکر) کفران نعمت نہیں کرنا چاہیے۔ اس تحفہ کا شکریہ لیکن مکان کے اندر پھر بھی چلنا پڑے گا۔ ایک ذرا سے کاغذ پر دستخط کرنے ہیں۔
بوا فرعونی: ”تم قسم کھاتے ہو کہ میری جان کا کوئی خطرہ نہیں ہے؟“
تانگہ والا: ”یہ تو میں کئی بار یقین دلا چکا ہوں“
بوا فرعونی: ”اچھا چلو۔ تم آگے بڑھو“
رفیق: ”نہیں بیگم صاحب آپ آگے چلئے۔ لیکن یاد رکھئے کہ میں پاس ہی ہوں اور میرے ہاتھ میں بہت موٹا ڈنڈا ہے“

دونوں آگے پیچھے تختوں کا راستہ طے کر کے مکان کے دروازے پر پہنچے۔ رفیق نے کہا ”دروازے کو دھکا دو کھل جائے گا“، بوا فرعونی نے دروازہ کھولا تو اندر بالکل اندھیرا گھپ نظر آیا۔ اندر قدم رکھتے ہی رفیق نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اب اس قدر تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ تاریکی۔ تنہائی اور غیر مرد کا تصور آتے ہی بوا فرعونی کانپ اٹھیں۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے، اتنے میں رفیق نے دیا سلائی جلائی، اور موم بتی روشن کر لی۔ اب بوا فرعونی کا خوف ذرا کم ہوا۔ اندر ایک زینہ نظر آیا۔ رفیق نے کہا، ”اوپر چلئے“۔ اب بحث و انکار کا موقعہ نہ تھا۔ آگے بوا فرعونی پیچھے رفیق زینے پر چڑھ کر ایک کمرے میں پہنچے۔
رفیق: ”اب میں غریب خانہ پر آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں، تشریف رکھئے، یہ میری بیوی خدمت کے لئے حاضر ہے“

بوا فرعونی نے دیکھا کہ مجازی نہیں حقیقی غریب خانہ ہے۔ پلنگ پیڑھی میز کرسی سب خراب خستہ ہیں۔ اور ایک پلنگ پر ایک عورت بیٹھی ہے۔ وہ ان کو دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔ عورت کو دیکھ کر بوا فرعونی کے جان میں جان آئی، کہ کیسی ہی بگر وہ صورت سہی اپنی ہم جنس تو ہے۔

چند منٹ میں تانگے والا بھی آ گیا اور آتے ہی بولا۔

تانگے والا: "کہئے بیگم صاحب کیا ارادہ ہے؟"

بوا فرعونی: "میرا ارادہ؟ تم اپنا ارادہ بتاؤ مجھے کیوں یہاں لائے ہو۔ وہ کاغذ کیسا ہے جس پر مجھ سے دستخط کرانے ہیں یا بہانہ ہی بہانہ تھا۔

تانگے والا۔ ہم حیلے بہانے کے آدمی نہیں۔ صاف معاملہ کرنے والے ہیں۔ بیگم صاحب اب تم بالکل ہمارے قابو میں ہو، اور ہم جو کہیں اس کے کرنے پر مجبور ہو، اس کے بعد اگر دیر ہو گی تو تمہاری طرف سے ہو گی، اچھا پہلے اپنا نام بتائیے"

بوا فرعونی۔ میرا نام؟ تمہیں نام سے کچھ کام نہیں"

تانگے والا: "اچھا اگر تم چک پر اپنا نام نہیں لکھنا چاہتیں تو کسی شخص کے نام رقعہ لکھ دیجئے کہ مجھے ایک ہزار روپیہ دیدے اور کسی قسم کا کوئی سوال نہ کرے"

بوا فرعونی: "تمہیں کیا معلوم کہ میری اتنی حیثیت بھی ہے کہ ایسی بڑی رقم دے سکوں"

تانگے والا: "ایک تو تمہارے اسی سوال سے میرے قیاس کی تصدیق ہو گئی، تمہاری اتنی حیثیت نہ ہوتی تو یہ نہ پوچھتیں کہ مجھے کیونکر معلوم ہوا۔ بلکہ صاف انکار کرتیں قسمیں کھاتیں۔ رو تیں پیٹتیں۔ اگرچہ اس پر بھی مجھے یقین نہ آتا اس لئے کہ میں پہلے ہی تھوڑی بہت تحقیق کر چکا تھا"

بوا فرعونی۔ (حیرت سے) "وہ کیسے؟"

تانگے والا: "بات ختم ہونے میں دیر لگنے سے تمہارا ہی نقصان ہے۔ مجھے بتانے میں کچھ عذر نہیں کل تمہاری ماما میاں صاحب کے پاس آئی تھی اور اس کو اسٹیشن سے میں ہی لایا تھا۔ یہاں تانگے دو ایک ہی ہیں۔ میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا نہ پوچھنے کی

ضرورت تھی ۔ نہ خیال ۔ ہمارا یہ پیشہ نہیں ہے کہ ہر مسافر کو بھٹکا بھٹکا کر لوٹ لیں۔ کبھی اتفاق سے کوئی سونے کی چڑیا ہاتھ آجاتی ہے تو بے شک نہیں چھوڑتے ۔ جب تمہاری ماما میاں صاحب کے پاس گئی تو میں بھی ویسے ہی جا کر کھڑا ہو گیا کہ میاں صاحب کا دیدار ہو جائے گا ۔ تمہاری ماما نے میاں صاحب سے مختصر طور پر جو کچھ حال بیان کیا وہ میرے کان میں بھی پڑ گیا ۔ اس وقت بھی مجھے کوئی خیال پیدا نہ ہوا ، اتفاق سے آج تم دونوں اسٹیشن سے نکلیں تو مجھے وہ بات یاد آگئی ، اور آج میں تمہاری باتیں ہی سننے کے لئے پھر میاں صاحب کی کوٹھری کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ جب رخصت کرتے وقت میاں صاحب نے تمھیں بیگم صاحب کہا تو بس اسی وقت میرا یہ سب منصوبہ بندھ گیا ۔ اگر اب بھی آپ یہ ہی کہو کہ میرا خیال غلط ہے تو آپ یہاں ٹھہرو ۔ میں ابھی اسٹیشن جا کر سرائے میں تمہاری ماما سے تحقیقات کر آتا ہوں مجھے پوچھنے کے ایسے ڈھب آتے ہیں کہ وہ کچھ چھپا نہیں سکتی ۔ اور فرض کرو کہ اس نے نہ بتایا تو آپ تو یہاں موجود ہی ہیں ۔ میں کل دن میں شہر جا کر سب حال معلوم کروں گا ۔

اِس تقریر کو سن کر بوا فرعونی کے ہوش اُڑ گئے ، بولیں ۔

بوا فرعونی ۔ اچھا قصہ کو مختصر کرو ، میں اپنے بنک کو خط لکھ دیتی ہوں ۔"

تانگے والا " یہ آپ ہی کے لئے بُرا ہے یہاں کوئی آس پاس ایسا شخص نہیں ہے جس کو لکھ دو اور وہ دیدے ؟"

بوا فرعونی " نہیں ۔ میں اس ضلع میں کسی کو نہیں جانتی ۔ یہاں بالکل اجنبی ہوں ۔"

تانگے والا " بہتر ۔ اپنے بنک ہی کے منیجر کو لکھ دو ۔ میں فوراً روانہ ہو جاؤں گا ۔ اور کل صبح بنک کھلتے ہی خط پہنچا کر وصول کر لاؤں گا کل ایک بجے تک نہیں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا ۔"

بوا فرعونی " یا اللہ ! تم اتنی دیر مجھے مقید نہیں رکھ سکتے ۔"

تانگے والا:"ہمیں رکھنا پڑے گا۔ اور تمھیں رہنا پڑے گا۔ کیا ہم کو اتنا احمق سمجھتی ہو کہ بغیر روپے وصول کئے چھوڑ دیں گے"؟

بوا فرعونی:"لیکن میں تمہیں سارا خط بجز دستخط کے دکھا دوں گی اور قسم کھاتی ہوں کہ تمہارے خلاف کوئی بات نہ لکھوں گی۔ تم تین آدمیوں میں کوئی تو پڑھا ہوگا"؟

تانگے والا:"آپ کا یہ خادم ہی کچھ شُد بُد جانتا ہے لیکن اس طرح کام نہ بنے گا۔ ہم صرف وعدوں پر بھروسہ کرنے کے اسامی نہیں ہیں۔ آپ کو تکلیف تو بے شک ہوگی لیکن رفیق کی بیوی خدمت گذاری کے لئے حاضر ہے"۔

بوا فرعونی رات بھر کی قید کا تصور کر کے نہایت بے چین ہوئیں اور بولیں۔

بوا فرعونی۔ اچھا تم میرا زیور بھی لے لو۔ لو یہ ہار ہے۔ یہ بازوبند ہے۔ یہ سونے کی گھڑی ہے یہ تینوں چیزیں ایک ہزار سے زیادہ کا مال ہیں۔ ان میں جواہرات جڑے ہوتے ہیں۔

تانگے والا:"ان کو تو بھاؤ میں لینے کا ارادہ ہی تھا ابھی کچھ جلدی نہ تھی۔ اصل بات تو روپیہ ہیں اور وہ الگ لینے ہیں اب یہ سمجھ لو کہ جتنی دیر لگاؤ گی اتنی ہی دیر یہاں اور رہنا پڑیگا"۔

بوا فرعونی۔ (غصّے سے کھڑی ہو کر) تم مجھے روک نہیں سکتے۔ کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ فوراً مجھے جانے دو، زیادہ تنگ نہ کرو۔ سمجھ لو کہ "تنگ آمد بہ جنگ آمد"۔ میں اس قدر چیخوں چلاؤں گی کہ گھر کی چھت اُڑ جائے گی اور دور دور خبر پہونچے گی، اور کوئی نہ کوئی مدد کو آجائے گا۔ سُنتے ہو"۔

تانگے والا:"میں سب سُن رہا ہوں۔ تم پہلے اپنا گلا تو پھاڑ لو، یہ "جنگ محل" اس حکمت سے بنایا گیا ہے کہ کتنے ہی زور کی آواز ہو اِن دیواروں سے باہر نہیں جا سکتی۔ اِس کے علاوہ اور دیکھو"۔

یہ کہہ کر وہ کمرے کے ایک کونے میں گیا اور فرش پر جھک کر ایک لوہے کا کڑا پکڑ کر اُٹھایا۔ نیچے ایک غار تھا۔

تانگے والا "یہ ایک چور راستہ ہے۔ اس مکان میں شاہی وقتوں میں سامان جنگ رہتا تھا، اسی لئے اس کا نام جنگ محل ہے۔ یہ غار چھت سے نیچے تہ خانہ تک پہونچتا ہے۔ دیکھو یہ رسّی لپٹی ہوئی رکھی ہے۔ اور اس کڑے میں بندھی ہوئی۔ رسّی کو نیچے لٹکا کر اس کے ذریعے سے سامان اوپر کھینچ لیا جاتا تھا سُنتی ہو بیگم صاحب۔ اوپر سے کسی آدمی کو نیچے پھینک دیا جائے تو ہاتھ پاؤں سلامت نہیں رہ سکتے۔ جان بچنی بھی مشکل ہی ہے"

بوا فرعونی کے خوف کے مارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ غار پر سے ڈر کر ہٹ گئیں اور سوچنے لگیں کہ یہ لوگ میری جان نہیں لے سکتے ان کو خود اپنی جان کا اندیشہ ہو گا۔ یہ سوچکر بولیں۔

بوا فرعونی "مجھے تمہاری کوئی شرط منظور نہیں۔ میں نے اپنا زیور بھی دیدیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ دوں گی"

تانگے والا "بیگم صاحب ہم سے کوئی چال نہ چلے گی" اور یہ کہہ کر پستول نکال لیا۔

بوا فرعونی "تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ قاتل دنیا میں بھی سزا سے نہیں بچتا۔ پولیس کی جاسوسی کا جال پھیلا ہوا ہے تم اس مال کو غنیمت نہیں جانتے جو ہاتھ آگیا ہے۔ لو مجھے جانے دو اور قسم لے لو جو میں اس سارے واقعہ کی کسی کو کانوں کان خبر ہونے دوں۔ نہ پولیس میں اطلاع دوں۔ نہ تحقیقات کراؤں۔ نہ پکڑواؤں۔ لیکن اگر تم نے مجھے یہاں روک رکھا تو یاد رکھو میں سخت سے سخت انتقام لے سکتی ہوں"

تانگے والا "بس بیگم صاحب بس کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے تم اس موقع اور اس حالت کو ابھی سمجھی نہیں۔ اگر ہم کو یہ کھٹکا ہوتا کہ تم یہاں سے نکل کر ہم کو پکڑوا دو گی تو ہم تمہارا کبھی کا

خاتمہ کر چکے ہوتے ۔ نہیں ۔ ہم کو یقین ہے کہ تم ہماری خاطر نہیں بلکہ اپنی عزت آبرو کی خاطر ان دلچسپ واقعات کا ذکر بھی نہ کرو گی ۔ کسی مالدار شریف زادی نوجوان برقع پوش کا تنہا گاؤں گاؤں جنگلوں جنگلوں پھرنا عزت آبرو کی بات نہیں ہے ۔ رات بھر گھر سے باہر رہنا اچھے چال چلن والے کا کام نہیں ہے ۔ تم شوہردار ہو ، باپ بھائی بھی ہوں گے ۔ ان سے تم یہ واقعہ بیان نہیں کر سکتیں ۔ بیگم صاحب اس طرف سے تو ہم کو بالکل اطمینان ہے ۔ اب فرماؤ کیا حکم ہے ؟

.بوا فرعونی ۔" اگر تم مجھے جانے دو گے تو کل دوپہر سے پہلے میں بجائے ایک ہزار کے دو ہزار روپے جس پتہ پر کہو بھیجدوں گی یا جس آدمی کو کہو گے میری ماما جا کر اس کے ہاتھ میں دے آئے گی ۔"

تانگے والا ۔" تم نے باتوں میں اور دیر لگائی تو میں خود ہی ایک ہزار کے دو ہزار کر دوں گا ۔"

.بوا فرعونی ۔ (مایوس ہو کر رفیق کی بیوی کی طرف دیکھ کر) " اے بہن ، تم ہی میرے حال پر رحم کھاؤ ۔" عورت نے انکار کے لئے سر ہلا دیا ۔ منہ سے کچھ نہ کہا ۔

تانگے والا ۔" اچھا بیگم صاحب اب جلدی کرو ، بہت حجت ہو لی ۔ رفیق ۔ قلم دوات کاغذ ہے ؟"

رفیق ۔" یہ کاغذ ہے ۔ یہ قلم دوات موجود ہے ۔ مہر کے لئے لاکھ بھی تیار ہے ۔"

.بوا فرعونی نے گہرا سانس لیا اور میز کے پاس بیٹھ کر یہ سطریں ایک مشہور بینک کے منیجر کے نام لکھیں

"حامل رقعہ کو ایک ہزار روپیہ نقد دیدیجئے ۔ کسی قسم کا کوئی سوال اس سے نہ کیجئے ۔ نہ ایک لمحہ کی تاخیر کیجئے ۔ میرے دستخط کا صحیح و درست ہونا اس بات سے ظاہر ہوگا کہ اس سے پہلے میں نے آخری چک پانچ تاریخ ماہ حال کو بینک بھیجا تھا ۔"

.بوا فرعونی (رقعہ تانگے والے کو دے کر) " اس کو پڑھ لو ، اس کے بعد میں دستخط کروں گی ۔"

تانگے والا ۔ (پڑھ کر) " ٹھیک ہے میں آپ کا نام دیکھنا نہیں چاہتا ۔ لیکن مہربانی کر کے دستخط

اس طرح کیجیے گا کہ میں دور سے یہ دیکھ سکوں کہ دستخط کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا۔ بوا فرعونی نے دستخط کر کے خط لفافہ میں رکھا اور انگلی سے انگوٹھی اُتار کر لاکھ سے لفافہ پر مُہر لگا دی، مُہر میں ایک خاص قسم کا دستخطی طغرا بنا ہوا تھا، نام نشان کسی کا نہ تھا۔ مہر لگا کر خط تانگے والے کو دیدیا۔

تانگے والا: "بیگم صاحب اُمید ہے کہ آپ نے ایسا بندوبست کیا ہوگا جس سے مجھے روپیہ وصول ہونے میں دشواری نہ ہو اور کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے اس لئے کہ میں بھی اپنی حفاظت کی تدبیر سے غافل نہیں ہوں۔ رفیق میں اپنے ساتھ خادم کو لئے جاتا ہوں، روپیہ خیریت سے مل گئے تو میں کل ایک بجے یہاں موجود ہوں گا۔ اور کچھ گڑبڑ ہوئی تو خادم آکر کہہ دیگا۔ پھر بیگم صاحب جانیں اور ان کی تقدیر اور تمہاری تدبیر۔ بیگم صاحب اگر خدا نہ کرے معاملہ بگڑ گیا تو پھر آپ میرے خلاف گواہی دینے کے لئے موجود نہ ہوں گی"

بوا فرعونی: "تم نے تو ابھی کہا تھا کہ میری طرف سے تمھیں اطمینان ہے"

تانگے والا۔ "سچ ہے لیکن ہم لوگوں کی عادت ہے کہ گرہ پر گرہ لگا لیتے ہیں کہ پکی رہے، اچھا اب جاتا ہوں"

اس کے جانے کے بعد رفیق کی بیوی نے بوا فرعونی سے کہا "بیگم صاحب آرام سے تشریف رکھئے۔ یہ گھر تو آپ کے لائق نہیں ہے۔ لیکن مجبوری میں سب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے، کچھ ناشتہ کر لیجیے" بوا فرعونی نے کھانے پر آمادگی ظاہر کی تو عورت نے روٹی سالن، دودھ، شکر جو کچھ تھا سب نکالا، اور کہا ہم تو پلنگ پر تخت پر کھا لیتے ہیں آپ کے لئے میز پر کھانا لگاتی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے کونے کی میز اُٹھا کر بیچ میں رکھی اس پر کپڑا بچھا کر کھانا چُن دیا۔ کرسی رکھ دی۔ بوا فرعونی کھانے کے پاس بیٹھ کر بولیں "پہلے پانی لاؤ ہاتھ منھ دھو کر کھاؤں گی (ہاتھ سے ایک طرف کو اشارہ کر کے) وہ شاید غسل خانہ یا آبدار خانہ ہے۔ عورت نے اُٹھ کر دیکھا تو گھڑے میں ایک کٹورہ پانی بھی نہ تھا۔ اس پر میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

دونوں سٹ پٹا گئے، اب کیا ہو۔ آخر مرد نے عورت سے کہا تو نیچے جا کر نہر سے پانی لے آ۔ اس نے کہا نہیں تو جا۔ مجھے رات میں باہر جاتے ڈر لگتا ہے۔ دونوں میں ذرا دیر بحث تکرار ہوئی۔ آخر رفیق ہی جانے پر راضی ہو گیا۔ دو بڑے گھڑے اٹھا لیے اور بیوی سے کہا تو دروازے پر پیٹھ لگا کر کھڑی ہو جا اور ہاتھ میں لٹھ لے لے۔ عورت نے اطمینان دلایا اور رفیق چلا گیا

رفیق کو گئے ہوئے دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ بوا فرعونی نے میز پر سے روٹی اٹھا لی اور موم بتی جو پاس ہی جل رہی تھی اس پر روٹی کو گرا دیا۔ شمع گل ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ رفیق کی عورت نے یہ دیکھ کر چیخ ماری۔ اسی آن میں ایک بڑے زور کا دھماکا ہوا، بوا فرعونی نے میز مع برتنوں کے الٹ دی تھی۔ عورت جم کر دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور لٹھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر زور زور سے گھمانا شروع کیا، کہ بوا فرعونی دروازے کے پاس نہ آ سکیں لیکن انھوں نے اور ہی ترکیب سوچی تھی لپک کر غار کے پاس پہنچیں۔ زور سے اس کا ڈھکنا کھولا اور رسی کا گچھا نیچے پھینک اس کے سہارے نیچے اترنے لگیں تقریباً بارہ بندرہ گز گہرائی میں اتر کر فرش زمین پر جا پہنچیں۔ وہاں بالکل تاریکی تھی۔ ٹٹولتی ہوئی ایک طرف کو چلیں۔ تقدیر سے دروازے کو ہاتھ لگا۔ زنجیر بند تھی قفل نہ تھا دروازہ فوراً کھل گیا۔ باہر نکلیں تو چاندنی چٹک رہی تھی، سرد ہوا لگی تو دل اور قوی ہوا۔ دیکھا کہ یہ راستہ خشکی پر نکلا ہے اور سامنے نہر کا پل ہے وہ تختوں کا راستہ جس سے اندر داخل ہوئی تھی پاس ہی ہے اور اسی دروازے کے قریب رفیق گھڑوں میں پانی بھر رہا ہے' ان کے باہر نکلنے کا کوئی کھٹکا نہ ہوا تھا۔ یا رفیق اپنے کام میں محو تھا اس کو کچھ شبہہ نہ ہوا۔ بوا فرعونی تیزی سے دوڑ کر رفیق کے پیچھے پہنچیں اور پوری قوت سے دھکا دے کر اس کو نہر میں گرا دیا اور آپ پل کی طرف دوڑ گئیں۔ رفیق نے غوطہ کھا کر سر اٹھایا تو کچھ نظر نہ آیا۔ کنارے پر آ کر آنکھیں ملیں تو پل پر بوا فرعونی نظر آئیں۔ فوراً بات کی تہ کو پہنچ گیا اور معاً بوا فرعونی کا تعاقب شروع کر دیا اب عورت مرد کی دوڑ قابل دید تھی۔ دونوں اپنی اپنی جان کی خاطر دوڑ رہے تھے لیکن بوا فرعونی بہت

آگئے تھیں۔ اُنھوں نے برقعہ کو کمر سے لپیٹ کر ہاتھ باہر نکال لیئے تھے۔ قدم قدم پر خیال آتا تھا کہ برقعہ اُتار کر پھینکیں لیکن حیا مانع آتی تھی بے تحاشا اُڑی چلی جاتی تھیں معلوم ہوتا تھا جان و آبرو کے خیال نے پاؤں میں پر لگا دیئے ہیں کبھی کبھی پیچھے پھر کر دیکھ لیتی تھیں۔ ہر بار درمیانی فاصلہ زیادہ ہوتا معلوم ہوتا تھا۔ آخر ایک بار دیکھا تو پیچھے رفیق نظر نہ آیا۔ اب ذرا اطمینان ہوا کہ دوڑ جیت لی، ذرا رفتار کم کردی لیکن دوڑتی رہیں پھر ایک منٹ کے بعد پیچھے تعاقب کے آثار نظر نہ آئے تو دل ٹھکانے ہوا کہ خطرے سے نکل گئیں۔ اِس تصور کے ساتھ ہی احساس ہوا کہ اب چلنے کا دم نہیں رہا۔ تھک کر گھاس پر گر پڑیں لیکن نگاہ راستے پہ پر رکھی۔ دل میں کہنے لگیں "الہٰی تیرا شکر، پیر دستگیر تمہاری دستگیری کے قربان، اب آنکھوں کی سوئیاں اور رہ گئی ہیں۔ یہ کانٹا بھی نکال دو۔ بدمعاش بدذات نے مار ڈالنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ غار میں ڈھکیلنے کی دھمکی دیتا تھا۔ کہتا تھا اپنے خلاف گواہی دینے کے لئے زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اس غار کے دیکھتے ہی یہ تدبیر میرے ذہن میں آئی تھی اور اسی لئے پانی مانگا تھا کہ میاں بیوی دونوں میں سے ایک ضرور باہر جائے گا دوسرے سے بھگت لوں گی۔ اپنے پیر کے صدقے کیسی مشکل میں مدد کی ہے۔"

بوا فرعونی اب آزاد تھیں۔ لیکن جنگل بیابان میں اور مفلس و محتاج۔ پیسہ پاس نہیں۔ زیور اور نقد جو کچھ تھا سب جنگ محل میں رہ گیا ہے۔ لیکن تقدیر یاور تھی۔ وہاں سے نصف میل چلی ہوں گی کہ موٹر لاری کی آواز آئی۔ سڑک کے کنارے پر کھڑی ہوگئیں گاڑی قریب آئی اور ان پر روشنی پڑی تو اشارہ کیا گاڑی ٹھہر گئی۔ معلوم ہوا کہ شہر کو جا رہی ہے اور اسٹیشن پر تھوڑی دیر ٹھہر کر جائے گی۔ سوار ہوگئیں اور لاری والے سے کہا کہ کرایہ اسٹیشن پہونچ کر لے لینا، وہ کوئی بھلا مانس تھا مصیبت زدہ مسافر سمجھ کر مدد دینے کا ارادہ کیا تھا۔ کرایہ مانگا بھی نہ تھا۔ اسٹیشن پر سرائے میں پہونچیں۔ ماما ہولے دھڑکے کے مارے پریشان تھی معلوم ہوا اس کے پاس کافی دام ہیں۔ لاری والے کو کرایہ کے علاوہ انعام بھی پیشگی دے دیا۔ بیوی باندی دونوں سوار ہوگئیں اور رات کے دو بجے خیریت سے گھر پہونچ گئیں۔

دوسرے روز ٹھیک دس بجے تانگے والا بنیک پہونچا۔ اس کا دوست خادم ساتھ تھا۔ وہ باہر سڑک پر رہا۔ تانگے والا بنیک کے اندر داخل ہوا اور ایک کلرک کو خط دیا۔ اس نے کہا سامنے کے کمرے میں جاؤ یہ پرائیوٹ خط ہے۔ منیجر صاحب کھول سکتے ہیں۔ تانگے والا حسب ہدایت کمرے کے اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص میز کے پاس بیٹھا ہے۔ سامنے کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ منیجر نے دیکھ کر کہا "کیا کام ہے؟" اُس نے خط پیش کیا۔ بوڑھے منیجر نے احتیاط سے لفافے کی مہر کو دیکھا۔ معلوم ہوا درست ہے۔ دل میں کہا "چلو شکر ہے بواجی کا راز سر بہ مُہر رہا" پھر لفافے کو بغیر کھولے احتیاط سے آہنی سیف میں بند کر دیا اور تانگے والے کی طرف دیکھا۔

منیجر "ٹھیک ہے بھائی"

تانگے والا۔ (تعجب سے) "ٹھیک ہے!! لیکن آپ نے خط تو پڑھا ہی نہیں"

منیجر۔ (سوکھے منہ سے) "مجھے اس کا مضمون معلوم ہے" تانگے والے کو یہ جواب سُن کر چکّر سا آگیا۔ لیکن فوراً سبنھل گیا۔

تانگے والا "شاید آپ وہ صاحب نہیں ہیں جو پرائیوٹ خط کھولا کرتے ہیں۔ میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا"

منیجر۔ یہ بات نہیں۔ وہ شخص میں ہی ہوں۔ یہ بات تم کو سمجھ لینی چاہیے تھی جب میں نے کہا تھا کہ خط کے مضمون سے واقف ہوں، ورنہ خط کھول کر ضرور پڑھتا۔

تانگے والا "لیکن اس میں ضرور کوئی غلط فہمی ہے"

منیجر۔ "تمہاری طرف سے ہو تو ہو مجھے تو کوئی غلطی نظر نہیں آتی"

تانگے والا "معاف فرمائیے۔ لیکن یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ آپ کو اس خط کا مضمون معلوم ہو"

منیجر۔ (نہایت متانت کے ساتھ نرم لہجہ میں) "تمہارے خیال کی تردید میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ

اس خط میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم سے کوئی سوال نہ کروں"۔

اِس جواب سے تانگے والے پر گویا بجلی گر پڑی۔ لڑکھڑا گیا اور سہارے کے لئے دیوار پکڑ لی لیکن فوراً سنبھل گیا۔ اور کہا، "میں نہایت ادب سے آداب عرض کرتا ہوں" یہ کہہ کر بنیک کی عمارت سے باہر نکل گیا۔ خادم صورت دیکھتے ہی کھٹک گیا کہ پٹ پڑی،

خادم:۔ "معلوم ہوتا ہے دھوکا کھا گئے"۔

تانگے والا۔ دھوکا! ارے ایسا دھکا لگا ہے کہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ لیکن یہ ہوا کیا۔ اور کیونکر؟ وہ چڑیل کوئی جادوگرنی تھی!!!

(مطبوعہ رسالہ عصمت دہلی اگست وستمبر ۱۹۳۷ء)

(جدید ترکی معاشرت کا افسانہ)

ریلوے پلیٹ فارم پر صرف ایک ہی نشست تھی اور اُس پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ اُس کے قریب دو آدمی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ایک جوان تھا، دوسرا زیادہ عمر کا۔

جوان آدمی کہہ رہا تھا:۔

"ہاں، مجھے ہمیشہ سے یقین تھا کہ میری جاگیر کے متصل ہی آثارِ قدیمہ موجود ہیں"

دوسرا:۔ "بہرحال وہ آدمی سرخ چینی کا ٹکڑا میرے پاس لے آیا۔ اور میں نے اُسی وقت آپ کو تار دیدیا۔ اُس شخص کا کُتا کھیت کی مٹی پنجوں سے کھود رہا تھا کہ وہ ٹکڑا نظر آگیا"

جوان:۔ "میں آپ کا بیحد ممنون ہوں۔ میں کل ہی ثروت بے سے ملوں گا اور اجازت لے لوں گا وہ زمین اسی کی ہے"

یہ شخص اگر لڑکی کی طرف دیکھتا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ اس کی باتوں کو غور سے سُن رہی ہے "میری جاگیر" کے لفظ نے لڑکی کو بتا دیا کہ متکلم منصور پاشا ہے جس کا گاؤں منصوریہ اگلے ریلوے اسٹیشن سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ پاشا فنِ آثارِ قدیمہ کا عالم و ماہر ہے۔ وہ چھ سال سے باہر تھا۔ اور اپنی ریاست و جائداد منیجروں کے ہاتھ میں دیدی تھی اس کی عمر تیس سال کی تھی۔ تھوڑی دیر میں ٹرین آگئی۔ دونوں آدمی ایک درجہ میں، اور لڑکی دوسرے درجہ میں بیٹھ گئی۔

دوسرے روز صبح کو منصور پاشا اسی میدان میں پہنچا اور نہایت شوق و محنت سے زمین کھودنے لگا

مٹی خلافِ معمول بہت آسانی سے اُکھڑنے لگی۔ لیکن وہ اپنے شوق میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اُسے اس بات کا خیال بھی نہ ہوا، خاموشی کے ساتھ برابر کھودتا رہا۔ قریب کے پُرانے درخت دھوپ میں اس پر سایہ کئے ہوئے تھے۔ کھودتے کھودتے ایک آواز پیدا ہوئی جلدی سے بیٹھ کر نرم مٹی کے اندر ہاتھ ڈالا اور بھورے رنگ کی معمولی چینی کے چند ٹکڑے نکالے لیکن خوبصورت چینی کے سُرخ ٹکڑے ایک دو ہی تھے۔ سانس لینے کے لئے زمین پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اس قدر محنت پر بھی کچھ نہ ملا۔ اس کا تجربہ بتاتا تھا کہ اور ٹکڑے بھی ہونے چاہئیں۔ یہ معمولی ٹکڑے تو بیکار ہیں سوچتے سوچتے سیٹی بجانے لگا۔

فوراً اس کو جواب میں سیٹی کی آواز آئی جو نہایت صاف اور نرم و نازک تھی اور جو نغمہ اس نے سیٹی سے نکالا تھا اُسی کو دوسری آواز پورا کر رہی تھی۔ پاشا نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ سب سے قریب کے درخت پر سے ایک خوبصورت چہرہ شوخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لڑکی مردانہ شکاری لباس میں شاخ پر بیٹھی ٹانگیں لٹکائے جھول رہی تھی۔

"کیا خوب" بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ وہ عالم و محقق بیشک تھا، لیکن زندہ دل اور صاحبِ ذوق بھی تھا۔ اُس نے پوچھا "تم نے سیٹی کیوں بجائی؟"

"اس لئے کہ آپ غلط بجا رہے تھے۔"

"یہ بات تھی؟"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ منصور پاشا کو یکایک خیال آیا اور بولا۔

"تم اس مقام سے اچھی طرح واقف ہو؟"

لڑکی نے شوخی کے ساتھ جواب دیا، "جی ہاں"

"اُمید ہے تم مجھے مدد دے سکو گی۔" اس نے سُرخ چینی کا ایک ٹکڑا اُٹھایا اور کہا "اس قسم کے قیمتی ٹکڑے یہاں کثرت سے ہونے چاہئیں۔"

"جی ہاں، بہت تھے، گاڑی بھرے"
یہ سن کر منصور پاشا اُچھل پڑا۔ اب اس کو زمین کی نرمی اور آسانی سے کھُد جانے کا خیال آیا اور اس بات سے بڑا تردد ہوا کہ یقیناً کوئی ہم پیشہ رقیب اس سے بازی لے گیا۔
"کیا تم کو علم ہے کہ کسی شخص نے حال ہی میں یہ زمین کھودی ہے اور نکالے ہیں؟"
"ہاں آج صبح نکالے ہیں"
"لعنت ان نکالنے والوں پر! بھلا کس نے نکالے؟"
لڑکی فوراً درخت پر سے کود پڑی اور سامنے آکھڑی ہوئی، اور بولی، "میں نے نکالے ہیں"
"تم نے نکالے ہیں!"
پاشا کا مزاج برہم ہوگیا۔ اور رُوکھا منہ بنا کر بولا "معاف کرنا اس زمین کو کھودنے کی اجازت آج صبح ثروت بے نے مجھے دی ہے"
لڑکی نے اسی انداز اور لہجہ میں جواب دیا "آپ بھی معاف کیجئے ثروت پاشا نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں جو چاہوں کھود کر لے جاؤں"
"کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ اس نے تمھیں کب اجازت دی؟"
"کل رات کو"
منصور پاشا کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ثروت پاشا کی لاابالی طبیعت سے یہ بات بعید نہ تھی۔
"میرا نام منصور پاشا ہے اور مجھے آثارِ قدیمہ سے نہایت دلچسپی ہے۔ اگر یہ ٹکڑے آپ کے کام کے نہ ہوں تو مجھے ان کے مل جانے سے بڑی مسرت ہوگی"
لڑکی نے اس کی طرف شوخ نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔
"منصور پاشا صاحب، مجھے خوب معلوم ہے، اور میں بالکل آمادہ ہوں......"

"تم مجھے وہ ٹکڑے دے دوگی؟" پاشا نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔

لڑکی نے آہستہ آہستہ جواب دیا۔" میں اُن کو علیحدہ کرنے پر تیار ہوں، لیکن بقیمت۔"

پاشا نے ہنس کر کہا۔" میں قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہوں۔ کیا قیمت ہوگی؟"

لڑکی کو یہ ہنسی ناگوار ہوئی غور سے پاشا کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔" پورے آٹھ سو ستر ٹکڑے ہیں آپ دو روپیہ فی ٹکڑے کے حساب سے لے سکتے ہیں۔"

منصور پاشا کو اس جواب سے اول تو حیرت ہوئی، پھر وہ حیرت تبسم میں تبدیل ہوگئی۔

"کیا! کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم مجھ سے دو ہزار روپیہ کے قریب وصول کرنا چاہتی ہو۔ شاید تم کو میرے اس فقرے سے غلط فہمی ہوئی کہ وہ ٹکڑے قیمتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ جو لوگ ان کو کھود کر استنبول لے جاتے ہیں وہ دو دو تین تین آنے میں عجائب خانوں میں دے آتے ہیں، دیکھو میں تم کو ایک ٹکڑے کے چار آنے دوں گا۔ اس طرح تم کو دو سو سے زیادہ روپیہ مل جائے گا اور یہ نفع ہی نفع ہے۔"

اب تک لڑکی اس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن آخری جملے پر غصہ کی ایک ہلکی سی لکیر اسکی خوبصورت آنکھوں کے درمیان نمودار ہوگئی۔ اور اُس نے جواب دیا۔

"منصور پاشا، میں بازار کے نرخ کا مقابلہ نہیں کر رہی۔ آپ سے صرف اتنا کہتی ہوں کہ میرے ایک ٹکڑے کی قیمت دو روپیہ ہے اور وہ بھی اس حالت میں کہ آپ فوراً خرید لیں۔"

پاشا کے چہرے سے ہنسی کا اثر غائب ہوگیا۔ اور اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

"مجھے خریداری سے انکار ہے۔ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تم غیر واجب منافع حاصل کرنا چاہتی ہو تم نے ان ٹکڑوں کی کوئی قیمت ادا نہیں کی اور مجھ سے زیادہ سے زیادہ وصول کرنا چاہتی ہو۔ میں....."

وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ خیال آیا کہ اس کا جواب اور لہجہ حدود اخلاق سے باہر ہوگیا ہے۔

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا لیکن اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوگئی۔ پھر یکایک مڑی اور روانہ ہوگئی۔
منصور پاشا پہلے سے زیادہ حیرت کے ساتھ اُس کو دیکھنے لگا۔ قیمت بیشک بہت زیادہ اور ناواجب تھی۔ لیکن کس قدر معصوم چہرہ ہے۔ کس قدر نورانی آنکھیں ہیں۔ اب اس نے اپنے آپ کو ملامت کرنی شروع کی۔ منصور تم بھی بڑے حیوان ہو۔ اخلاق و شرافت کے معنی تم نے کبھی سمجھے ہی نہیں ممکن ہے لڑکی کو روپیہ کی ضرورت ہو۔ کنبہ والی ہو۔ پاشا اس کے پیچھے دوڑنے کے لئے مڑا۔ لیکن لڑکی نظروں سے غائب ہوچکی تھی
منصور پاشاہ واپسی میں اپنے گاؤں منصوریہ میں سے ہو کر گذرا۔ اس کے گاؤں والوں نے جو اس کی رعایا تھے اس کو دیکھا لیکن کوئی استقبال، کوئی اظہار مسرت نہ کیا۔ وہ چھ سال سے غائب تھا۔ اس کی رعایا بس رعایا ہی تھی۔ لوگ اس کو پہچانتے بھی نہ تھے۔ گھر پہونچا۔ لیکن دل مرجھایا ہوا تھا۔ تنہا کھانا کھایا۔ اور تھوڑی دیر بعد نکل گیا ٹہلتے ٹہلتے اسی میدان میں جا نکلا۔ اور سوچنے لگا۔ میں نے کیوں قیمت کا جھگڑا کیا۔ روپیہ کی میرے نزدیک کیا حقیقت ہے۔ یہی سوچتا جارہا تھا کہ سامنے سے کوئی عورت آتی نظر آئی۔ یہ وہی لڑکی تھی اس وقت زنانہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ تو سیدھی گزر جاتی۔ لیکن منصور پاشا سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا۔
معاف کیجئے، آپ کا ایک خط ہے۔"
لڑکی جھجکی، لیکن بچ کر چلے جانے کا موقع نہ تھا۔ خط پاشا کے ہاتھ سے لیا، اور دیکھ کر بولی۔
"اس پر میرا پتہ نہیں لکھا" اصل میں پتہ پر کچھ لکھا ہی نہ تھا۔
پاشا" لیکن یہ تمہارے ہی لئے ہے۔ اور میری طرف سے ہے۔ مجھے تمہارا نام معلوم نہ تھا اس لئے پتہ نہ لکھ سکا۔ اس موقع کا منتظر تھا کہ خود ہی اپنا پوسٹ مین بن جاؤں۔ میں نے آج صبح کی بداخلاقی کی معافی چاہی ہے اور تمہارے شرائط خریداری قبول کئے ہیں۔ واقعی ...."
لڑکی۔ (جلدی سے قطع کلام کرکے) "اب اور معافی کے الفاظ نہ کہئے۔ آپ کو خیال ہوگا کہ میں سخت گیر اور بد معاملہ ہوں۔ لیکن میں نے ان ظروف مدفونہ کو آپ کے آدمی سے بھی قبل دریافت کر لیا تھا۔"

پاشا نے جواب میں سر ہلایا، اور جیب سے چک بک نکال کر ایک ہزار سات سو چالیس روپیہ کی رقم درج کی اور پوچھا۔ کس کے نام چک بناؤں ؟"

لڑکی نے جواب دیا:" لطیفہ خانم کے نام۔ میں فوراً آدمی کے ہاتھ تمام ظروف آپ کو بھیجدوں گی"

منصور پاشا نے چک دیتے ہوئے تشکریہ ادا کیا، اور دونوں جدا ہو گئے۔

دس روز بعد منصور پاشا کو ایک لفافہ ملا جس میں یہ حساب درج تھا اور نیچے لطیفہ خانم کے دستخط تھے:۔

	روپیہ	آنہ	پائی
(۱) منصور یہ گاؤں کی ایک بیوہ سکینہ کے مکان کا کرایہ ادا کیا اور اس کو مکان خالی کرنے کی مصیبت سے بچایا (رسید منسلک ہے)	۱۰۵	۱۲	۰
(۲) منصوریہ کے ۵۰ قحط زدہ غریبوں کو تقسیم کئے گئے (مطابق فہرست منسلکہ)	۱۰۰۰	۰	۰
(۳) منصوریہ کے شفاخانہ کو دیئے گئے (رسید منسلک ہے)	۴۰۰	۰	۰
(۴) مریضوں کی راحت وضرورت کے لئے خریداری کی گئی (مطابق فہرست منسلکہ)	۱۰۰	۰	۰
(۵) منصوریہ کے پبلک ہال کے منیجر کو مرمت کیلئے دیئے گئے (مطابق تخمینہ منسلکہ)	۱۳۴	۴	۰
	۱۷۴۰	۰	۰

یہ تفصیل دیکھ کر منصور پاشا کا دماغ روشن ہو گیا جیسے سورج کے سامنے سے بادل ہٹ جائیں۔ یہ کوئی مذاق نہ تھا۔ بڑی معقول سرزنش تھی۔ اب اس کو خیال آیا کہ میں اس ہفتہ عشرہ میں جدھر نکل گیا گاؤں کے لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ سلام کیا دیکھ کر خوش ہوئے۔ یقیناً یہ بات ہے کہ اس لڑکی لطیفہ خانم نے وہ روپیہ میری ہی طرف سے صرف کیا۔ اور یہ فیاضی مجھ ہی سے منسوب کی۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ اپنی رعایا کی خبر گیری میرا فرض تھا۔ اور میں اس سے غافل تھا۔ بیشک میں چند سال تک غیر حاضر رہا۔ لیکن منیجر کو تو کل اختیارات دیدئے تھے۔ یہ مکان خالی کرانا کیا معنی! کیا میں ایسی ذلیل طبیعت رکھتا ہوں کہ کسی غریب بڑھیا بیوہ کو کرایہ وصول نہ ہونے کے سبب سے جھونپڑی سے نکال دوں۔ لیکن یہ جبر وظلم میری

طرف منسوب کیا گیا ہوگا۔ بہر حال ایجنٹ سے اس کا جواب طلب کرنا چاہئے۔ میں نے لطیفہ خانم کو خود غرض اور دنیا ساز سمجھا تھا۔ کس قدر غلطی تھی!

منصور پاشا کے اسکول ماسٹر نے اس کے متعلق کہا تھا کہ وہ کسی غلطی پر دوبارہ ٹوکنے کا موقع نہیں دیتا اب اس نے ارادہ کرلیا کہ اس صفت کو ثابت کرنے کا یہی موقع ہے۔ اس نے اپنے عالی شان مکان پر نظر ڈالی تو ایک کمی نظر آئی۔ گھر میں دولت و راحت بہت تھی۔ لیکن محبت سے خالی تھا۔ ایک لمحہ میں اس نے ایک عزم قائم کرلیا۔ ٹوپی اور چھڑی اٹھائی اور چل دیا۔ لطیفہ خانم کا مکان اس کے مکان سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا۔

اس وقت منصور پاشا کا دل ندامت معذرت اور محبت کے جذبات سے لبریز تھا چینی کے ٹکڑے اس کو محبت کے ٹکڑے نظر آرہے تھے۔ اور اب وہ ان کو جوڑنے جارہا تھا۔

(مطبوعہ رسالہ عصمت دہلی جولائی ۱۹۳۸ء)

گمشدہ رانی
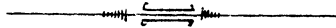
میں اس قدر تھک کر چُور ہوگیا تھا کہ اپنے گھر کے دروازہ میں قدم رکھا تو لڑکھڑا رہا تھا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ اور میں صبح ۵ بجے سے اس وقت تک برابر ڈیوٹی پر تھا۔ تماشائیوں کے ہجوم کو روکنا، ملاحوں اور غوطہ خوروں کی نگرانی کرنا، کوئی آسان کام نہ تھا۔ گاؤں کے ہیڈ کانسٹیبل کی ڈیوٹی کچھ کھیل نہیں ہے۔ لیکن صبح سے شام ہوگئی، ساری نہر کو چھان مارا۔ اور گم شدہ "رانی" کی لاش نہ ملنی تھی نہ ملی۔

بیوی میری یہ خستہ حالت دیکھ کر چیخ اٹھی، تخت پر بیٹھی تھی، فراک سی رہی تھی۔ کپڑا پھینک جلدی سے اٹھی، میرا صافہ اُتارا، پیٹی کھولی۔ اور بولی۔

"تم بالکل بیدم ہو رہے ہو۔ کھانا تیار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کچھ پتہ نہیں چلا، ورنہ تم کہتے ہی"

میں "کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اور اب ایک لمبا سر اس تلاش میں شریک ہے، وہ کہتا ہے کہ رانی ہرگز نہ ملیگی جہاں ہم تلاش کر رہے ہیں"

بیوی جلدی سے باورچی خانہ میں گئی اور گرم دودھ کا بھرا ہوا پیالہ لاکر میرے ہاتھ میں دیا۔ اور بولی "بوٹ اُتارنے سے پہلے اسے پی لو، پھر کھانا کھانا" اتنے مَیں نے دودھ پیا، بوٹ اُتارے، سلیپر پہنے، بیوی نے گرم گرم کھانا لاکر رکھ دیا۔ گاؤں کے پولیس مَین کو بھی جنت کی سی راحت نصیب ہو سکتی ہے اگر میری سی بیوی میسّر ہو۔ یہ عورت صرف اچھی بیوی ہی نہ تھی۔ میں نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اور سب سے زیادہ خود اس پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دست بازو کی کمی کو وہ اپنے دماغ سے پورا کردیتی

تھی۔ کتنی تفتیشوں میں اس نے میری مدد کی ہے۔ میں نے کسی شخص کو ملزم گردانا، اس کے خلاف کافی شہادت موجود تھی، لیکن بیوی نے میری تحقیقات کو باطل کر دیا۔ اور اصلی مجرم کو گرفتار کرنے کے وسائل بتا دیئے۔

لیکن یہ معاملہ جس میں کل سے میں مبتلا رہا معمولی گاؤں کی چوریوں سے جداگانہ تھا۔ کل لکھ پتی سیٹھ دولت رام کی اکلوتی لڑکی پھول وتی، جس کی دولت، خوبصورتی، اور نیک دلی کے سبب اُسے سارا گاؤں "رانی" کہتا تھا، یکایک غائب ہو گئی۔ اور کہیں پتہ نہ چلا۔ شام کو نہر میں اس کی خوبصورت ٹوکری بہتی ہوئی ملی، جس کو وہ گھر سے لیکر نکلی تھی۔ یہ بات سارے گاؤں میں مشہور تھی کہ نوجوان ڈاکٹر ہمت سنگھ اور رانی میں محبت ہے۔ اور سیٹھ جی اس سے بہت ناراض ہیں۔ اس حالت میں ننّو میں سے ننانوے کانسٹبل اسی نتیجہ پر پہونچتے جس پر میں پہونچا کہ رانی نے اس محبت کے سبب سے نہر میں گر کر جان دیدی۔

جب میں کھانے سے فارغ ہو گیا تو بیوی نے کہا "اور وہ لمبا سرکس کا ہے جس کو تمہاری غلطی کا ایسا یقین ہے؟ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہوں گے؟"

میں۔ صاحب کی تو یہی رائے ہے جو میری ہے، نہیں وہ صاحب سے بھی زیادہ بڑا آدمی ہے شہرت یار خاں نام ہے دہلی سے آیا ہے۔ سیٹھ نے آج صبح تار دے کر بلایا ہے۔ میں نے پہلے کبھی اس کا نام نہیں سُنا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑے بڑے راز سربستہ کھول کر رکھ دیتا ہے"

بیوی۔ پرائیویٹ سراغرساں معلوم ہوتا ہے، نالائق ہوگا۔ یہ سب کے سب احمق ہوتے ہیں"

سیٹھ کے نوکروں نے شہرت یار خاں کی ایسی لمبی چوڑی تعریفیں کی تھیں۔ اور خود خاں صاحب نے ایسی وون کی لی تھی کہ میں اُن کی حمایت کرنے لگا۔

میں" وہ اپنے آپ کو پرائیویٹ ڈیٹکٹو نہیں کہتا، بلکہ ماہر جرائم کہتا ہے"

بیوی۔ وہ ایک ہی بات ہے۔ خیر اس کو جانے دو کہ اس کا نام کیا ہے۔ یہ بتاؤ اس نے کام کیا کیا؟

میں۔" اس کی تحقیقات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہمت سنگھ کل تمام دن گاؤں سے غائب رہا۔ آگرہ گیا ہوا تھا

رانی ہلاک نہیں ہوئی، بلکہ خود اپنی خوشی سے آگرہ گئی ہے کہ ڈاکٹر سے جا ملے، اور خفیہ طور پر شادی کر لے، ٹوکری دھوکا دینے کے لئے نہر میں ڈال گئی ہے۔"

بیوی نے اس عرصہ میں پھر فراک سینا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات سُن کر ٹھیر گئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ لیکن مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ کچھ سوچ رہی تھی۔ چند سکنڈ تک اس کی یہ حالت رہی۔ پھر یکایک فراک اور سوئی ہاتھ سے رکھ کر سنبھل بیٹھی اور بولی، "میں یہ تمام واقعہ سُننا چاہتی ہوں۔ بالکل شروع سے بیان کرو خاص کر یہ بات معلوم کرنی ہے کہ شہرت یار خاں نے کس طرح کام شروع کیا، اور کیونکر یہ رائے قائم کی۔"

مجھے اس واردات کا حال دُھرانا پڑا۔ اس لئے کہ شروع کا واقعہ تو بیوی کو معلوم ہی تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ رانی کل صبح کو دس بجے کے قریب گھر سے روانہ ہوئی۔ سیٹھ جی سے کہہ دیا، کہ لالو نمبردار کی بیوی رکمنی بہت بیمار ہے، نمونیا ہو گیا ہے، اس کو دیکھنے اور کچھ چیزیں دینے جاتی ہوں۔ یہ کہہ کر ٹوکری لے کر اچھی خاصی خوش خوش گھر سے چلی۔ غریبوں کی خاطر مدارات، بیماروں کی دیکھ بھال، گاؤں والوں کے بچوں سے پیار محبت۔ رانی کا دن رات کا شغل تھا۔ کوئی بات نہ تھی۔ باپ کو کیا شبہہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ایک دو بجے تک لوٹ کر نہ آئی تو سیٹھ نے لالو کے گھر آدمی بھیجا، معلوم ہوا وہاں گئی ہی نہیں۔ اب سیٹھ کو تشویش ہوئی۔ تمام نوکروں کو پہرہ داروں کو سارے گاؤں میں اور دور دور بھیجا۔ شام کو ۶ بجے مغرب کے بعد آدمی ٹوکری لے کر آیا اور کہا کہ نمبردار کے گھر سے تین سو گز کے فاصلے پر یہ ٹوکری نہر کے کنارے کے پودوں میں اُلجھی ہوئی پڑی تھی۔ اس کے بعد سیٹھ نے مجھے بلایا، لیکن اندھیرا ہو جانے کے سبب سے کچھ کام نہ ہو سکا۔ میں نے خود نمبردار کے گھر جا کر دریافت کیا، اس کی بیوی سخت بیمار تھی اور کل تمام دن رانی کا انتظار کرتی رہی۔ رانی پہلے تو اکثر اس کے پاس جاتی تھی۔ لیکن کل بیماری کی خبر بھیجی اور بلایا تو بالکل آئی ہی نہیں۔ اس کے بعد میں نے ملاحوں، غوطہ خوروں اور مزدوروں کا انتظام کیا کہ دن نکلتے ہی نہر میں تلاش کیا جائے۔ اسلئے کہ رانی کو اپنے گھر سے نمبردار کے گھر جانے میں تھوڑی دُور نہر کے کنارے کنارے چلنا ضرور پڑتا تھا۔ رانی پھول

کی عاشق تھی، ممکن ہے نہر کے کنارے پھول توڑنے کو جھکی ہو اور گر پڑی ہو۔ میں نے خودکشی والا خیال بیوی کے سامنے بیان نہ کیا اس لئے کہ اس کا کوئی ثبوت نہ تھا۔

یہ سب حالات بیوی کو معلوم ہی تھے، آج کی کارروائی یہ تھی کہ میں نے صبح نماز کے وقت سے نہر کی تلاشی شروع کرا دی۔ سیٹھ جی اوّل وقت سے موجود رہے۔ صاحب سپرنٹنڈنٹ کو میں نے رات ہی میں آدمی بھیجکر اطلاع کر دی تھی۔ وہ خود مع انسپکٹر اور سب انسپکٹر وغیرہ کے دن نکلے آ گئے تھے۔ لیکن دس بجے تک کوئی نتیجہ نہ نکلا تو سیٹھ نے دہلی تار دے کر شہرت یار خاں کو بلایا۔ تیسرے پہر کو خاں صاحب آ گئے، اس عرصہ میں میں نے نہر کے اندر اور باہر، گاؤں کے اندر اور باہر تحقیقات برابر جاری رکھی۔ نہر کے کنارے پر کہیں ایسا نشان نہ پایا گیا جس سے رانی کے کنارے پر آنے کا شبہ ہوتا۔ گاؤں کے سب مقامات پر، ریلوے اسٹیشن پر، ہر جگہ تحقیق کیا لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ شہرت یار خاں نے یہ تحقیقات سُن کر مجھے بہت شاباش دی کہ تم نے بڑا کام کر لیا اور بڑی محنت بچا دی۔ خانصاحب آتے ہی سیٹھ جی سے ملے ہوں گے، اور سیٹھ جی نے سب حال بتا کر یہ بھی ضرور کہدیا ہوگا کہ رانی اور ڈاکٹر میں محبت تھی اور سیٹھ جی کو یہ بات پسند نہ تھی۔ چنانچہ خاں صاحب نے شروع ہی سے یہ رائے بیان کی کہ رانی نہر میں ہرگز نہیں گری، نہ دھوکے سے نہ ارادے سے۔ بلکہ دیدہ و دانستہ روپوش ہے۔

نوجوان ڈاکٹر ہمت سنگھ نے سال بھر ہوا گاؤں میں ڈاکٹری شروع کی تھی، اور اس عرصہ میں صرف رانی ہی کو مسحور نہیں کیا تھا۔ بلکہ پرانے بوڑھے ڈاکٹر حکم سنگھ کے بہت سے مریض بھی چھین لئے تھے۔ گاؤں میں برسوں سے اکیلے ڈاکٹر، حکم سنگھ ہی تھے۔ سارے گاؤں والے انھیں کے پاس جاتے تھے۔ ڈاکٹر ہمت سنگھ جو آئے تو حکم سنگھ سے محنتی اور مستعد زیادہ، پھر بڑے خلیق، ہمدرد، خوش مزاج، آدھی رات کو سوتے سے اُٹھ کر ایک چمار کے گھر جانے میں عذر نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے سے زیادہ گاؤں حکم سنگھ سے ٹوٹ کر ہمت سنگھ کی طرف آ گیا، اس پر طرہ یہ ہوا کہ سیٹھ دولت رام نے بھی اپنا فیملی ڈاکٹر حکم سنگھ کو چھوڑ کر ہمت سنگھ کو مقرر کر لیا لیکن

سیٹھ جی ڈاکٹر کے علاج اور اخلاق سے کیسے ہی خوش سہی، اس قسم کے آدمی نہ تھے کہ ڈاکٹر سے اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ کردیں۔ سیٹھ جی لکھ پتی تھے، امیر کبیر تھے۔ اونچی اُونچ کے آدمی تھے، رانی ایک ہی اولاد تھی، ساری دولت اور جاگیر جائداد اسی کے لئے تھی، سیٹھ چاہتے تھے کہ کسی راجہ مہاراجہ سے نہیں تو اپنے ہی برابر کسی سیٹھ ساہوکار یا کلکٹر مجسٹریٹ یا رائے بہادر سے بیاہ کریں۔ بلکہ کوئی موٹی اسامی تاک بھی رکھی تھی۔ لیکن لڑکی بھی ارادے کی پکی تھی، ڈاکٹر سے ملتی رہتی تھی اور باپ سے بھی زبان سر سے یا زبانِ حال سے اپنا عندیہ بیان کر دیا تھا۔

سیٹھ نے شہرت یار خاں سے یہ حالات جس قدر بھی بیان کئے ہوں، اُن کو سُنکر خانصاحب اپنے ساتھی کو لے کر نہر سے چلے گئے سُنا ہے یہ موٹا بھدا رفیق ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا ہے اور ان کے کارنامے لکھ کر چھپوا تا ہے۔ دیر کے بعد جب یہ دونوں پھر واپس نہر پر آئے اور سیٹھ سے باتیں کیں تو سیٹھ نے مجھے بُلایا۔

سیٹھ (مجھ سے مخاطب کر) دیوان بہادر علیخاں اب نہر کی کھنگال بند کراؤ۔ بیکار وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ لڑکی اس بدمعاش فریبی ڈاکٹر کے ساتھ چلی گئی۔ خاں صاحب نے دریافت کر لیا کہ ڈاکٹر کل صبح پونے نو بجے کے پسنجر سے آگرہ گیا ہے اور اب تک واپس نہیں آیا۔ پھول وتی اسٹیشن تک پیدل گئی ہو گی۔ اور دوپہر کی گاڑی سے روانہ ہو گئی ہو گی اور ڈاکٹر سے جا ملی ہو گی میں۔ کیا ڈاکٹر ہمت سنگھ کے ملازم مزید حالات نہیں بتا سکتے ؟

سیٹھ۔ (تیز لہجے سے) نہیں بتا سکتے یا نہیں بتاتے۔ کہتے ہیں کہ ہم کو کچھ خبر نہیں ڈاکٹر کیوں گئے ہیں اور کب آئیں گے بہر حال اب خاں صاحب خود تحقیقات کے لئے آگرہ جاتے ہیں۔

اُس کے بعد سیٹھ نے اپنے آدمیوں کو دوڑایا کہ خاں صاحب کے اسٹیشن جانے کے لئے گاڑی تیار کرو اور خود بھی مع مہمانوں کے چلے گئے۔ لیکن میں نے نہر کی تلاش مغرب کے بعد تک جاری رکھی۔

میرا بیان ختم ہوا تو بیوی دیر تک ساکت رہی، گھٹنوں پر کہنیاں اور ہاتھوں پر سر رکھے بیٹھی رہی

پھر یکایک سر اُٹھایا، اور اپنی عادت کے مطابق میری طرف ہاتھ جھٹک کر بولی، "خانصاحب، تمہارے سر میں گُودا کم ہے، اور وہ تمہارا شہرت یار خاں تو بالکل احمق ہے۔ عقل کے بٹتے وقت سر کھجارہا تھا، بہرحال ہو تم دونوں غلطی پر۔ اچھا مجھے اور سوچنے دو۔" یہ کہہ کر پھر اسی طرح بیٹھ گئی۔ پھر تھوڑی دیر میں سر اُٹھایا۔

بیوی۔ اچھا، یہ شہرت یار خاں کس قسم کا آدمی ہے؟

میں۔ بہت شاندار، بھاری بھرکم، قیمتی بوٹ، ریشمی صافہ، ہمچو ما دیگرے نیست۔"

بیوی۔ ٹھیک ہے میرا یہی خیال تھا۔ یقیناً وہ شخص احمق ہے جو ہماری رانی کو کہاری اور باورچن کے برابر سمجھتا ہے۔ بھاگ جانا رذیل لوگوں کا کام ہے۔ رانی کے متعلق اس کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اور تم نے بھی خانصاحب بہادر، کچھ عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ یہ فرض کرکے کہ رانی نے خدانخواستہ خودکشی کرلی۔ یقین جانو اس کام میں ڈاکٹر حکم سنگھ کا ہاتھ ہے۔ جھوٹ نکلے تو میرا نام بدل کر رکھ دینا۔ اچھا اب تم صافہ باندھ لو، اور وردی ڈاٹ لو۔ اتنے میں بچوں کو دیکھ لوں کہ اچھی طرح سو رہے ہیں۔ پھر تم ذرا میرے ساتھ چلو۔

میں بیوی کے انداز سے واقف، اور "حرکتوں" کا عادی تھا، سمجھ گیا کہ یہ ابھی کچھ نہ بتائیگی۔ جب چلنے لگے گی تو کہے گی۔ یہاں گاؤں میں پردہ کا رواج نہ تھا۔ اور ہم دونوں بھی ذرا آزاد خیال ہوگئے تھے، لیکن ریاست رامپور کے رہنے والے تھے، بیوی بے ضرورت باہر نہ نکلتی تھی، اور ضرورت پر جاتی تھی تو برقع پہن کر۔ لیکن موقع محل پر مردوں سے بات چیت کرنے میں ہم دونوں کچھ مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔ میں اپنی طبیعت سے جیسا سنجیدہ تھا، بیوی ویسی ظریف واقع ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں ایک دوسرے پر ایسا اعتماد تھا کہ بدگمانی کے لئے کوئی راہ ہی نہ تھی۔ بیوی کی سراغرسانی اور تفتیش کی قابلیت معلوم ہوئی، اور اُس نے خود شوق ظاہر کیا تو پہلے تو مجھے نئی سی بات معلوم ہوئی اور دل نے گوارا نہ کیا کہ پردہ نشین شریف زادی سپاہیوں کی طرح دوڑ دھوپ کرے۔ لیکن ایک دن باہم گفت و شنید ہوکر یہ معاملہ طے ہوگیا۔

بیوی برقع پہن کر نکلی اور جلدی، میں ساتھ ہولیا۔ میں منتظر کہ کچھ بتائے کہاں جارہی ہے اور وہ ہے کہ چلی جارہی ہے۔ چلتے چلتے ڈاکٹر ہمت سنگھ کے مکان پر ٹھیری۔ ڈاکٹر صاحب ہم سے قریب ہی رہتے تھے۔ بیوی نے دروازے پر ہاتھ مارا اور مجھ سے بولی، "تم کچھ نہ بولنا۔ میں کہہ سُن لوں گی" ڈاکٹر کے آدمی نے دروازہ کھولا اور میری وردی کو دیکھ کر جھجکا لیکن کوئی مزاحمت کی۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ نوکر نے کہا ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔ ابھی گھنٹہ بھر ہوا آگرہ سے آتے ہیں۔ آپ مطب میں چل کر بیٹھیے، لیکن ہماری آواز سن کر ڈاکٹر اپنے کمرے سے نکل آئے۔ ڈاکٹر کے چہرے سے رنج وغم ٹپک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی یقین ہوگیا کہ ڈاکٹر جس کام کے لئے آگرہ گیا ہو، شادی کرنے کے لئے ہرگز نہیں گیا تھا۔ ایک دن کا بیاہا ایسی مُردہ دلی کی تصویر نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر۔ آیئے، میرے کمرے میں آجایئے، آپ علاج کی غرض سے نہیں آئے، معلوم ہوتا ہے اس نئے حادثہ کے سلسلے میں آئے ہیں۔ کچھ پتہ چلا؟

بیوی۔ (ڈاکٹر کو غور سے دیکھ کر، اور مجھ سے مخاطب ہوکر) دیکھو میں نے کیا کہا تھا کہ شہرت یار خاں نرا احمق ہے۔ (پھر ڈاکٹر سے) رانی کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ لیکن ہم رانی کو ڈھونڈ نکالنے کی غرض سے آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کو رانی کے غائب ہونے کی خبر کب معلوم ہوئی؟

مجھے اُمید تھی کہ ڈاکٹر اس سوال پر سٹ پٹا جائے گا۔ لیکن اُس نے فوراً جواب دیا۔

ڈاکٹر۔ ابھی جب میں گھر پہونچا۔

بیوی۔ ڈاکٹر صاحب، ہم سے کچھ چھپایئے نہیں، ہم آپ کے اور رانی کے خیر خواہ ہیں۔ آپ کو اپنے ملازموں سے معلوم ہوا ہوگا کہ سیٹھ جی کو ان کے فوق البھڑک ماہر جرائم نے کیا سکھا پڑھا دیا ہے۔ دیوان جی (میری طرف اشارہ) کو اس سے اتفاق نہیں ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ رانی نہر میں ڈوب گئی۔ لیکن مجھے دونوں سے اختلاف ہے۔

ڈاکٹر (کرسی پر بیٹھ کر اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر) دیوان جی کا خیال صحیح ہے۔ میری رانی کہیں نہر کی تہ میں پڑی ہوگی۔ اور میں .... لیکن نہیں، اس کی خاطر میں نہ بتاؤں گا کہ مجھے اس کے ڈوب جانے کا کیوں یقین ہے۔

میں حیران رہ گیا یہ دیکھ کر کہ بیوی یہ سن کر جلدی سے اُٹھی اور ڈاکٹر کا شانہ ہلا کر بولی۔

بیوی۔ ڈاکٹر یہ ایک طرح کا اقبال جرم ہے۔ اگر آپ پوری بات صاف صاف نہ بتائیں گے تو میں دیوانجی سے کہوں گی کہ آپ کو حراست میں لے لیں۔

ڈاکٹر۔ (بیوی کی طرف دیکھ کر) اگر تم یہ حکم دو گی تو میں اُس کے نتائج کو برداشت کرنے کی کوشش کروں گا۔

بیوی۔ بیوقوف ہیں آپ! (پھر فوراً لہجہ بدل کر) ڈاکٹر صاحب، خدا کے لئے ہم کو اپنا ہمدرد سمجھئے دیوان جی اس وقت کچھ اپنی ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔ اور میں ذمہ لیتی ہوں کہ وہ رانی کے یا آپ کے خلاف ایک لفظ زبان سے نہ نکالیں گے (پھر ڈاکٹر کے قریب جھک کر) مجھے یقین ہے کہ یہ کارستانی ڈاکٹر حکم سنگھ کی ہے۔ انتقام کی غرض سے۔

ڈاکٹر۔ (چونک کر، اور ہم دونوں کی طرف دیکھ کر) یہ بات ہے تو رانی کہاں ہے۔

بیوی۔ اگر رانی زندہ ہے تو یقیناً خطرے میں ہے۔ کہاں ہے، یہی تو دریافت کرنا ہے۔ لیکن بغیر آپ کی مدد کے کچھ نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر۔ (اس نئے خوف سے کانپ رہا تھا) بیشک مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ اب آپ لوگ جو چاہیں نتیجہ نکالیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تمہارے شوہر اور شہرت یار خاں کی رائے صحیح ہے۔ رانی مجھ سے آگرہ میں ملنے کے لئے چلی تھی اور اسٹیشن جاتے میں نہر میں گر پڑی ہوگی۔ لو دیکھو۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے ایک خط جیب سے نکال کر بیوی کو دیا جس کو میں نے بھی جُھک کر پڑھا۔ یہ مضمون تھا:۔

"سیٹھ جی کی سختی اب ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ کل پونے نو بجے کی گاڑی سے آگرہ روانہ ہو جاؤ۔ میں دوپہر کی گاڑی سے چلوں گی کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ مجھے راجہ منڈی اسٹیشن پر ملنا۔ وہیں کسی اچھے ہوٹل میں ٹھیرنے کا بندوبست کر لینا۔ اُمید ہے کہ شادی کا انتظام شام تک ہو جائے گا۔ آگرہ میں تمہارے تعلقات کافی ہیں۔ اس کے بعد تم رات ہی میں گاؤں واپس چلے آنا۔ اور پھر دو ایک دن بعد میرے پاس آجانا۔

تمہاری رانی"

اس کے بعد ڈاکٹر نے جو حالات بیان کئے اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر کو رانی کا یہ خط ملا تو اُسکو بڑا تعجب ہوا، اور یہ بات بالکل خلاف اُمید نظر آئی۔ دو ایک دن پہلے ڈاکٹر کی رانی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت ایسے ارادے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ اور یہ بات بھی رانی کی طبیعت سے بعید تھی کہ وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے باپ سے ہمیشہ کے لئے جدائی ہو جاتے۔ بلکہ دونوں کو اُمید تھی کہ رفتہ رفتہ سیٹھ جی نرم ہو جائیں گے اور اس رشتہ کو منظور کر لیں گے۔ لیکن بقول ڈاکٹر کے اس خط کے بعد بجز اس کی تعمیل کے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر نے حرف بحرف اس پر عمل کیا۔ آگرہ میں اس ٹرین کو دیکھا، رانی نہ آئی۔ اس کے بعد سب گاڑیاں دیکھیں۔ پھر دوسرے دن صبح کو شروع کی گاڑیوں پر اسٹیشن پہونچا۔ پھر رانی نہ آئی تو دوسرے اسٹیشنوں اور ہوٹلوں کی دیکھ بھال میں صرف کیا۔ یہ خیال کیا ممکن ہے رانی دوسرے راستہ سے ٹونڈلہ کی طرف سے آجاتے۔ آخر اس جستجو میں سارا دن گزر گیا اور رات کو واپس پہونچا۔ اسٹیشن پر یہ واقعہ سُنا، پھر گھر آکر نوکروں سے مفصل معلوم ہوا۔ جب سراغرساں کی یہ رائے سنی کہ رانی ڈاکٹر کے پیچھے فرار ہوئی ہے تو ڈاکٹر کو بڑا صدمہ ہوا، اور اُس نے ارادہ کر لیا کہ خط کا ذکر کسی سے نہ کرے گا لیکن ڈاکٹر نے نوکری کا حال سُن کر یہ تسلیم کر لیا کہ بے شک رانی نہر میں گر گئی ہو گی۔ تاہم خط

کے ظاہر کرنے سے رانی کی بھی بدنامی ہوتی اور اس کے باپ کو بھی صدمہ ہوتا اس لئے ڈاکٹر نے سارا الزام اپنے سر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس عرصے میں وہ خط بیوی کے ہاتھ میں رہا۔ جب ڈاکٹر کا بیان ختم ہوا تو بیوی نے خط ڈاکٹر کو دیا اور کہا

بیوی۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ تحریر رانی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے؟

ڈاکٹر۔ میں نے خط کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ ہمارے درمیان خط وکتابت کی کچھ بہت ضرورت نہ ہوتی تھی۔ یہ کاغذ تو وہی ہے جس پر رانی لکھا کرتی تھی .... لیکن ....

بیوی۔ (جلدی سے) تحریر رانی کی نہیں ہے۔ یہی بات ہے نا۔ مجھے بھی اندیشہ ہوا تھا۔ اب میرا دعویٰ ہے کہ یہ خط ڈاکٹر حکم سنگھ نے لکھا ہے اور رانی اس وقت اسی کے قبضہ میں ہے۔ اُس "برادر شغال" نے پہلے سے اندازہ کر لیا تھا کہ یہی قیاس قائم کیا جائے گا۔ جو سراغرساں نے سیٹھ کو سمجھایا، آپ اس خط کو پیش کریں یا نہ کریں۔ کتنا ہی کہیں کہ آپ نے رانی کو نہیں دیکھا اور کچھ خبر نہیں۔ لیکن سیٹھ یہی سمجھیں گے کہ آپ نے اس کو آگرہ میں کہیں چھپا دیا ہے۔ نتیجہ ہر حال میں یہی ہوگا کہ آپ کی ڈاکٹری کو داغ لگ جائے گا۔ پریکٹس تباہ ہو جائے گی۔ یہی بڈھے ڈاکٹر کا مقصد ہے۔

ڈاکٹر۔ لیکن اس کے یہ معنی ہیں کہ حکم سنگھ رانی کو ہمیشہ چھپائے رکھے گا۔ کیا ایسا تو نہیں ہو سکتا ..... کہ ہلاک کر دے؟

میں۔ اور ٹوکری کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا حکم سنگھ نے ٹوکری نہر میں ڈالدی کہ لوگ رانی کو بیوقوف بھی سمجھ لیں؟

بیوی۔ (میری طرف غصّے سے دیکھ کر) نہیں، میرا یہ خیال نہیں ہے۔ میری رائے میں خود رانی نے ٹوکری نہر میں پھینکی ہے۔ اور ایک وجہ سے پھینکی ہے۔ جو ابھی تھوڑی دیر میں تم کو معلوم ہوئی جاتی ہے۔ اب آپ دونوں مہربانی کر کے میرے ساتھ آئیے۔ ہم نمبردار کے گھر اس کی بیوی کی خیر صلا

معلوم کرنے چلتے ہیں۔

اب بیوی کا مطلب میری سمجھ میں آگیا۔ لیکن ڈاکٹر ایسا بدحواس اور پریشان تھا کہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس نے کہا کہ مریض کے پاس بے بلائے جانا پیشہ کے خلاف بات ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر حکم سنگھ اس کا معالج ہو۔ لیکن بیوی نے جلدی سے ڈاکٹر کی ٹوپی اٹھا کر اس کو دی اور چلنے کا اشارہ کیا۔ اور بولی کہ "تین دن پہلے تک نمبردار کی بیوی اپنی ساری عمر میں ایک گھنٹہ کے لیئے بھی بیمار نہیں ہوئی ہے۔ خوب ہٹی کٹی۔ ہتنی کی ہتنی ہے۔ دیوان جی نمبردار کے پہلے کارناموں سے خوب واقف ہیں۔ لیکن جب تک وہ اپنا چال چلن درست رکھے اُن کو کچھ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔" اور واقعہ بھی یہی تھا۔ نمبردار پولیس کی نظر میں مشتبہ تھا۔

یہ کہتے ہوئے ہم سب ڈاکٹر کے گھر سے نکلے ہی تھے کہ یکایک شہرت یار خاں اور ان کے دوست کا سامنا ہوگیا۔ خاں صاحب ڈاکٹر ہی کے پاس آ رہے تھے۔ اور کامیابی پر خوش نظر آ رہے تھے لیکن میری وردی کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

شہرت یار خاں۔ (میری طرف غصے سے دیکھ کر) کیا تم نے ڈاکٹر ہمت سنگھ کو گرفتار کرلیا ہو؟

میں۔ نہیں جناب، ڈاکٹر صاحب کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔

شہرت یار خاں۔ اچھا تو میں ڈاکٹر سے چند سوال کروں گا (ڈاکٹر سے) جناب میں آج تمام دن آپ کے سراغ میں رہا ہوں۔ آگرہ کے سب اسٹیشنوں پر پتہ لیتا ہوا آپ کے پیچھے پیچھے دوسری ٹرین سے آیا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ صاف اقرار کرلیں؟

بیوی۔ (جلدی سے آگے بڑھ کر) جناب شہرت یار خاں صاحب۔ آپ اپنے آپ کو ماہر جرائم کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت آپ ایک بڑے سنگین جرم کی اعانت کے مرتکب ہوں گے اگر یہاں کھڑے باتیں بناتے رہیں گے۔ دیوان جی خدا کے واسطے آگے بڑھئے اور نمبردار کے گھر چلئے۔

شہرت یار خاں ۔ (بلند آواز سے) میں کسی پاگل خانہ سے بھاگے ہوئے دیوانہ کی باتوں میں آکر اپنے فرض کی انجام دہی سے باز نہیں رہ سکتا۔

میرے جی میں تو آیا کہ خانصاحب کے ایک ہاتھ رسید کروں لیکن ضبط کر گیا، ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر بڑھا اور خاں صاحب سے کہا "ہم اسی گم شدہ لڑکی کے معاملہ میں ایک جگہ جارہے ہیں، اگر آپ چاہیں تو ہمارے ساتھ آسکتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو خبردار کئے دیتا ہوں کہ میری بیوی کی باتوں میں دخل نہ دیجئے گا"

پولیس کی وردی میں بھی ایک تاثیر ہوتی ہے جس سے بڑے سے بڑا ماہر جرائم بھی مرعوب ہو سکتا ہے خاں صاحب بر برائے تو بہت اور ان کے وقائع نگار رفیق کو تو گویا دورہ سا پڑنے والا تھا۔ لیکن دونوں ہمارے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

نمبردار کا گھر آبادی کے ختم پر نہر کے کنارے واقع تھا۔ نہر اس کی ایک دیوار کے نیچے بہتی تھی اور پھر آگے ختم کیا گئی تھی۔ ہم قریب پہونچ رہے تھے کہ یکایک بیوی نے ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور دوسرے سے ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اور آہستہ سے بولی "حکم سنگھ اس وقت نمبردار کے گھر موجود ہے"!

اب ہم سب نے دیکھ لیا کہ مکان سے ذرا فاصلے پر حکم سنگھ کی گھوڑا گاڑی کھڑی ہے۔ ہم آہستہ سے دروازے تک آئے۔ دروازہ بند تھا گھوم کر دوسری طرف گئے۔ پشت کا دروازہ بھی بند تھا لیکن پاس کی کھڑکی ذرا سی کھلی ہوئی تھی۔ بیوی نے کہا اس کے ذریعہ سے اندر جا سکتے ہیں میں نے کہا، ہم پانچوں کا جانا ٹھیک نہیں اس وقت بیوی نے ذہن کی رسائی کا کمال ثبوت دیا۔ خاں صاحب کے پاس جاکر نہایت تہذیب سے کہا "خاں صاحب میں اور دیوان جی گھر کے اندر جاتے ہیں۔ آپ اور آپ کے دوست یہاں ٹھیرے رہیں۔ اور اس شخص کو اپنی نگرانی میں رکھیں جس کی آپ نے سارے دن بڑی قابلیت اور محنت کے ساتھ سراغرسانی کی ہے۔ ایسا نہ ہو یہ فرار ہو جائے یا کچھ گڑبڑ کرے۔ ہم باہر آکر

آپ کو رپورٹ دیں گے اور معاملہ کو آپ کے سپرد کر دیں گے۔" یہ کہہ کر بیوی نے ہٹ کر ڈاکٹر سے آہستہ سے کہا:" اچھے ڈاکٹر صاحب، میری بات رکھ لینا۔"

ڈاکٹر آخر سمجھ دار آدمی تھا، بات کو پہونچ گیا، اور خاں صاحب تو اس خوشامد سے پھول گئے۔ ان کو مایوسی اسی سے تھی کہ معاملہ اُن کے ہاتھ سے نکلا جاتا تھا۔ اب اُمید ہوئی کہ پھر باگ ان کے ہاتھ میں آجائے گی تو راضی ہو گئے اور دونوں نے ڈاکٹر کو اپنے بیچ میں لے لیا۔ ڈاکٹر بھی خاموش کھڑا رہا۔

بیوی۔ (میرے پاس آکر) ان تینوں سے تو نجات ملی۔ اب تم کو اپنے بُوٹ اُتارنے پڑیں گے۔

میں۔ میں بوٹ پہنے ہی نہیں ہوں۔ گھر سے چلنے کے لئے جب تم نے کہا تھا تو صافہ اور وردی کا حکم دیا تھا۔ بوٹ کا حکم نہیں دیا تھا، اور میں سلیپر پہنے ہوئے تھا۔

بیوی نے محبت بھری نظر مجھ پر ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر ہاتھ بڑھا کر ہلکے سے کھڑکی کھولی۔ اندر اندھیرا تھا۔ بیوی پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اوپر کو اُچکی میں نے جلدی سے اُٹھا کر اونچا کر دیا وہ کھڑکی پر چڑھ کر اندر اُتر گئی۔ میں بھی اسی راستے سے اندر جانے کو تھا کہ بیوی نے آہستہ سے دروازہ کھولدیا اور میں بھی داخل ہو گیا۔ ہم دونوں ٹٹولتے ہوئے بڑھے۔ کمرے کا اندر کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ اس سے باہر نکلے اگدرہ سا تھا، اس میں سے ہو کر ایک بڑے کمرے میں آئے۔ یہاں باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ اندر کا چھوٹا کمرہ بند تھا، لیکن کواڑوں میں دڑاڑیں تھیں ان میں سے جھانک کر دیکھا۔ اندر روشنی تھی۔ ڈاکٹر حکم سنگھ چھوٹی سی چوکی پر بیٹھا تھا۔ نمبردار اس کے پاس کھڑا تھا اور انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سر پر تعینات ہے۔ نمبردار کی بیوی زمین پر دری کے اوپر بیٹھی تھی، اور تندرستی کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی، ڈاکٹر کے سامنے ایک تھالی رکھی تھی جس میں پوریاں ترکاری اور دودھ کا پیالہ تھا۔

ڈاکٹر حکم سنگھ:" نمبردار سمجھ گئے؟ میں اس دودھ میں نیند کی دوا ملاتا ہوں۔ یہ لڑکی کو پلادو وہ تھوڑی دیر میں سو جائے گی۔ آہستہ سے اُٹھا کر گاڑی میں لٹا دو اور تمہاری بیوی

اور وہ دوسری عورت اس کو لے کر کلکتہ چلی جاتے۔ وہاں میں نے لڑکی کو پوشیدہ رکھنے کا بندوبست کر دیا ہے تمہاری بیوی کو پھر سمجھا دوں گا۔

نمبردار۔ اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے دو سو روپیہ اور لیں گے۔

ڈاکٹر۔ تم نے جو اپنے منہ سے مانگا تھا وہ میں نے پہلے ہی دیدیا ہے۔ اب یہ کیا کہتے ہو؟

نمبردار۔ ڈاکٹر جی اب آپ ہمارے ہاتھ میں ہو۔ ہم جو اور مانگیں گے دینا پڑیگا۔ نہیں تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

ڈاکٹر۔ (مجبور ہو کر) اچھا تمہارا ہی کہنا سہی (جیب سے بٹوا نکال کر) لو جو مانگتے ہو اور لو۔

ڈاکٹر نے نوٹ گن کر نمبردار کے ہاتھ میں دیئے۔ اور جیب میں سے ایک شیشی نکال کر دودھ کے پیالے میں الٹ دی۔ نمبردار کی بیوی تھالی اٹھا کر باہر آنے لگی۔ ہم دونوں جلدی سے آڑ میں ہو گئے۔ وہ فوراً باہر نکل گئی۔ ہم بھی ایک لمحہ بعد نکلے تو زینہ پر چڑھنے کی آواز آئی ہم ذرا دیر ٹھہر کر زینہ پر چڑھے۔ چھت پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، اس میں باہر سے قفل لگا ہوگا۔ نمبردارنی قفل کھول کر اندر گئی ہی تھی کہ ہم چھت پر پہونچے، اور کمرے کے پاس آکر کان لگائے۔ رانی کی آواز آئی۔

رانی۔ کمبخت عورت تونے بھوکا مار دیا۔

نمبردارنی۔ دیر ہے اندھیر نہیں۔ لو اب کھالو۔ دودھ ہے، پوری ترکاری ہے۔

میں یہ سنتے ہی دروازہ کھول کر گھس گیا۔ دیکھا کہ رانی لکڑی کے صندوق پر بیٹھی ہے، روتے روتے آنکھیں سوج گئی ہیں۔ اس نے جلدی سے دودھ کے پیالہ کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ میں نے کہا "رانی اس کو نہ چھونا۔ اس میں زہر ہے" اب دونوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور میری وردی پر نظر پڑی، دونوں کے چہروں کا مقابلہ لفظوں میں ادا کرنا مشکل ہے۔ ایک خوشی سے سُرخ، دوسرا خوف سے سفید۔ لیکن نمبردارنی نے حواس قائم رکھے۔ میں ہاتھ بڑھانے نہ پایا تھا کہ اس نے پھرتی سے دودھ کا پیالہ اٹھا کر کھڑکی میں سے

نیچے پھینک دیا۔ اسی دیوار کے نیچے نہر بہ رہی تھی۔ پیالہ نہر میں جا پڑا۔ پھر ایک زور کا وحشت ناک قہقہہ مارا اور روشنی کی بتی میں پھونک مار کر زینہ کی طرف بھاگ گی۔ میری بیوی دروازے میں کھڑی تھی اس نے کمرے کے اندر آ کر جلدی سے نیم بیہوش لڑکی کو سنبھال لیا۔ اب ہم دونوں لڑکی کو سنبھالے ہوئے اندھیرے میں نیچے اُترے اور اُسی کمرے میں پہونچے، وہاں بالکل خاموشی اور تاریکی تھی اور اتفاق سے میرے ساتھ دیا سلائی یا ٹارچ کچھ نہ تھی۔ لیکن چاند کی کچھ روشنی تھی۔ میں نے باہر کا دروازہ کھولا اور ساتھیوں کو آواز دی، تینوں دوڑتے ہوئے آئے۔ ہم تینوں دروازے سے باہر نکل آئے تھے۔ میری بیوی نے شہرت یار خاں کو دیکھ کر کہا "لیجئے خانصاحب معاملہ ختم ہو گیا، اب آپ سنبھال لیجئے۔ ایسے شکستہ خاطر نہ ہوجئے، اس ناکامی میں غالباً آپ کا کچھ زیادہ قصور نہ تھا ہم جیسا اپنی رانی کو سمجھے ہوئے تھے آپ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بھی خوب سمجھتے ہیں۔"

ہم سب کی نظریں دوسری طرف اُٹھیں تو دیکھا کہ رانی ڈاکٹر کے کندھے پر سر رکھے رو رہی ہے، اب ہم خانصاحب کی ٹارچ لیکر پھر مکان کے اندر داخل ہوئے۔ ڈاکٹر کی جیب میں دیا سلائی تھی۔ اس سے کمرے کی لالٹین روشن کی۔ اور روشنی لے کر سارا گھر دیکھ ڈالا۔ کسی انسان کا پتہ نہ ملا۔ نہ ڈاکٹر حکم سنگھ، نہ نمبردار، نہ اسکی بیوی، معلوم ہوتا ہی وہ تینوں ہر قسم کی اُفتاد کے لئے تیار تھے بھگانے کے ساتھ بھاگنے کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔

اس واقعہ کے متعلق میری بیوی کے تمام اندازے اور قیاسات حرف بہ حرف درست نکلے جب سیٹھ کو معلوم ہوا کہ رانی نے دھوکا نہ دیا تھا اور فرار نہ ہوئی تھی، تو وہ اس قدر خوش ہوا کہ ڈاکٹر سے رشتہ منظور کر لیا۔ ٹوکری کا بھید خود رانی نے کھولا۔ جب نمبردار اور اس کی بیوی نے رانی کو دھوکے سے بلا کر کوٹھری میں بند کر دیا تو اُس نے اپنی ٹوکری اسی کھڑکی سے نہر میں ڈال دی جس سے نمبردارنی نے دودھ کا پیالہ پھینکا تھا۔ رانی کا یہ مقصد تھا کہ ٹوکری پہچان لی جائے گی اور یہ معلوم ہو سکے گا کہ وہ بھی یہیں کہیں ہے۔

آخری بات یہ بھی کہہ دوں کہ مجھے اس تفتیش کے صلے میں سب انسپکٹر بنا دیا گیا۔

(مطبوعہ رسالہ عصمت دہلی فروری ۱۹۳۹ء)

|||||

احمد فضل گھر میں داخل ہوا، چہرے پر بشاشت، اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ذکیہ دیکھتے ہی دوڑی۔ اور بولی۔ "بڑی دیر لگائی۔ کب سے انتظار کر رہی ہوں، پرچہ تو بہت اچھا کیا ہوگا چہرے ہی پر لکھا ہوا ہے۔ لو آؤ منہ ہاتھ دھو لو، چائے تیار ہے"

احمد فضل۔ وضو کر دوں گا، اذان ہونے والی ہوگی مسجد سے آکر چائے پیوں گا۔

باتیں کرتے ہوئے کمرے میں آئے، احمد وضو کرنے بیٹھ گیا، ذکیہ پاس کھڑی تھی اس نے پوچھا پرچہ کہاں ہے؟

احمد۔ جیب میں ہے۔ بہت اچھا پرچہ آیا۔ تمہاری ذہانت کا پھر قائل ہونا پڑا (مسکرا کر ذکیہ کو دیکھا) دو تین حصے وہی آئے ہیں جو تم نے قیاس کئے تھے۔

ذکیہ جیب میں سے پرچہ نکال کر دیکھنے لگی۔ احمد وضو کر کے مسجد کو چلا گیا۔ احمد فضل، مولوی سید محمد اعظم ڈپٹی کلکٹر کا اکلوتا لڑکا تھا۔ ماں کا بہت دن ہوئے انتقال ہو چکا تھا۔ باپ کی ابھی دو مہینے ہوئے بدلی ہو گئی تھی۔ بی۔ اے میں پڑھتا تھا یونیورسٹی کے امتحان میں تھوڑے دن باقی تھے، اس لئے آگرہ ہی رہنا پڑا۔ ذکیہ کے ساتھ شادی ہوئے ابھی سال بھر بھی نہیں ہوا تھا۔ احمد خود بڑا ذہین اور محنتی تھا۔ ہمیشہ اپنے درجہ میں فرسٹ آتا تھا، ذکیہ کی ذہانت اس پر طرہ ہو گئی۔ بلا کی ذہین تھی۔ انٹرمیڈیٹ تک کی انگریزی فارسی، اردو اور تاریخ تو اس نے گھر پر اپنے بھائی کے ساتھ پڑھی تھی۔ بس امتحان ہی نہ دیا تھا۔ بی اے کی کتابیں پڑھ رہی تھی کہ شادی ہو گئی اور سسرال میں آکر شوہر کی تعلیم میں شریک ہو گئی۔ احمد نماز پڑھ کر

آیا تو ذکیہ چائے لے آئی۔ اور بنانے لگی۔

ذکیہ۔ ہاں، اپنے دوست دیوانے کا تو حال کہو۔ اس نے کیسے پرچے کئے؟ کیا نام ہے؟

احمد۔ دیوی دیال دیوانہ، بہت اچھے کئے ہیں۔ بڑا شوقین اور محنتی ہے۔ اور نہایت مخلص و بے ریا۔ ایسا غیر متعصب اور نیک نفس ہندو دیکھنے ہی میں نہیں آیا۔ مجھ سے تو اسے خدا واسطے کی محبت ہو گئی ہے۔ عجائبات سے اُسے عشق ہے۔ نوادرِ ادبی و لسانی، صنائع و بدائع، معمے، پہیلیاں، تاریخی مادے، حساب کے چٹکلے، پہلو دار باتیں، ذو معانی اشعار، ضلع جگت، خدا جانے کتنے یاد ہیں۔ اپنا تخلص دیوانہ بھی تین دالیں جمع کرنے کے لئے رکھا ہے۔ میں نے ایک دن کہا تھا کہ یہی بات ہے تو دانش تخلص رکھا ہوتا، "دیوانہ" تو بُری بات ہے۔ کہنے لگا۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ تینوں لفظوں میں د اور ی جمع ہو گئیں۔ اور دیوی و دیوانہ میں صنعت اشتقاق ہے ایک ہی لفظ سے نکلے ہوئے ہیں۔ ابھی دو ایک روز ہوتے ایسا ہی ذکر تھا۔ کہنے لگا۔ دیکھو تمہارے لئے بھی عنقریب ایک صنعت گھڑ دوں گا۔

۲

اِن باتوں کو دو مہینے گزر گئے۔ ۲۰ جون کو ذکیہ دہلی سے آگرہ کے لئے سوار ہوئی۔ اس کے ماں باپ دہلی میں تھے۔ ماں کی طبیعت اچھی نہ تھی دیکھنے گئی تھی۔ گھر والے روکتے رہے۔ مگر وہ احمد افضل کی تنہائی کے خیال سے نہ ٹھہری۔ پانچویں دن لوٹی۔ مئی جون کے مہینے آگرہ کے آتش کدہ میں گذارنے کی ضرورت نہ تھی۔ احمد کے باپ نے دونوں کو اپنے پاس بلایا تھا۔ مگر احمد نے امتحان سے نمٹتے ہی ایک کتاب لکھنی شروع کر دی تھی۔ پھر اپنا گھر تھا۔ سمندر آگ میں سے کہاں جاتا ہے۔ دہلی پر ذکیہ کا بھائی اسٹیشن تک پہنچانے آیا تھا۔ گاڑی چھوٹنے پر واپس چلا گیا۔ اور ذکیہ تنہا روانہ ہو گئی۔ بہت دلیر، ہوشیار، دانش مند

عورت تھی۔ اکثر اکیلی سفر کرتی تھی۔ ریل کے زنانہ درجہ میں اور بہت سی عورتیں تھیں ایک عورت جو ذکیہ کے سامنے کی بیچ پر بیٹھی تھی کچھ گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بار بار کبھی ادھر اُدھر دیکھتی، کبھی اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ لیتی۔ ذکیہ کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی، اور اس نے پوچھا، تمھیں کچھ تکلیف ہے؟ اس نے کہا کچھ نہیں۔ لیکن اس کی وہ حرکتیں جاری رہیں۔ تھوڑی دیر میں کسی اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری، وہ عورت جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اتنے میں ایک مرد باہر کھڑکی پر آیا۔ وہ عورت اُس کے پاس گئی اور فوراً لوٹ آئی ذکیہ نے یہ آنا جانا دیکھا۔ اُس نے کھڑکی کی طرف سے پشت کر لی تھی۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے بعد پھر گاڑی ٹھہری۔ پھر وہ شخص آیا اور یہ عورت گئی۔ اب کے ذکیہ نے دیکھا کہ مرد نے پوچھا، پانی لاؤں؟ عورت نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ نہیں، پانی تو ہے۔ پھر گاڑی چل دی۔ ذکیہ نے ہینڈ بیگ میں سے کوئی کتاب نکال کر دیکھنی شروع کر دی۔ دو بجے کے قریب شاید ہاتھرس پر گاڑی رکی۔ ذکیہ منتظر ہی تھی۔ وہی شخص پھر آیا۔ اور اب کے عورت گاڑی سے نیچے اُتر گئی۔ ذکیہ کھڑکی کی آڑ میں ہو کر اُن کو دیکھنے لگی وہ دونوں ذرا ہٹے ہوئے ادھر سے پیٹھ کئے کھڑے تھے۔ عورت نے برقع میں سے کوئی چیز نکال کر دکھائی، اور پھر چھپا لی۔ ذکیہ نے ایک جھپک سی دیکھی کہ کوئی ہلکے نیلے رنگ کا کاغذ سا تھا۔ عورت پھر گاڑی میں آکر بیٹھی تو ذکیہ کتاب دیکھنے میں محو تھی۔

تین بجے گاڑی ٹونڈلہ پہونچی۔ ذکیہ کو آگرہ کے لئے گاڑی بدلنی تھی۔ قلی آگیا تھا۔ اُس نے ذکیہ کا سوٹ کیس، بستر اور ہینڈ بیگ اُٹھا کر نیچے رکھا۔ ذکیہ اُترنے لگی تو اُس نے سُنا کہ وہ عورت اپنے مرد سے کہہ رہی ہے کہ تم تو کہتے تھے یہ گاڑی سیدھی کانپور جائیگی۔ اب کیوں اُترتے ہو۔ مرد نے جواب دیا۔ اس گاڑی سے جانا ٹھیک نہیں۔ تھوڑی دیر میں دوسری جائے گی اُس سے جائیں گے۔ ذکیہ اتری۔ قلی نے اسباب اُٹھایا۔ بکس اور بستر سر پر، اور بیگ ہاتھ میں۔ قلی آگے اور ذکیہ اُس کے پیچھے چلدی۔ راستے میں پلیٹ فارم پر بڑی بھیڑ تھی۔ یکایک ذکیہ کے قلی کو زور سے دھکا لگا، لڑکھڑا گیا۔ سر کا اسباب گرنے لگا

ذکیہ نے جلدی سے قلی کے ہاتھ میں سے بیگ لے لیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سامان سنبھال لیا۔ لیکن ذکیہ نے دیکھا کہ یہ دھکا کسی عورت کا لگا تھا۔ اور وہ وہی عورت تھی اور اس کے ساتھ وہی مرد تھا۔ عورت بڑے زور سے گری تھی۔ مگر مرد نے اُس کو اُٹھایا۔ اور دونوں جلدی جلدی چل دیئے۔ گرنے کے دھاکے اور عورت کی چیخ سے مسافر متوجہ ہوگئے تھے، لیکن دونوں کے چل دینے سے پھر سب اپنی اپنی فکر میں لگ گئے۔ ذکیہ آگے بڑھی تو کوئی چیز اُس کے پاؤں کے نیچے دبی، جُھک کر دیکھا تو ہلکے نیلے رنگ کا چوڑا سا لفافہ تھا اور بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ذکیہ کو فوراً وہ نیلا کاغذ یاد آگیا جو اس عورت نے مرد کو دکھایا تھا۔ اس نے جلدی سے پاؤں ہٹا لیا اور قلی کے ساتھ چلدی۔ ابھی چند قدم چلی ہوگی کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی، ”بیگم صاحب یہ لفافہ آپ کا تو نہیں گر پڑا ہے؟“ ذکیہ نے مڑ کر دیکھا کہ ریلوے پولیس انسپکٹر وہی لفافہ ہاتھ میں لئے آرہا ہے، ذکیہ نے کہا: ”جی نہیں، میرا نہیں ہے۔ شاید اس عورت کا ہو جو ابھی یہاں گری تھی۔“

اتنے میں قلی دُور نکل گیا تھا۔ ذکیہ قدم بڑھاتی ہوئی چلدی۔ قلی نے آگرہ کی گاڑی میں سامان رکھ دیا ذکیہ قلی کو رخصت کرکے بنچ پر بیٹھ گئی، اور ہاتھوں سے سر پکڑ کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر سر اُٹھا کر آپ ہی آپ کہنے لگی۔ لاحول ولا قوۃ! ذرا سی بات سے بد حواس ہوگئی۔ کس مشکل سے انسپکٹر کو جواب دے سکی ہوں، جیسے وہ مجھ ہی کو پکڑنے آرہا تھا۔ خدا جانے کس بیچاری کی کیا چیز ہوگی۔ مجھے تو اس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر وحشت ہونے لگی تھی۔ خیر چھوڑو اس قصہ کو، یہ کہہ کر اُس نے لوٹے میں پانی لیا گاڑی کے اندر بیٹھ کر وضو کیا ظہر کی نماز پڑھی۔ اتنے میں گاڑی کے اندر عورتیں آنے لگیں ہنگامہ شروع ہوگیا۔ آخر گاڑی روانہ ہوئی۔ اتنے میں آگرہ فورٹ کے اسٹیشن پر پہونچی۔ ذکیہ وہ قصہ بھول گئی تھی۔ احمد کا تصور آنکھوں میں تھا۔ اسٹیشن پہ نظر بھی آگیا۔

احمد و ذکیہ گھر پہونچے ہی تھے کہ معلوم ہوا داروغہ جی آئے ہیں، ذکیہ اپنے کمرے میں تھی، کپڑے بدل رہی تھی، اُس نے نہ سُنا احمد ماما سے یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا کہ بیگم سے کہنا چاہئے باہر ہی بھیجدیں۔ داروغہ جی محلہ کے تھانے میں سب انسپکٹر تھے۔ بڑے بزرگ آدمی تھے، پنشن کا زمانہ قریب تھا۔ ذکیہ کے والد کے بچپن کے ساتھی، ہموطن، یار غار تھے۔ ذکیہ کو گود میں کھلایا تھا وہ بھی ان سے کچھ یوں ہی سا پردہ کرتی تھی۔ احمد پہونچا تو آداب و تسلیم، مصافحہ و مزاج پُرسی کے بعد بیٹھ گئے۔

داروغہ جی - میں اِدھر سے گزرا تو معلوم ہوا بیٹی دہلی سے آگئی ہے۔ میں نے کہا خیریت پوچھتا چلوں بھابی جان (ذکیہ والدہ) کی طبیعت اب کیسی ہے ؟

احمد - جی ابھی آئی ہیں۔ چچی جان کو اب بفضلہ بالکل صحت ہے۔ آپ اِدھر ویسے ہی آئے تھے یا اس تفتیش کے سلسلہ میں خاں صاحب کی طرف آنا ہوا تھا ؟ بڑا تعجب ہے اس قدر حفاظت سے رکھی ہوئی رقم صاف اُڑ گئی۔

داروغہ - تعجب تو کچھ ایسا نہیں ہے، اور پتہ تو چل جاتا اگر خاں صاحب اپنے کسی ملازم پر شبہہ نہیں کرتے۔ ایک نوکر اُن کے ہاں نیا تھا۔ مگر وہ کئی دن ہوئے کسی معقول عذر کے ساتھ چھوڑ کر گھر چلا گیا تھا۔ نینی تال کا رہنے والا بتاتے تھے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا اصلی رہنے والا ہاتھرس کا ہے۔ نینی تال میں اکثر رہتا ہے۔ دبیرالدین نام ہے۔ باپ کا نام دلدار اب ہاترس اور نینی تال دونوں جگہ نہیں ہے۔

احمد - مگر وہ جانے والی رقم بھی عجیب واقع ہوئی ہے۔ گیارہ ہزار ایک سو گیارہ۔ پانچ جگہ ایک ہی ایک۔

داروغہ۔ (ہنس کر) مجھے بھی سُن کر اس کا خیال ہوا تھا، مجھے تو پولیس کا آدمی ہونے کی وجہ سے اس کی ندرت محسوس ہوئی، اور تم کو ادیب و شاعر ہونے کے سبب سے۔ ورنہ محض اتفاق ہے۔ خاں صاحب کہتے ہیں حساب سے اتنی ہی رقم نکلی۔ کہیں بیمہ بھیجنے کے لئے نیلے رنگ کے لفافہ میں گیارہ ہزار ایک سو گیارہ کے نوٹ لفافے میں بند کر دیئے تھے۔ مہریں نہ لگائی تھیں۔ سیف میں رکھ دیا تھا۔ دوسرے روز یکایک علی گڑھ چلے گئے۔ آئے تو غائب تھا۔ اچھا اب ذرا اپنی دُلہن کو بلاؤ۔ خیر سلا پوچھ لیں تو چلیں۔ اور ہاں تمہارا نتیجہ کب آئے گا۔

احمد نے کہا، آج کل ہی میں آنے والا ہے۔ یہ کہہ کر احمد اندر جاکر ذکیہ کو بلا لایا۔ ذکیہ چادر میں لپٹی ہوئی آئی۔ سلام کیا۔ مزاج پوچھا، اور ذرا ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ داروغہ جی چند منٹ باتیں کرکے اُٹھنے لگے تو ذکیہ نے کہا، چائے پیتے جائیے، یہ کہہ آئے تھے کہ باہر بھیجدینا۔

داروغہ جی نے کہا۔ اچھا تمہاری خوشی۔ ذکیہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی باہر سے ملازم نے کہا کہ ڈاک آئی ہے۔ احمد نے کہا، لے آؤ۔ ملازم دروازہ کھول کر کمرے میں آیا۔ اور ایک لفافہ اور چند پیکٹ احمد کو دے کر چلا گیا۔ لفافہ بہت خوبصورت تھا جیسا دعوت نامہ کا ہوتا ہے۔ احمد نے کھولا تو اندر سے دعوت نامہ کا سا خوبصورت کارڈ نکلا۔ اس پر قلم سے خوشخط لکھا ہوا تھا۔ ←

۱۱۱
۶-۶
تحفہ تہنیت
۱۱۱۱۱
خادم خیرخواہ
د۔ د۔ د

احمد کارڈ پڑھ کر یکایک اُچھل پڑا۔ چہرے پر سُرخی آگئی تھی، لیکن فوراً زرد پڑ گیا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ حیران تھا کہ کیا سمجھے۔ داروغہ بھی بڑے غور سے احمد کو دیکھ رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر

پوچھا۔ خیر تو ہے۔ میں دیکھ سکتا ہوں؟ احمد نے کارڈ دیدیا۔ داروغہ نے غور سے پڑھا۔ پھر احمد کی طرف نظر اٹھائی، پھر کارڈ کو دیکھا۔ آخر بولے۔

داروغہ جی۔ احمد یہ کیا بھید ہے؟ گیارہ ہزار ایک سو گیارہ کی مبارکباد، دبیرالدین دلدار کی طرف سے۔ اور تم کو لفافے کی مُہر دیکھو مینی تال صاف چھپا ہوا ہے۔ وہ شخص مینی تال کا رہنے والا ہے۔ کیا معمّا ہے!

اتنے میں ذکیہ کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ داروغہ نے جلدی سے احمد سے کہا۔ ذکیہ کو کچھ خبر نہیں ہے اس کو کچھ شبہہ نہ ہونا چاہئے۔ میں پھر باتیں کروں گا۔ تمہارے چہرے پر وحشت ہے سنبھل جاؤ۔ یہ کہہ کر داروغہ نے جلدی سے کارڈ کو لفافے میں رکھ کر اخبار کے نیچے رکھ دیا۔ ذکیہ چائے کی کشتی میز پر رکھ کر بنانے لگی۔ دونوں کو پیالیاں دے کر میز پر سے اخبار اُٹھا لیا۔ اس کے نیچے گلابی حاشیہ کا لفافہ تھا۔ اخبار چھوڑ کر لفافہ اُٹھایا۔ اور کارڈ نکال کر پڑھنے لگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن خاموش رہے۔ اور ذکیہ کو دیکھنے لگے۔ ذکیہ دو تین منٹ کارڈ کو دیکھتی رہی۔ پھر یکایک اُس کا چہرہ چمک اُٹھا اور جوش مسرت سے بیتاب ہو کر بولی۔

ذکیہ۔ (داروغہ سے) چچا، مبارک ہو۔ یہ بی۔ اے میں پاس ہو گئے، اور فرسٹ ڈویزن میں، اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ (احمد کی طرف منھ بنا کر) مجھ سے کیوں چھپایا تھا؟ اور چچا سے بھی نہ کہا؟

داروغہ۔ بیٹی کیا کہہ رہی ہو، تمہاری جان کی قسم۔ ہم دونوں تو اب بھی کچھ نہیں سمجھے۔ ہم نے تو کارڈ دیکھ کر سمجھا تھا، کسی نے مذاق کیا ہے وہ بھی بے تکا کہ سمجھ میں نہ آیا۔ تم نے کیسے سمجھا؟

ذکیہ۔ مذاق تو بیشک کیا ہے، لیکن سچا مذاق ہے اور مبارک! (احمد کی طرف دیکھ کر) تعجب ہے انھوں نے یہ کیوں نہ سمجھ لیا کہ ان کے دوست دیوی دیال دیوانہ نے مینی تال سے نتیجہ

دیکھ کر مبارکباد لکھی ہے۔

داروغہ۔ لیکن ان کے پاس ہونے کی مبارکباد کیونکر ہوئی؟

ذکیہ۔ ان کو معلوم ہے کہ ان کے دوست کو معمے بنانے اور مناسبتیں پیدا کرنے کا شوق ہے۔ وہی شوق اس طرح ظاہر کیا ہے (احمد کی طرف دیکھ کر) ان کو اپنا رول نمبر یاد ہے۔ اپنا نام معلوم ہے، تین لکیریں تو حل ہی تھیں۔ باقی دو سمجھ میں نہ آئیں تب بھی مبارکباد کا مضمون تو ہو ہی گیا۔

داروغہ۔ اب تم بھی معمے کو معمے ہی میں سمجھانے لگیں۔ قسم لو جو میری سمجھ میں کچھ خاک آیا ہو۔

ذکیہ۔ پہلی لکیر ایک کا ہندسہ، یہ ان کا رول نمبر ہے، دوسری تیسری لکیر دو الف جو ان کے نام کے پہلے حروف ہیں۔ چوتھی لکیر فرسٹ ڈویژن، پانچویں لکیر اول نمبر۔

یہ کہہ کر ذکیہ میز پر سے کاغذ قلم لے کر کچھ لکھنے لگی۔

داروغہ۔ اور یہ پیشانی پر تین الف یا ایک کے ہندسے کیسے ہیں؟

ذکیہ ہاتھ سے قلم رکھ کر کارڈ کو دیکھنے لگی۔ اور ایک منٹ بعد یہ کہہ کر کہ لیجئے یہ بھی حل ہو گیا۔ پھر لکھنے لگی، اور تحریر ختم کر کے کاغذ داروغہ جی کے سامنے رکھ دیا۔ احمد بھی جھک کر دیکھنے لگا۔ ذکیہ نے یہ لکھا تھا

اللہ۔ ادم۔ ایزد

۶ر جون

تحفۂ تہنیت

رول نمبر	نام	ڈویژن	نمبر ترتیب
۱	احمد افضل	اوّل	اوّل

خادم خیرخواہ

دیوی دیال دیوانہ

داروغہ۔ شاباش بیٹی، کیا کمال کی ذہانت پائی ہے۔ اللہ عمر دراز کرے۔ نیک نصیب کرے۔

ذکیہ۔ چچا آپ اپنی محبت سے ایسا سمجھتے ہیں۔ لیکن میں حیران ہوں کہ یہ معما

اُنھوں نے کیوں نہ حل کر لیا۔ یہ مجھ سے بہت زیادہ ذہین ہیں، معموں کا شوق نہ سہی لیکن ان کو دیوی دیال کی طبیعت کا حال معلوم ہے۔ وہ ان سے کہہ چکا تھا کہ تمہارے لئے بھی کوئی صنعت گھڑ دوں گا۔ بریلی کا رہنے والا ہے۔ نتیجہ معلوم کرنے ضرور نینی تال پہونچا ہوگا۔ آج کل ہی میں نتیجہ آنے والا تھا۔ پھر اب جو نینی تال سے اس کا خط آیا تو کیوں نہ سمجھ لیا۔ وہ صرف مبارکباد کا لفظ اور اپنا نام یا نام کے حرف لکھ دیتا۔ یا نام بھی نہ لکھتا مبارکباد ہی ہوتی، پھر بھی نینی تال سے آنا اسی کامیابی کی خوش خبری ہوتی۔ میں ان کی سمجھ پر آج پہلی مرتبہ حیران ہوئی ہوں۔

داروغہ۔ (مسکرا کر) بیٹی تم سچ کہتی ہو۔ اگر ایسا ہوتا جیسا تم نے کہا تو ہر شخص سمجھ جاتا۔ لیکن پُراسرار تحریر اور معمائیت نے دھوکا دیا۔ اور سچ بات یہ ہے کہ اس وقت میرے اور احمد کے دل و دماغ پر کچھ اور بادل چھائے ہوئے تھے (ذکیہ نے گھبرا کر داروغہ جی کو دیکھا) پریشان نہ ہو خیریت ہے، تم نے بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ قصہ یہ تھا کہ چار پانچ دن ہوئے۔ شاید جس دن تم دہلی گئی ہو اسی رات کو تمہارے بڑے وسی خاں صاحب کے صندوق میں سے ایک بند لفافہ نیلے رنگ کا نکل گیا۔ اس میں گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپیہ کے نوٹ تھے۔ ہم دونوں اسی کی باتیں کر رہے تھے کہ ڈاک آئی اور یہ کارڈ ملا۔ اس میں اسی رقم کے ہندسے لکھے ہوئے تھے اور اتفاق سے جس آدمی پر شبہہ ہے اس کے نام میں بھی تین دال ہیں اور نینی تال ہی کا رہنے والا ہے۔ اب تمہیں بتاؤ ہمارا خیال اس واقعہ کی طرف جاتا یا احمد کے نتیجہ کی طرف؟

ذکیہ۔ (گہرا سانس لے کر) یا اللہ پاک تیرا ہزار ہزار شکر! (داروغہ سے) چچا، اللہ تعالےٰ کی قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ ان شادی و غم کے واقعات میں ایک کمزور و ناکارہ عورت ہی کو حصہ لینا مقدر تھا۔ (مسکرا کر) لیجئے میں اس لفافے کی بھی تفتیش کر لائی ہوں۔ وہ

یہ لفافہ ٹونڈلہ ریلوے پولیس کے دفتر میں ہے۔ وہاں سے آپ کی کوتوالی بھیجدیا گیا ہوگا۔
اس کے بعد ذکیہ نے ریل گاڑی اور اسٹیشن کے تمام واقعات سُنا دیئے۔ ابھی یہ گفتگو ختم ہی ہوئی تھی کہ ملازم نے کہا، سرکار تار آیا ہے۔ ذکیہ نے اُٹھ کر اندر جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن داروغہ اور احمد دونوں کھڑے ہو گئے تھے۔ احمد باہر جاتا تھا۔ لیکن داروغہ دروازے کے قریب تھے، وہ جلدی سے باہر چلے گئے اور ذکیہ کو ٹھہرنے کا اشارہ کرتے گئے۔ باہر ان کو تار لینے کے اندازے سے زیادہ دیر لگی۔ پھر کمرے میں آئے تو تین تار احمد کو دیئے۔ اُس نے جلدی جلدی کھول کر پڑھے اور سُنائے۔
(۱) کانگریچولیشن آن فرسٹ کلاس، فرسٹ، دیوی دیال دیوآنہ
(۲) دوسرا کسی اور کلاس فیلو کا اسی مضمون کا تھا کہ اعلیٰ کامیابی مبارک ہو!
(۳) تیسرا احمد کے والد کا تھا۔ کہ تم ڈپٹی کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس دونوں عہدوں کیلئے نامزد ہوگئے مبارک سلامت کے بعد داروغہ جی نے کہا کہ میں باہر گیا تو کوتوالی کا آدمی بھی کھڑا تھا۔ مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں آپہونچا۔ کوتوال صاحب نے بھیجا ہے کہ مال مسروقہ مل گیا، خانصاحب کو لے کر آؤ۔
ذکیہ: شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو! اچھا، گو ہم ان واقعات کو اتفاق سمجھیں، لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارے لئے اللہ کی خاص رحمت و حکمت کے نمونے تھے (احمد کو دیکھ کر) ان کی ایسی اعلیٰ کامیابی اور ایسی عمدہ ملازمتوں کی خبریں آنے والی تھیں۔ آپ لوگ تو مرد ہیں حوصلے والے ہیں۔ میں پھر عورت ہوں اور کم ہمت۔ یہ پے در پے مسرتیں، گو اُمید و استحقاق کے خلاف نہ تھیں۔ تاہم یکایک تھیں اور ساتھ ساتھ۔ ممکن تھا مجھ پر اثر کرتیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے سے کچھ فکر و تردد دے کر تیار کر دیا۔
داروغہ جی دُعائیں دیتے ہوئے آداب و سلام کے بعد رخصت ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی احمد افضل ذکیہ کے پاس آیا۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

(مطبوعہ عصمت دہلی جون ۱۹۳۹ء)

دِل کی آواز

مشہود کی تمام رات نہایت کرب و اضطراب میں گذری تھی۔ صبح کو ملازم نے اخبار لاکر دیا۔ مشہود نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار کھولا۔ اور خبروں کے کالم پر نظر دوڑائی۔ یکایک ایک ہلکی سی چیخ اُس کے منہ سے نکل گئی۔ اس سُرخی پر اُس کی نظر تھی۔ "ایک بچہ موٹر سے کچل گیا۔" واقعہ کی تفصیل پڑھنے سے ڈرتا تھا۔ اخبار کو موڑ توڑ کر پھینکنے والا تھا کہ کچھ خیال آگیا۔ اخبار کو سیدھا کیا۔ یہ واقعہ درج تھا:۔

کل ۴ بجے سہ پہر کو عالم نگر کی سڑک پر ایک چار برس کا بچہ موٹر سے ٹکرا گیا۔ موٹر ایسی تیزی سے نکل گئی کہ اس کا نمبر نوٹ نہ کیا جا سکا۔ بچہ مستری خداداد مرحوم کا تھا۔ بیوہ ماں کے مکان نمبر ۵، واقع گنج پور پہونچا دیا گیا۔ لیکن دو گھنٹہ بعد مر گیا۔

مشہود دیر تک سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ پھر خود بخود کہنے لگا۔ "تو میں اس کا قاتل ہوں۔ مجھے اسی انجام کا اندیشہ تھا کل سے کتنی مرتبہ ارادہ کیا کہ جائے وقوع پر پہنچکر تحقیقات کروں کہ میری کار سے جو بچہ ٹکرایا تھا اس کا کیا حشر ہوا، کون تھا، کس کا تھا، لیکن جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر اب معلوم ہو گیا۔ لیکن کیا کروں کیا اس کے گھر جاؤں، اس کی ماں سے اقبال کروں۔ اُس بد نصیب کی تباہ حالت اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ اس کی لعنت ملامت، غصہ و نفرت کا ہدف بنوں اور اپنے کئے کی سزا بھگتوں۔ یہی ہونا چاہئے لیکن کیا مجھ میں اس کی ہمت ہے۔"

یکایک مشہود نے زور سے گھنٹی بجائی۔ ملازم آیا مشہود نے کہا۔ "فوراً اسباب باندھو۔ بمبئی جا رہا ہوں"

مشہود نے طے کر لیا کہ اس شہر سے چلا جانا چاہیئے۔ یہ بھید کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن یہ کانٹا دل میں کھٹکتا رہے گا۔ یہاں رہوں گا تو کھٹک باقی رہے گی۔ کہیں دُور چلا جاؤں۔ بمبئی کی دلچسپیوں میں یہ چبھن محسوس نہ ہو گی۔ ضمیر کی آواز دب جائے گی۔ یہ سوچ کر سیف میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔ اور اُٹھ کھڑا ہوا کہ چل کر دوستوں سے رُخصت ہو آؤں۔ کیا جانے پھر یہاں کب آنا ہو۔ کار میں بیٹھنے کو جی نہ چاہا۔ پیدل چل دیا۔ چوک سے گزرا تو اتفاق سے کوئی میلا تھا۔ بچے کھلونے مٹھائیاں لئے ہوئے آ جا رہے تھے۔ بچوں کو دیکھ کر مشہود کے دل پر ایک چوٹ لگی اور وہی کل کا بچہ یاد آ گیا۔ خدا جانے وہ بچہ کس شکل کا تھا۔ گورا تھا یا کالا؟ خوبصورت تھا یا بدصورت؟

مشہود یوں ہی چکر لگاتا چلا جا رہا تھا کہ یکایک ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈال کر کہنے لگا: "یہ تو گنج کا محلہ ہے۔ یہیں کہیں اس کا گھر ہو گا۔ کیا نمبر تھا؟ ۵۷۔ سامنے کی گلی میں لوگ بہت آ جا رہے ہیں۔ یہیں اس کا مکان ہو گا اس کے عزیز رشتہ دار آتے جاتے ہوں گے۔ میں بھی چلوں۔ لیکن فضول ہے۔ کسی کو خبر نہیں، شبہ نہیں، اور پھر کچھ نتیجہ بھی نہیں۔" یہ سوچ کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ دُور جا کر ایک خالی تانگہ آتا ہوا ملا۔ یکایک مشہود نے تانگے کو روکا اور جلدی سے بیٹھ کر تانگے والے کو گنج کا پتہ بتایا۔ اس محلہ کے سرے پر تانگے سے اتر پڑا۔ اور تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چلا۔ اب مشہود کے چہرے پر سکون، چال میں استقلال، دل میں ہمت تھی مکان نمبر ۵۷ پر پہنچکر زنجیر ہلائی۔ ایک بوڑھی عورت دروازے میں آئی۔

مشہود۔ مستری خداداد مرحوم کی بیوہ اسی مکان میں رہتی ہیں؟

بڑھیا۔ (حیرت سے دیکھ کر) جی ہاں۔ کہئے کیا کام ہے؟

مشہود۔ کیا وہ دروازہ میں آ سکتی ہیں؟ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

بڑھیا۔ آئیے آپ بیٹھک میں آ جائیے میں بلاتی ہوں۔ وہ بچے کے پاس بیٹھی ہیں۔

بیٹھک میں زنانہ مکان کا دروازہ تھا۔ ذرا سی دیر میں دروازہ کے پاس سے آواز آئی "آپ نے

مجھے بلایا تھا۔ آپ کون ہیں؟ مجھ سے کیا کام ہے؟"

مشہود کا کلیجہ اچھلنے لگا۔ آواز سے جوان معلوم ہوتی ہے۔ آواز میں حزن واندوہ کا اثر ہے۔ ابھی رُود کر اٹھی ہوگی۔ اس پر مصیبت کا پہاڑ میں نے توڑا ہے۔ مشہود کو جواب دینے میں ایک لمحہ کا تامل ہوا تھا کہ اس عورت نے پھر کہا، آپ کون ہیں؟

مشہود۔ بی بی میں ہی وہ بدبخت شخص ہوں جس کی موٹر سے تمہارا......... آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

عورت۔ آپ تھے؛ پھر؟

عورت کی آواز میں غصہ یا نفرت کا اثر نہ تھا۔ صبر و رضا کا جذبہ معلوم ہوتا تھا۔

مشہود۔ "سنو! جو کچھ ہونا تھا ہو گیا اب بدلا نہیں جا سکتا اور میں جو کچھ کہنے کے لئے آیا ہوں اس سے تمہارے صدمے کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ تمہاری زندگی اس بچے کے دم سے تھی۔ وہ نہ رہا تو اب تمہارے لئے دنیا میں کیا رہا۔ پھر بھی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم جو رقم چاہو مقرر کر کے مجھے بتا دو۔ میں ہر مہینے تم کو پہنچاتا رہوں گا۔

عورت۔ (ذرا دیر کے بعد) " میں نہیں سمجھی، آپ کیا کہہ رہے ہیں"

اس مرتبہ آواز میں حیرت تھی۔ کوئی برہمی دبرافروختگی نہ تھی۔

مشہود۔ "بی بی، مجھے خدا نے بہت کچھ دیا ہے۔ میں ہر قسم خوشی سے دے سکتا ہوں۔ اور جب تک تمہاری کوئی خدمت نہ کروں گا میرے دل کو اطمینان نہ ہوگا"

عورت۔ "میاں، اللہ آپ کو بہت سا دے۔ میرا بچہ سلامت ہے"

مشہود کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ کیا سن رہا ہے۔ متحیر ہو گیا۔ ذرا دیر منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

مشہود۔ (لرزتی آواز سے) بچہ سلامت ہے! میں نے اخبار میں پڑھا........."

عورت۔ "مجھ سے بھی آج صبح لوگ کہتے تھے کہ اخبار میں چھپ گیا ہے۔ لیکن وہ خبر غلط ہے۔

بیشک لڑکا موٹر سے ٹکرا کر گر پڑا تھا۔ چوٹ بھی آئی۔ لیکن چوٹ سے زیادہ دہشت سے بیہوش ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی یہاں سے گئے ہیں۔ کہتے ہیں چوٹ جلدی اچھی ہو جائے گی۔

مشہود کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس کو دیو کے پنجے سے چھڑا لیا۔ موت کے چنگل سے بچا لیا خوشی کے مارے آنسو نکل آئے۔ کانپتی ہوئی آواز کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

مشہود :- "بہن کچھ حرج نہ ہو تو مجھے بچے کو دکھا دو۔"

عورت :- "بہت اچھا، میں ہٹی جاتی ہوں۔ اندر آ جائیے۔"

مشہود اندر گیا تو دیکھا کہ دالان میں ایک خوبصورت گورا چِٹا بچہ پلنگ پر لیٹا کھلونوں سے کھیل رہا ہے سر اور ایک ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر مشہود کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور پھر خیال آیا کہ اگر میں ضمیر کی آواز کو دبا دیتا، اور اداے فرض کی پروا نہ کرتا تو یہاں تک نہ آتا۔ اس حقیقت سے بے خبر رہتا اور ساری عمر اپنے آپ کو قاتل اور بزدل دونوں سمجھتا رہتا۔ اور ہمیشہ اپنے اوپر نفرین کرتا۔"

مشہود۔ (بچے کے پاس جا کر) کیسے اچھے کھلونے ہیں۔ کہاں سے آئے؟

بچہ ابّا نے بھیجے ہیں۔ آپ کون ہیں؟ ڈاکٹر صاحب تو نہیں ہیں۔ اب میرا ہاتھ نہ کھولنا۔

مشہود۔ (جیب میں سے نوٹوں کی گڈی نکالتے ہوئے) نہیں میاں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ تمہارے ابّا کے پاس سے آیا ہوں۔ لو دیکھو اس میں کیا ہے۔ یہ بھی تمہارے ابّا نے بھیجے ہیں۔

نوٹوں کا پیکٹ بچے کے ہاتھ میں دے کر مشہود یہ کہتا ہوا دروازے کی طرف چل دیا۔ "بہن میں جاتا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دینا۔"

(مطبوعہ عصمت دہلی اکتوبر ۱۹۴۰ء)

کی خریداری یا اپنی سہیلیوں کی دعوت کا انتظام اپنے پاس سے کرنا پڑتا ہے۔

لیکن جب ناول کی اشاعت کے چھے مہینے بعد پبلشر نے شیلا کو رائلٹی کا چیک بھیجا اور اس کی کثیر رقم کو دیکھ کر موہن کو اندازہ ہوا کہ بیوی کی ۶ ماہ کی آمدنی اس کی سال بھر کی آمدنی سے زیادہ ہے تو یہ پہلا دن تھا کہ موہن کے شیریں جذبات فخر و مسرت میں ایک ذرا تلخی شامل ہوئی، یہ چیک اُسکو ایک خاموش طعنہ دینا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ہمت و حوصلہ پر داغ لگاتا نظر آتا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ شیلا نے اس دولت پر غرور کا انظہار کیا ہو۔ وہ بڑی حساس عورت تھی۔ سمجھتی تھی کہ موہن جیسے مزاج کا آدمی اس تصور ہی سے کہ بیوی کی قدر و قیمت اس سے بڑھی ہوئی ہے غلط فہمی اور احساسِ کمتری کا شکار ہو سکتا ہے۔ موہن کے دل میں حسد مطلق نہ تھا اس کی فراخدلی اس سے بالاتر تھی، شیلا کی قابلیت کے پُر مسرت اعتراف اور پُر جوش تحسین سے اس کا دل خالی نہ تھا۔ وہ تنگدل نہ تھا۔ بلکہ اپنی قابلیت اور کمال کی کوتاہی یا ناکامی کا احساس تھا۔ اس کو اس تصور سے اذیت تھی کہ اس کی شہرت "شیلا کا شوہر" ہونے کی حیثیت سے ہو۔ اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ بیوی کو اس بلند مرتبہ پر دیکھ کر خوش نہ تھا بلکہ محض اس سبب سے کہ وہ خود مرد ہو کر مرتبہ میں اس سے کم تھا، اُس کو بھی عرفیؔ کی طرح یہی خیال آتا تھا: "آنا بود وصفِ اضافی ہُنرِ ذات"

ایک روز شام کو شیلا کے گھر ٹی پارٹی تھی۔ مشہور شاعر، ادیب، ایڈیٹر مرد عورتیں جمع تھیں۔ ہر شخص اس کو مبارکباد دے رہا تھا۔ اس لئے کہ اس کا نیا ناول "عورت کا دل" ابھی ہفتہ عشرہ ہوا شائع ہوا تھا۔ اور مقبولیت میں پہلے ناول کا حریفِ غالب ثابت ہو رہا تھا۔ مُدیر شہیر فرخی اور ادیب جلیل پریم داس سے لیکر مزاحیہ نگار عاصمہ بیگم اور ڈراما نویس بالا دیوی تک ہر شخص شیلا کو خراج تحسین ادا کر رہا تھا۔

موہن ایک طرف بیٹھا ایک بر خود غلط شاعر سیتیں سے شاعری کے مستقبل پر بحث کر رہا تھا۔ لیکن بیوی کی روز افزوں کامیابی اور ہر دلعزیزی کے مظاہرات کو بھی دیکھ رہا تھا اور ایک کسک سی دل میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ بیگانہ وار اس منظر کی تماشائی ہیں۔

کی خریداری یا اپنی سہیلیوں کی دعوت کا انتظام اپنے پاس سے کرنا پڑتا ہے۔

لیکن جب ناول کی اشاعت کے چھ مہینے بعد پبلشر نے شیلا کو رائلٹی کا چیک بھیجا اور اس کی کثیر رقم کو دیکھ کر موہن کو اندازہ ہوا کہ بیوی کی ۶ ماہ کی آمدنی اس کی سال بھر کی آمدنی سے زیادہ ہے تو یہ پہلا دن تھا کہ موہن کے شیریں جذبات فخر و مسرت میں ایک ذرا تلخی شامل ہوئی، یہ چیک اُسکو ایک خاموش طعنہ دینا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ہمت و حوصلہ پر داغ لگاتا نظر آتا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ شیلا نے اس دولت پر غرور کا اظہار کیا ہو۔ وہ بڑی حساس عورت تھی۔ سمجھتی تھی کہ موہن جیسے مزاج کا آدمی اس تصور ہی سے کہ بیوی کی قدرو قیمت اس سے بڑھی ہوئی ہے غلط فہمی اور احساسِ کمتری کا شکار ہو سکتا ہے۔ موہن کے دل میں حسد مطلق نہ تھا اس کی فراخدلی اس سے بالاتر تھی، شیلا کی قابلیت کے پُر مسرت اعتراف اور پُر جوش تحسین سے اس کا دل خالی نہ تھا۔ وہ تنگدل نہ تھا۔ بلکہ اپنی قابلیت اور کمال کی کوتاہی یا ناکامی کا احساس تھا۔ اس کو اس تصور سے اذیت تھی کہ اس کی شہرت "شیلا کا شوہر" ہونے کی حیثیت سے ہو۔ اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ بیوی کو اس بلند مرتبہ پر دیکھ کر خوش نہ تھا بلکہ محض اس سبب سے کہ وہ خود مرد ہو کر مرتبہ میں اس سے کم تھا۔ اُس کو بھی عرفیؔ کی طرح یہی خیال آتا تھا: " آنا نبود وصفِ اضافی ہنرِ ذات "

ایک روز شام کو شیلا کے گھر ٹی پارٹی تھی۔ مشہور شاعر، ادیب، ایڈیٹر مرد عورتیں جمع تھیں۔ ہر شخص اس کو مبارکباد دے رہا تھا۔ اس لئے کہ اس کا نیا ناول "عورت کا دل" ابھی ہفتہ عشرہ ہوا شائع ہوا تھا۔ اور مقبولیت میں پہلے ناول کا حریفِ غالب ثابت ہو رہا تھا۔ مُدیر شہیر فرخی اور ادیب جلیل پریم داس سے لیکر مزاحیہ نگار عاصمہ بیگم اور ڈراما نویس بالا دیوی تک ہر شخص شیلا کو خراجِ تحسین ادا کر رہا تھا۔

موہن ایک طرف بیٹھا ایک برخود غلط شاعر سیمیں سے شاعری کے مستقبل پر بحث کر رہا تھا۔ لیکن بیوی کی روز افزوں کامیابی اور ہر دلعزیزی کے مظاہرات کو بھی دیکھ رہا تھا اور ایک کسک سی دل میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ بیگانہ وار اس منظر کی تماشائی ہیں۔

اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جس گھر میں اس کو میزبان ہونا چاہیے تھا وہاں ناخواندہ مہمان ہے۔

"مسٹر موہن، آپکو اپنی بیوی پر فخر و مباہات کا موقع ہے"، اس کے ہم نشین سیمن نے کہا: "عورت کا دل مطبوعات جدیدہ میں بہترین تصنیف ہے۔ بڑی فتح، بڑا شاہکار، ناول کے افراد جیتے جاگتے موجودہ سماج کے انسان ہیں۔ طرزِ تحریر میں عجیب تازگی و دلکشی ہے۔ حیرت انگیز ادبی کارنامہ ہے۔"

"بیشک ایسا ہی ہے" موہن نے یہ کہہ کر متبسم نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھا جو قریب کی میز پر اپنی قدیم ہم مکتب سہیلیوں کے ساتھ چائے پی رہی تھی اور ایک شوخ طبع شاعرہ کی چھیڑ چھاڑ کا جواب دے رہی تھی۔

شیلا نے اپنی تعریف سُنی اور شوہر کے جواب میں ایک قسم کی دل گرفتگی بھی محسوس کی۔ فوراً اُس کے حسین روشن چہرے سے آثار مسرت غائب ہو گئے۔ ایک دن تھا کہ موہن ایسے موقع پر بڑی کشادہ دلی سے اُس کی تعریف کیا کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ موہن میں فراخدلی کی کمی نہیں ہے بلکہ اپنی ناکامی کا روح فرسا احساس ہے جس نے اسکی زبان بند کردی ہے۔ پیالی ہاتھ سے رکھ کر اُٹھی اور جوش محبت کیساتھ شوہر کے صوفے کی طرف چلی۔

"شیلا دیوی"، یکایک فرخی مدیر روزنامہ شہیر نے درمیان میں روکا اور ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا "اقبال سنگھ جی آپ کے شوہر سے تعارف چاہتے ہیں"

موہن پاس ہی بیٹھا تھا۔ یہ سُنکر صوفے سے اُٹھ کر بڑھا۔ فرخی نے اُس کو دیکھ کر تعارف کرایا:

"مسٹر اقبال سنگھ صدر انڈین اکیڈیمی — شیلا دیوی کے شوہر۔ آپ کی صحیح تعریف یہی ہے، کیوں مسٹر موہن؟" خوش مذاق ایڈیٹر نے ہنس کر کہا۔ جب موہن نئے مہمان سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

موہن کے چہرے پر یکایک برہمی کی ایک شکن سی نمودار ہوئی۔ لیکن شیلا کی آنکھوں میں ایک دقیق التجا دیکھ کر فوراً غائب ہو گئی۔ فرخی کی بے خیالی اور محل ناشناسی نے نوک نشتر کا کام کیا۔ کوئی مرد پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس کو بیوی کا ضمیمہ سمجھیں، بیوی کتنی ہی ممتاز و مقبول سہی۔ شیلا نے ایک والہانہ انداز سے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"موہن، اقبال سنگھ جی عجیب صفات کے آدمی ہیں۔ ایک طرف فوجی لفٹنٹ اور دوسری طرف آرٹ کے دلدادہ، اور تیسری طرف، اگر یہ روزمرہ کے خلاف نہ ہو، موٹر سائکلنگ کے ماہر۔"

شیلا کے شوخ و لطیف تعارف پر سب ہنس پڑے۔ موہن اور مہمان ایک کوچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اقبال سنگھ واقعی بڑے دلچسپ آدمی نکلے۔ موہن ملٹری میں کمیشن حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ مہمان سے اس کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ملال کا اثر موہن کے دل سے جاتا رہا۔ لیکن جب سب مہمان رخصت ہو گئے اور موہن سگرٹ جلا کر نیچی کرسی پر لیٹا تو پھر وہ کیفیت طاری ہونی شروع ہوئی۔

شیلا نے ایک نگاہ میں موہن کے دل کو پڑھ لیا اور آہستہ سے آکر کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی اور اس کے شانہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ موہن نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ شیلا نے اپنا رخسار اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"شیلا" اس نے کہا۔ "یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم میں غرور نہیں ہے۔ ورنہ آج کی تعریف و تحسین سے تمہارا سر پھر جاتا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے مجھ جیسے آدمی کو کیوں انتخاب کیا تھا۔"

"اس لئے کہ مجھے تم سے محبت تھی۔" شیلا کی آواز اور آنکھوں میں عجیب شیفتگی تھی۔ "اگر تم نے تاج محل بنایا ہوتا تب بھی مجھے تم سے اس سے زیادہ محبت نہ ہو سکتی تھی۔"

"شیلا" موہن نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میں تم کو اپنی محبت دے سکتا ہوں۔ اور وہ سب کی سب تمہاری اور صرف تمہاری ہے۔ لیکن دوسری چیزیں، مرتبہ اور عزت، جواہرات، سامان راحت میں تڑپتا ہوں کہ تم کو دے سکوں۔ لیکن مجبور رہتا ہوں اور تم یہ چیزیں خود اپنے لئے مہیا کرتی ہو۔"

"لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔" شیلا کرسی کے ہتھے پر سے پھسل کر موہن کے برابر گھس کر بیٹھ گئی۔ "تم میرے ہو تو مجھے کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے ساتھ بغیر ان چیزوں کے خوش رہ سکتی ہوں۔ ایک طرح سے تم ہی یہ چیزیں مجھے دیتے ہو اس لئے کہ میری نظر میں تمہارے بغیر ان میں کوئی لطف و لذت نہیں۔"

"پھر بھی مجھے یہ خیال تکلیف دیتا ہے۔" موہن کا ہاتھ شیلا کی کمر میں حائل تھا۔ اور وہ اس پر جھکی ہوئی تھی

"صرف اس بات سے تسکین ہوتی ہے کہ میں تم کو چھوڑ کر باہر جا سکتا ہوں اور تمہاری تنگدستی کا خیال مجھے نہ ستائے گا۔ تمہاری رائیلٹیوں سے تمہاری ضرورت پوری ہو سکتی ہیں۔ مجھے ایک ہفتہ بعد کمیشن کے لئے حاضر ہونا ہے تم سپاہی شوہر کو کیا کہتی ہو، شیلا۔ تم مجھے یاد کرو گی؟"

"یاد کرو گی؟" شیلا پہلو سے اُٹھ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ "ہر لمحہ یاد کرونگی! لیکن میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔ اور موہن اب کبھی یہ ذکر نہ کرنا کہ تم مجھے چیزیں نہیں دے سکتے۔ تم میرے لئے لڑنے جا رہے ہو۔ کوئی عورت اپنے پتی، اپنے پیارے سے اس سے زیادہ توقع نہیں کر سکتی۔" یہ کہتے کہتے شیلا اسکی طرف جھکی۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا

"اُمید رکھنی چاہیئے کہ میں انجینیری سے زیادہ فوج میں کامیاب ہو سکوں گا۔"

اب اس کے دل میں کوئی ملال کوئی تلخی باقی نہ تھی۔

۲

کمیشن ملنے سے تین مہینے بعد موہن کو چند روز کی "رضا" مل گئی اور وہ گھر آیا۔ تین مہینے کچھ بڑی مدت نہیں ہے۔ لیکن اس تھوڑے ہی عرصے میں موہن کی شکل وصورت میں نمایاں ترقی ہو گئی تھی۔ ایسی کہ شیلا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بار بار دیکھتی تھی اور پھولی نہ سماتی تھی۔ آنکھیں جوشِ مسرت سے پُر نم اور دل جذبات فخر و ناز سے لبریز تھا۔ موہن کا یہ انقلاب صرف جسم میں نہ تھا۔ بلکہ جسمانیت سے لطیف تر اور زیادہ محبوب تغیر اس کی روح میں تھا۔ یعنی زندہ دلی اور شگفتگی، اور خود اعتمادی اور سکونِ قلب جس میں غرور خود بینی کا کوئی اثر نہ تھا۔

شیلا کو اس کایا پلٹ سے بڑا اطمینان ہوا۔ پچھلے دنوں موہن دل گرفتہ و افسردہ رہنے لگا تھا۔ اب اس کو اپنی قوت کا احساس تھا، اپنی برتری کا شعور تھا اور اس کا اظہار مردانہ فطرت کے تقاضے سے ہوتا تھا، بالکل غیر ارادی اور بلا قصد۔ شیلا کی نسوانی فطرت اس غلبہ و قوت سے نہایت محظوظ ہوتی تھی

موہن کی خاکی وردی شیلا کے مختصر دائرہ احباب کے لئے بڑی جاذبِ قلب و نظر ثابت ہوئی۔ شیلا کے فخر و مسرت میں اس سے بھی اضافہ ہوتا تھا۔

جو شاعر و ادیب، مصنف و مدیر تین مہینے پہلے شیلا کو ممتاز ناول نگار تسلیم کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے اب اُس کے شوہر کے خیر مقدم کے لئے "اپٹ ہوم" میں موجود تھے۔ اور فوجی کارناموں پر مبارکباد دے رہے تھے۔ اخبار "شہیر" کے ایڈیٹر فرخی نے کیمپ کی زندگی کا کچا چٹھا پوچھنا شروع کیا۔ اور جب تک اپنے "اداریہ" کو بھرنے کے قابل معلومات حاصل نہ کرلیں پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک صاحب کو فوجی زندگی کے لطائف و ظرائف سُننے کا اشتیاق تھا۔ وہ بھی موہن نے پورا کیا۔ بھولے اور بیوقوف سپاہیوں میں بھی ہوتے ہیں اور بھول چوک افسروں سے بھی ہو جاتی ہے۔

چائے پیتے میں شیلا کی سہیلی راج دلاری بولی "شیلا تمہارے پتی میں تو اب ایک خطرناک قسم کی کشش پیدا ہوگئی ہے۔" شیلا تو سن کر صرف مسکرا دی، لیکن دوسری فوراً بول اٹھی، "راجو تم اپنے منگیتر کو پہلے ہی سے فوجی سانچے میں ڈھلوا لو۔"

آخری مہمان کو رخصت کرکے شیلا اور موہن کمرے میں آئے تو شیلا نے ہنس کر کہا: "آج تو تم نے ہر شخص کو اپنی ہی طرف کھینچے رکھا۔"

موہن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس سوفے پر بٹھا لیا اور کہا "مجھے اس کا افسوس ہے، لیکن وہ خود ہی دلچسپی لے رہے تھے اور ——— "

"بڑے بھولے!" شیلا نے پیار سے موہن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "تمھیں خبر نہیں کہ میں اس بات سے کس قدر خوش ہوں؟"

موہن نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور چھیڑ کر پوچھا "کیا تم اس بے التفاتی سے آزردہ نہیں ہو کہ لوگ تمھیں تو آج گویا بھول گئے تھے؟"

"آزردہ! مجھے اس پر بڑا فخر و غرور ہے۔ ہر عورت اپنے شوہر کی تعریف سُن کر خوش ہوتی ہے۔ تمھیں احساس نہیں کہ خاکی وردی میں تم کس قدر حسین معلوم ہوتے ہو۔"
موہن یہ سُنکر بے اختیار ہنس پڑا اور دیر تک ہنستا رہا۔

۳

اِس سے چھٹے مہینے بعد لفٹننٹ موہن اپنی رجمنٹ کے ساتھ "فرنٹ" پر بھیجدیا گیا۔ شیلا کے پاس اس کے خط جلد جلد آتے رہتے تھے۔ انھیں کے انتظار میں اس کے دن گذرتے تھے۔ لیکن فطرۃً شگفتہ مزاج توی دل اور بلند ہمت عورت تھی۔ فراق کی گھڑیاں بیکاری میں کڑی معلوم ہوتی ہیں۔ مدت سے فلمی ڈراما لکھنے کو جی چاہتا تھا، موجودہ حالات اور دل کے تاثرات نے کچھ آپ بیتی اور کچھ جگ بیتی ملا کر ایک فسانہ کی شکل پیدا کرلی۔

فلمی ڈراما "پریم کی آہ" لکھا گیا اور ایک مشہور فلم کمپنی نے فوراً تیار کرنے کے لئے لے لیا۔ اس سے چند ہفتے بعد اطلاع ملی کہ موہن نے ایک نازک موقع پر تھوڑی سی جماعت کے ساتھ دشمن کی دس گنی تعداد کا مقابلہ کیا اور جان پر کھیل کر خندق کی حفاظت کی۔ کئی گھنٹے تراز دے جنگ کے پتے جھکتے اور اُٹھتے رہے آخر موہن نے آخری لمحے میں حیرت انگیز طریقے سے فتح پائی، اور ایک جان بھی ضائع نہ ہوئی۔ اس خدمت کے صلے میں موہن کپتان بنا دیا گیا اور "وکٹوریا کراس" کے لئے سفارش کی گئی۔

اِس خبر پر شیلا کی مسرت کا کیا پوچھنا۔ اپنے ڈرامے کی کامیابی کی خوشی اس کے سامنے ہیچ نظر آتی تھی۔ اس کے شوہر، اس کے محبوب، اُس کے اپنے سپاہی کو غیر فانی عزت و منزلت حاصل ہوئی۔ اس کا تصور، اُس کو مست و بیخود کئے دیتا تھا۔ اس مژدہ جانفزا کی گرم و نرم شعاعوں میں اس کی تمام ہستی لپٹی ہوئی تھی۔ شوہر کی جسمانی قوت و شجاعت کی فتح کے مقابلے میں اُسکو اپنی دماغی فتح بالکل بے حقیقت معلوم ہوتی تھی

موہن کے کئی خط آئے، لیکن اُس نے اپنے متعلق بہت کم لکھا۔ تمام خط شیلا کی محبت اور اُس کے ڈرامے کی کامیابی کے تذکرے سے بھرا ہوتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ جس طرح ممکن ہوگا نومبر میں جب ڈراما منظرِ عام پر لایا جائے گا ضرور آؤں گا۔

اتفاق سے ۱۱ر نومبر کو اِدھر فلم کی تکمیل ختم ہوئی، اُدھر کپتان موہن کو بکنگھم پیلیس میں شاہی ہاتھوں سے "وکٹوریا کراس" پہننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ شیلا ریڈیو میں یہ خبر سن رہی تھی کہ موہن کا تار ولایت سے اسی خوش خبری کا ملا۔ تار میں یہ مژدہ بھی تھا کہ رخصت منظور ہوگئی ۲۰ر نومبر کو ہفتہ کے روز ہوائی جہاز سے پونچوں گا۔

شیلا نے اِس حسنِ اتفاق کو خدا کا خاص فضل وکرم اور نہایت مبارک شگون سمجھا۔ تنہا ڈرامے کی کامیابی بے مزہ ہوتی۔ اب موہن کے اس اعزاز نے مسرت کی تکمیل کردی۔ شیلا نے فلم کمپنی کے ڈائرکٹر سے طے کرلیا کہ پہلی نمائش اس روز کی جائے جس روز موہن ولایت سے آئے۔ موہن اپنے وعدے پر خیریت کے ساتھ آگیا۔ شام کو دونوں بیٹھے اپنی اپنی داستانیں سنا رہے تھے کہ شیلا بولی:

"اگر ڈراما کامیاب بھی ثابت ہو، پھر بھی تمہاری کامیابی کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک وی سی کی بیوی کی جو شان ہونی چاہیے اس سے میں محروم ہوں۔"

"تم کو خبر نہیں شیلا کہ یہ تصور میرے لئے کیا معنی رکھتا ہے کہ میں آخرکار تمہارے لئے کچھ تحفہ لانے کے قابل ہوگیا۔"

شیلا نے اس جواب پر جس نظر سے شوہر کی طرف دیکھا اس میں مسرت، فخر، احسانمندی، سکون و طمانیت سبھی کچھ تھا۔ اس کے نزدیک پہلے بھی موہن کی کوئی ناکامی اور کوتاہی، کوتاہی نہ تھی۔ اب تو بلاشبہ اگر کوئی قرض تھا تو اُس نے مع سود کے ادا کردیا، وہ تلافی کی کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہ تھی۔ ایسا تحفہ دیا کہ اس سے بہتر کی آرزو بھی متصور نہ تھی۔ اب جوہرِ ذاتی اور وصفِ اضافی کے امتیاز کا کوئی

سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیپٹن موہن دی سی، ہمیشہ پبلک کی نظر میں "شیلا دیوی ناولسٹ" سے زیادہ ممتاز رہے گا۔ اس تصور سے جو راحت وسکون حاصل تھا اس کے بدلے میں وہ تمام دنیا کی دولت بھی لینے کو تیار نہ تھی۔

اسی شب میں شیلا کا ڈراما "پریم کی آہ" پردۂ سیمیں پر پیش کیا گیا۔ اور اُمید سے بڑھ کر کامیاب اور مقبول ہوا۔ تماشے کے بعد بڑی مشکل سے تحسین وتہنیت کی بوچھار اور بھرمار سے پیچھا چھوٹا اور وہ موہن کے ساتھ باہر نکلی۔ دونوں گاڑی کے پاس پہنچے تھے کہ یکایک شہر کے معزز بزرگ صوبیدار خداداد خاں نے دیکھ لیا۔ جلدی سے قریب آ کر موہن کو آواز دی:

"بیٹا۔ تم مجھے کیا جانتے ہو گے۔ تمہارے باپ دادا کا ملنے والا ہوں۔ تمہارا کارنامہ اخبار میں پڑھا تھا۔ دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ تم ہو بہو اپنے دادا پر گئے ہو۔ اسی سے میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ایک پچھتر برس کے بوڑھے سپاہی کی طرف سے اپنے عزم وہمت کی مُبارکباد قبول کرو ——— یہ تمہاری بیوی ہیں۔ کپتان موہن دی سی کی بیوی کو جس قدر ناز ہو کم ہے"۔

"بیشک مجھے بڑا فخر ہے"۔ شیلا نے ادب کے ساتھ سر جھکا کر کہا۔ خانصاحب رخصت ہوئے تو دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"اچھا تو شیلا دیوی"، موہن نے راستے میں پوچھا، "تم کپتان موہن کی بیوی بننے کو کیسا سمجھتی ہو؟"

"ایسا"! ——— شوفر نے ایک آواز سنی، لیکن وہ گاڑی کو ہجوم سے بچاتا رہا۔

(۱۱ر نومبر ۱۹۴۳ء)

تمام شد